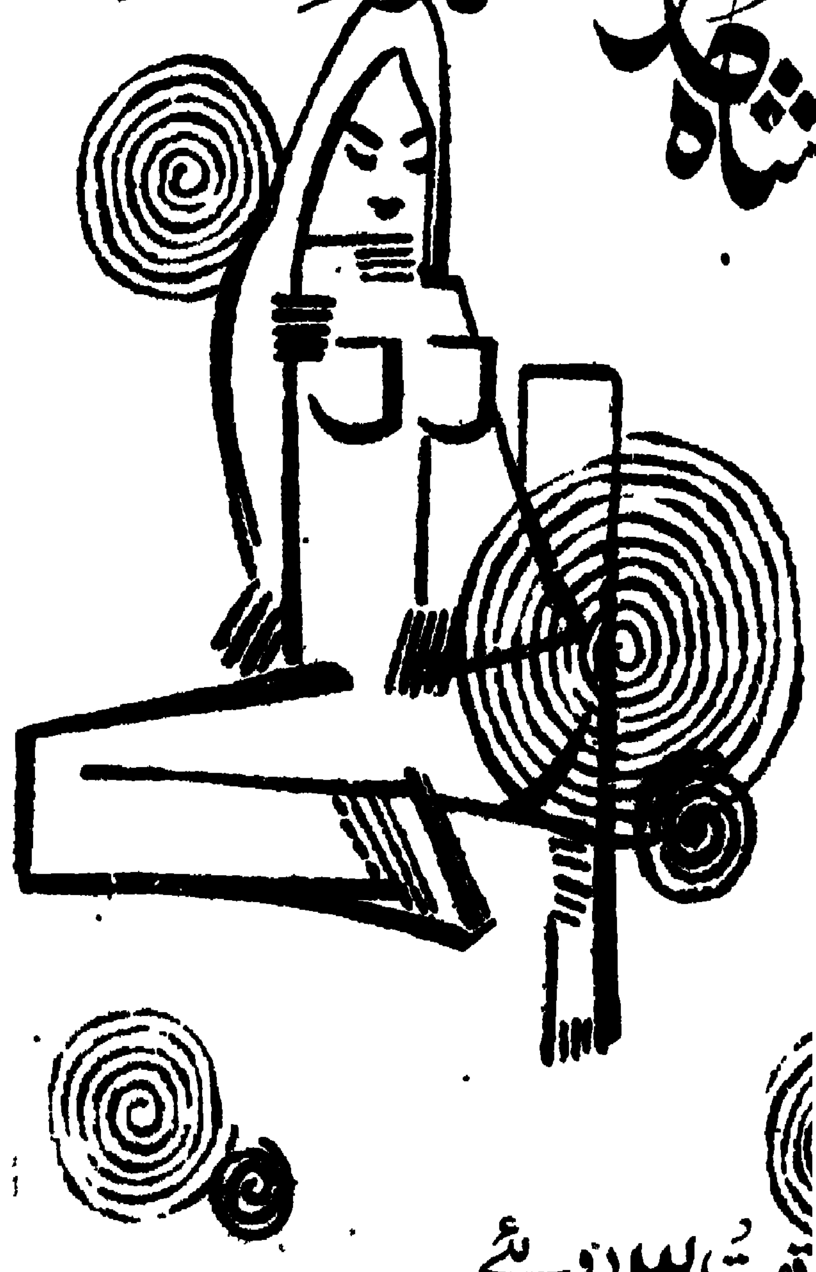
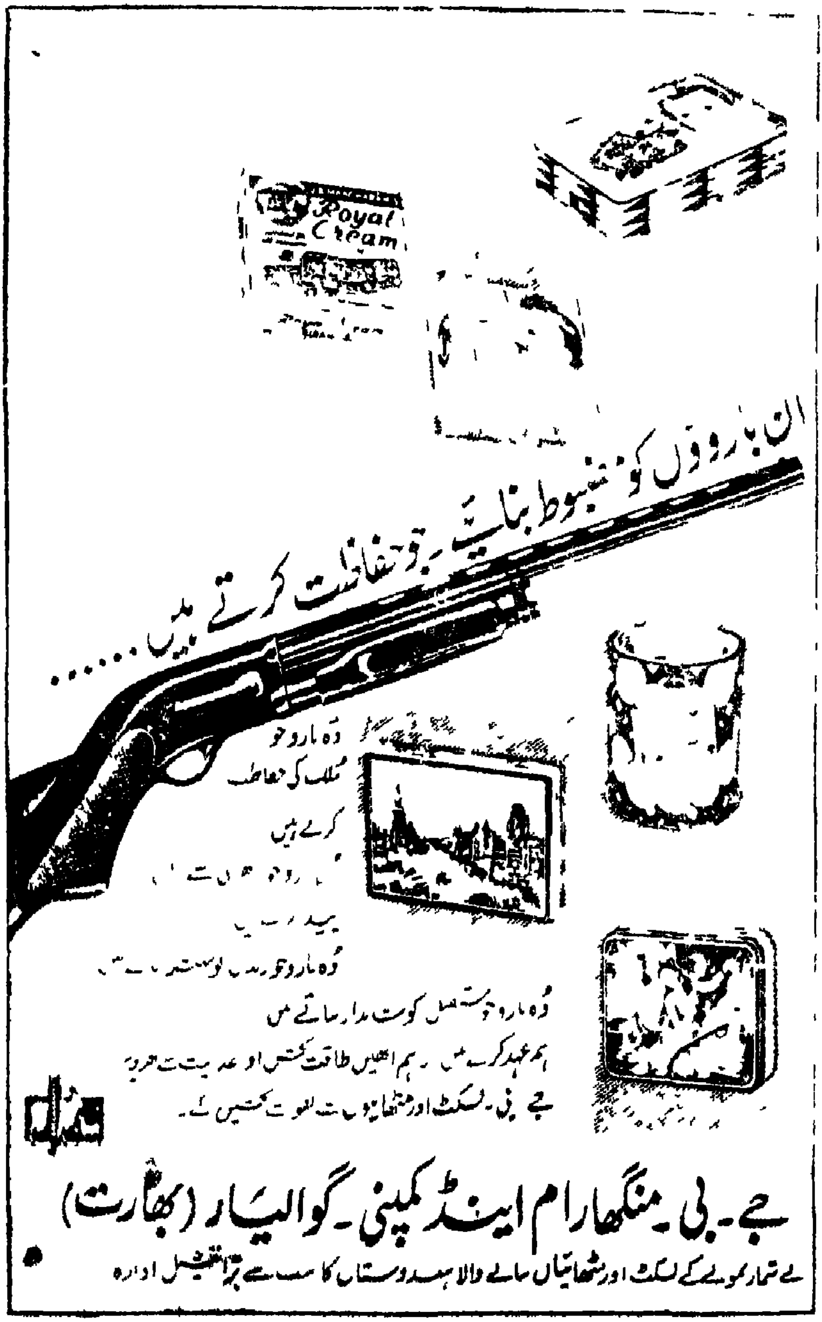
شاعر

ناولٹ نمبر



قیمت ۳ روپئے


Royal Cream
ان بازوؤں کو مضبوط بنائیے۔ جو حفاظت کرتے ہیں......
جے۔ بی۔ منگھارام اینڈ کمپنی۔ گوالیار (بھارت)



وسمول
سفید بالوں کو چمکیلا
سیاہ بنا تا ہے
وسمول
بالوں کو یقینی طور پر
سیاہ اور چمکیلا بناتا ہے

… زندگی کو … کرکے …

… پیپ ورم اور درد کو

… کے …

10, 50, 9

45,

…

ش

90,1 90 4 25

۲ ملنے کا پتہ:- قمرالدین بدرالدین …

اردو کے معیاری رسائل کا انتخاب پیش کرنے والا

شاہکار

نمبر ۵۵
ناولٹ نمبر

مدیر

محمود احمد ہنر

فی پرچہ	قیمت سالانہ
عام نمبر	معہ رجسٹری خرچ
ایک روپے ۲۵ پیسے	۱۳ روپے ۲۰ پیسے

قیمت ناولٹ نمبر ۳ روپے

دفتر شاہکار۔ ۱۳۴ بخشی بازار الہ آباد ۳
سروری منزل، کچا احاطہ، لکھنؤ

اعتذار

ناولٹ نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے قارئین کو انتظار کی جو زحمت ہوئی اس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

مستقل خریداروں سے

ناولٹ نمبر کی تاخیر اشاعت کے سلسلے میں بعض مستقل خریداروں نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ جنوری فروری کے نمبر نہ ملنے سے وہ ۲ نمبروں کے نقصان میں رہیں گے یعنی انھیں سال میں ۱۲ کے بجائے ۱۰ ہی پرچے ملیں گے، ایسا نہیں ہے۔ دفتر سے صاف الفاظ میں ہر خریدار کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں نمبر سے فلاں نمبر تک کے ممبر بنائے جا رہے ہیں یعنی ۵۵ سے خریدار بننے والوں کو ۶۶ تک پرچہ جاتا رہے گا۔

پھر نوٹ فرمالیجئے کہ شاہکار کی قیمت سال کے حساب سے نہیں بلکہ نمبروں کے حساب سے لی جاتی ہے۔ مستقل خریدار ہر حالت میں ۱۲ نمبر پائیں گے جن میں خاص نمبر بھی شامل ہوں گے۔

منیجر

ترتیب

مضمون

ناولٹ

اپنی بات

ماولٹ نمبر آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ہمیں جہاں خوشی ہے وہیں یہ افسوس بھی کہ اسے اپنے اعلان کے مطابق وقت پر شایع نہ کر سکے۔ ایسا کیوں ہوا اور تاخیر کی ذمہ داری کس پر ہے یہ بیان کرنا فضول ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس تاخیر کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے کر آپ سے معافی مانگ لی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس نمبر کا ہر ماولٹ آپ کو پسند آئے گا اور آپ ہمارے انتخاب کی داد دیں گے۔

ماولٹ نمبر کی اشاعت کا خیال ہمیں برسوں پہلے آیا تھا لیکن شاید یہ خیال اب بھی عملی شکل نہ اختیار کرتا اگر "شاہکار" کے انتظام میں تبدیلی نہ ہوئی ہوتی۔

شوکت صدیقی کا ماولٹ "کمین گاہ" کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوا تھا اسی وقت ہم نے اسے ماولٹ نمبر کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ معزز معاصر "سیپ" کے ماولٹ نمبر میں بھی یہ "اس کا سایہ" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ لیکن ہم نے فہرست میں کتاب ہی کا حوالہ دیا ہے۔ ہم معاصر "سیپ" سے اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس نمبر میں شوکت صدیقی کی تصویر شایع نہ کر سکے کیونکہ متعدد تقاضوں کے باوجود انھوں نے اپنی تصویر نہ بھیجی لیکن ہم جلد ہی ان کی تازہ تصویر شایع کر سکیں گے۔ کیونکہ اب شوکت صدیقی کو مدیر "شاہکار" کے ساتھ ساتھ "شاہکار" کے ہزاروں قارئین کی خواہشات کا بھی احترام کرنا ہوگا۔

محترمہ جمیلہ ہاشمی کی تصویر معاصر "ہم قلم" میں شایع ہوئی تھی اور "شاہکار" میں بھی شایع ہو چکی ہے۔ موصوفہ نے بھی اپنی تازہ تصویر بھیجنے کی زحمت نہیں فرمائی۔

اب آپ ماولٹ نمبر کا مطالعہ فرمائیے اور ہمیں اپنی رائے لکھئے۔

محمود احمد ہنر

ڈاکٹر وزیر آغا

ناولٹ کا مسئلہ

صنف ادب میں شاید ناولٹ وہ واحد صنف ادب ہے جس کے بارے میں آج کے علمی اور ادبی حلقے ایک گوکگو کے عالم میں مبتلا ہیں۔ بعض حلقے ناولٹ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ ناولٹ اور طویل مختصر افسانے میں ایک حد فاصل قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے حلقے ناولٹ کے اجزائے ترکیبی کے بیان میں ناول کی متعدد خصوصیات ہی پیش نظر رکھتے ہیں اور یوں ناول اور ناولٹ کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ ایک حلقہ ناولٹ کے وجود سے ہی منکر ہے اور اسے ایک علیحدہ صنفِ ادب تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر مضمون کا مقصد ناول اور افسانے میں ایک حدِ فاصل قائم کرنا ہے تاکہ اس پس منظر میں ناولٹ کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کچھ باتیں کہی جا سکیں۔

بادی النظر میں ناول اور افسانے کا فرق ضخامت یا حجم سے واضح ہوتا ہے۔ یعنی جہاں ناول کی طوالت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے مطالعے کے لئے طویل فرصت کا اہتمام کیا جائے وہاں افسانہ اپنے اختصار کے باعث محض ایک ہی نشست کا طالب ہے۔ تاہم یہ فرق ناول اور افسانے میں ایک حدِ فاصل قائم کرنے کے سلسلے میں کچھ زیادہ ممد نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض اوقات افسانہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ اس کا پیکر ایک چھوٹے ناول سے مختلف نظر نہیں آتا۔ اسی طرح بعض اوقات ناول کا میدان محدود ہوتا ہے اور اس کی ضخامت پر طویل مختصر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ فی الواقعہ ناول اور افسانے کا فرق ان کی ہیئت کی بہ نسبت ان کے مزاج کے تجزیاتی مطالعے ہی سے واضح ہو سکتا ہے۔

ناول اور افسانے میں پہلا اہم فرق کینوس (CANVAS) کی حدود سے پیدا ہوتا ہے۔ ناول کا کینوس اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس میں کسی عہد کا تہذیبی ارتقا منعکس دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کسی عہد کی تاریخ' اس عہد کے تمام اہم واقعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ بعینہٖ کسی عہد کا ناول اپنے زمانے کی مجلسی' سماجی اور تہذیبی اقدار کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تاریخ محض حقائق کے بیان تک ہی خود کو محدود رکھتی ہے وہاں ناول ان حقائق کی بجائے تہذیبی رجحانات اور سماجی تحریکات کو شخصی سطح پر پڑھتا اور کردار' پلاٹ اور منظر کی مدد سے جیتی جاگتی' مچلتی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم مقصد کے لئے (جب کہ فنی حسن کے لئے فنی لوازم کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہو) ایک وسیع کینوس کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ ناول کے دامن میں درجنوں کردار مختلف واقعات اور تحریکات سے نبرد آزما ہوتے اور ایک دوسرے سے متصادم ہو کر اپنے نوکیلے کناروں کو واضح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول اس وسیع پس منظر کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔ جس کی روشنی ان کرداروں کی ہیئت کو نمایاں کرتی اور انھیں ایک خاص سوشل نظام میں مناسب واقعات پر مائل کرتی ہے۔ ناول کے مقابلے میں افسانے کا کینوس محدود ہے اور یہ زندگی کے صرف ایک رُخ اور واقعے یا کردار کے صرف ایک پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہی بات ایک مثال سے واضح کرنی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک کمرے کو زندگی کا بدل قرار دے لیا جائے تو ناول اسے اُجاگر کرنے کے لئے بجلی کے سوئچ کو دباتا ہے اور سارے کمرے میں روشنی پھیلا دیتا ہے ــــــ اس طور کہ کمرے کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس افسانہ ایک ٹارچ کی مدد سے کمرے کے صرف ایک گوشے کو منور کرتا ہے ــــ اس طرح کہ کمرے کے دوسرے گوشے تاریکی سے ہم کنار نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس مثال سے افسانے کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب افسانہ ایک نسبتاً مختصر سے میدان کے باوجود ایک شدید تاثر کو جنم دیتا ہے تو لامحالہ

ایک بہتر معنی نظم وضبط کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ناول ایک حد تک منتشر صنف ادب ہے وہاں افسانے کی تراش، ہیئت اور تار و پود میں کفایت اور انضباط کا احساس ہوتا ہے۔ مگر اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

افسانے اور ناول کا دوسرا اہم فرق کردار کی پیش کش سے پیدا ہوتا ہے۔ بالعموم افسانے میں کردار کے صرف ایک پہلو یا رجحان کو پیش کیا جاتا ہے اور مختلف واقعات کی مدد سے صرف اسی ایک پہلو یا رجحان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے چونکہ کردار کا یہ پہلو یا رجحان ایک محدود وقت میں توانا ہوتا ہے اس لئے بالعموم افسانہ وقت کے ایک خاص لمحے اور زندگی کے خاص دور ہی سے متعلق نظر آتا ہے۔ بے شک بعض افسانے کردار کی ساری زندگی پر محیط ہوتے ہیں تاہم اس زندگی کی پیش کش میں افسانہ نگار انہی واقعات اور تحریکات کا انتخاب کرتا ہے جو کردار کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کریں۔ کردار کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے اُجاگر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے خارجی زندگی کی وسعتوں میں ایک خاص مقام ودیعت کیا جائے اور اس مقام سے اُن روابط کو ملحوظ رکھا جائے جو اس کردار اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے دوسرے کرداروں کے مابین استوار ہوتے ہیں۔ یہ کام ناول کی نسبتاً کشادہ فضا میں ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں کردار کے ایک پہلو کو بیشتر اوقات بڑے فنی لوازم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن ایک مکمل کردار۔۔ اپنے تمام تر پہلوؤں اور روابط کے ساتھ ناول میں ہی اُبھرا ہے۔ اُردو ادب میں کرشن چندر کی مثال لیجئے۔ ان کے افسانوں میں سیکڑوں کردار بکھرے پڑے ہیں جو ایک لمحے کے لئے سامنے آتے ہیں اور اپنی ایک خاص ادا یا ایک خاص پہلو کو نمایاں کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بے شک ناظر اس پہلو سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور یہ تاثر ایک مدت مدید تک اُس کے دل کی گہرائیوں میں زندہ رہتا ہے۔ تاہم یہ کردار ایسے بھرپور انداز سے نہیں اُبھرتے کہ ناظر کے ذہن پر چھا جائیں اور ناقابلِ فراموش ثابت ہوں۔ چنانچہ کرشن چندر کے افسانوں کا شاید ایک کردار بھی اس مقام

کو سمجھیے جہاں اُس کے ناول "شکست" کا کردار شیام بیچارہ ہے۔ اسی طرح عصمت چغتائی کے افسانوں کے بے شمار کردار "ٹیڑھی لکیر" کے بھرپور کردار شمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی افسانہ کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ناول کا ایک اپنا مزاج ہے جو اس کے پس منظر کی کشادگی سے تشکیل پذیر ہوا ہے۔ دوسری طرف افسانے کو ایک محدود میدان میں اپنے جوہر دکھلانے پڑتے ہیں چنانچہ افسانہ نگار تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لئے کردار کے ایک خاص پہلو کے تجزیاتی مطالعے کو ہی پیشِ نظر رکھتا ہے اور نتیجۃً ایک مشکل فنی مرحلے سے گزر کر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

ناول اور افسانے کا آخری اہم فرق طریقِ کار اور تاثر کے ضمن میں اُبھرتا ہے۔ ناول میں مختلف واقعات، مختلف اور متنوع اثرات پیدا کرتے ہیں اور یہ اثرات کئی ایک شاخوں میں منقسم ہو کر آگے بڑھتے اور ناول کے بنیادی تاثر میں ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ناول کی مثال اس دیوپیکر درخت کی سی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی جڑیں مل کر ایک بڑی جڑ کی تشکیل کرتی ہیں اور پھر یہ بڑی جڑیں مل جُل کر ایک اور بڑی جڑ کو وجود میں لاتی ہیں۔ اور جب اس قسم کی چند بڑی جڑیں ایک مقام پر ملتی ہیں تو درخت کا تنا معرضِ وجود میں آتا ہے۔ ناول میں بھی چھوٹے چھوٹے واقعات مل جُل کر ایک خاص صورت حال یا تاثر کو جنم دیتے ہیں اور اس قسم کے کئی تاثرات مل جل کر اُس بنیادی تاثر کو کروٹ دیتے ہیں جو ناول کی جان ہوتا ہے۔ کردار کے ضمن میں بھی ناول کا طریقِ کار یہی ہے۔ ناول کا کردار باقاعدہ اُبھرتا اور تدریجی ارتقا یا تنزل کے مراحل سے گزر کر ایک خاص صورت میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور مختلف واقعات، حادثات اور خارجی زندگی سے اس کے مختلف روابط اُن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جن کا مجموعی نتیجہ اس کردار کی شخصیت ہے۔ ناول کے برعکس افسانہ ایک بالکل دوسری صورتِ حال کا مظہر ہے۔ ہر افسانے کا ایک بنیادی نقطہ ہوتا ہے اور افسانے کے تمام واقعات اسی ایک نقطے کو اُبھارنے کے لئے وقف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک اچھے افسانے کی سب سے بڑی خوبی عموماً یہ ہے کہ اس کا

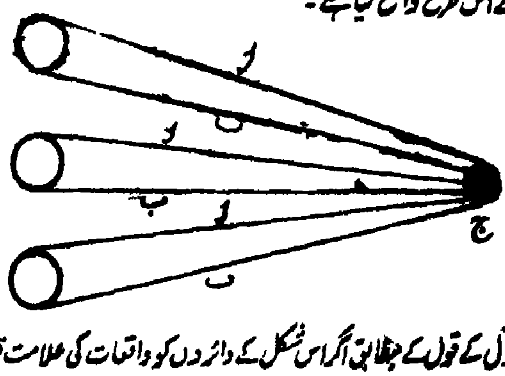
ہر واقعہ، تاثر بلکہ ہر فقرہ ایک ہی مرکزی نقطے کی تعمیر میں صرف ہو۔ اسی چیز کو بالعموم مقصد کی اکائی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب فقط یہ ہے کہ افسانے میں صرف ایک ہی منزل ہوتی ہے جہاں سارے واقعات اور تاثرات براہِ راست متعلق ہوں تو افسانے کا مزاج اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے افسانے سے خارج کر دیا جائے گویا ناول کی بہ نسبت کہیں زیادہ کفایت کا طالب ہے اور اس کا مجموعی تاثر بڑی حد تک اس کفایت ہی کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ مقصد کی اکائی کے ساتھ ساتھ تاثر کی اکائی بھی افسانے کا طرۂ امتیاز ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ناول کے اندر مختلف واقعات، مختلف تاثرات پیدا کرتے ہیں اور یہ تاثرات مل کر ایک مرکزی تاثر کو جنم دیتے ہیں لیکن افسانے میں تمام چھوٹے چھوٹے واقعات ایک ہی تاثر کو وجود میں لاتے ہیں اور یہی افسانے کا بنیادی تاثر ہوتا ہے۔ یہی حال کردار کا ہے کہ ناول میں مختلف واقعات کردار کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں اور پھر یہ تمام پہلو مِل جُل کر کردار کی بنیادی صورت کو وجود میں لاتے ہیں لیکن افسانے میں مختلف واقعات کا مقصد کردار کے صرف ایک ہی پہلو کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اور جب یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے تو افسانے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

سطورِ بالا میں ناول اور افسانے کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کی گئی ہے تاکہ اس پس منظر میں ناولٹ کی حدود کا تعین ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ناولٹ کو اپنا وجود تسلیم کرانے کے لئے کچھ ایسے امتیازی اوصاف پیش کرنے ہوں گے جو ناول یا افسانے کے مزاج سے اسے ایک جداگانہ حیثیت عطا کر سکیں۔ اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ افسانے کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے اور اس کے مختلف واقعات، زندگی یا کردار کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ دوسری طرف ناول زندگی یا کردار کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناولٹ کی حدود کیا ہیں؟ کیا ناولٹ زندگی یا کردار کے صرف ایک پہلو کو پیش کرتا ہے یا تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے یا پھر یہ ان دونوں صورتوں کے بین بین اپنی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ پہلی صورت میں ناولٹ اور افسانے میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ دوسری صورت میں ناولٹ اور ناول میں حدِ فاصل قائم نہیں ہو سکتی۔ رہی تیسری صورت تو اس کی حیثیت

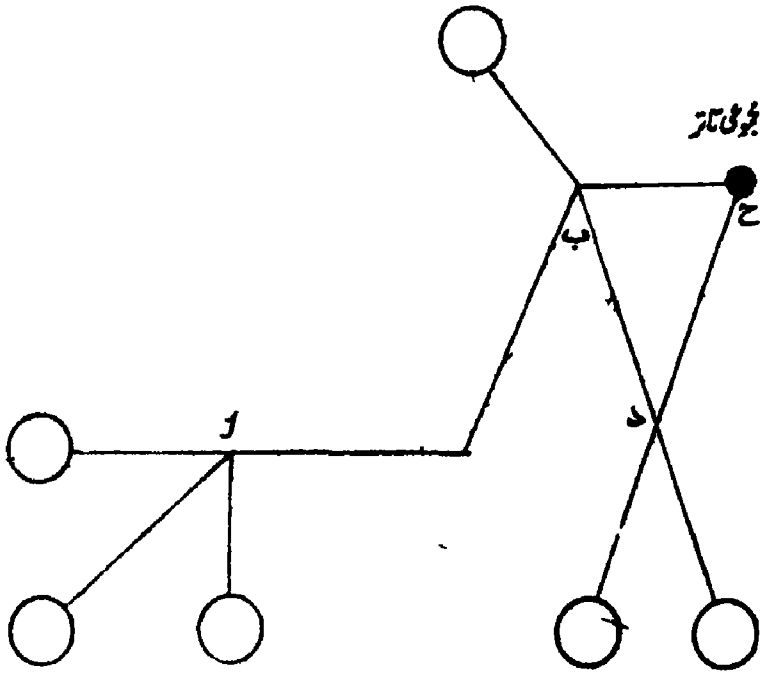
NO MANSLAND کی سی ہے اور اس میں ناول اور افسانہ — دونوں کے اثرات اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ایک تیسری مکمل صنف ادب کا وجود شک و شبہ کی نذر ہو جاتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ناولٹ پر بحث کی گئی ہے لیکن ناولٹ کا بطور ایک علیحدہ صنف ادب کے کوئی تذکرہ نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ناولٹ کو ایک علیحدہ صنف ادب قرار دینے کی بجائے محض ایک چھوٹا ناول کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے۔ البتہ تھامس ایچ اُذل (THOMAS H UZZEL) نے افسانہ، ناول اور ناولٹ کی حدود کا تعین کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناولٹ ایک بالکل علیحدہ صنفِ ادب کا درجہ رکھتا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ تھامس اُذل کے نظریے کا تجزیہ کیا جائے تاکہ ناولٹ کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

تھامس اُذل نے ناولٹ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں تو بحث نہیں کی البتہ ناول، افسانے اور ناولٹ کے فرق کو مختلف اشکال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً افسانے کے مزاج کو انہوں نے اس طرح واضح کیا ہے۔

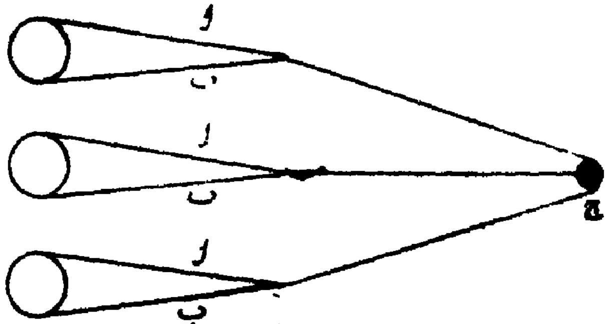


اُذل کے قول کے مطابق اگر اس شکل کے دائروں کو واقعات کی علامت قرار دے لیا جائے تو ان کے اثرات یا نتائج ل اور ب کی صورت میں براہ راست ح کے مقام تک پہنچیں گے اور یہی کہانی کا بنیادی اور مرکزی تاثر ہوگا۔ لیکن ناول میں صورت اس قدر سادہ اور اثرات کی ترسیل اس قدر بلاواسطہ نہیں ہوگی چنانچہ ناول کے مزاج کو اُذل نے اس شکل سے واضح کیا ہے۔



اس شکل میں دائرے واقعات یا کرداروں کی علامت ہیں لیکن ان کے نتائج براہ راست ج کے مقام تک پہنچنے کی بجائے مختلف منازل ا، ب، د پر ملنے کے بعد ج کی طرف پیش قدمی کرتے اور زندگی یا کردار کے ایک بھرپور تاثر کو جنم دیتے ہیں

یہاں تک تو بات بالکل صاف اور واضح ہے لیکن جب ہم اس اُدل ماولٹ کے مزاج کو بھی اسی انداز سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے مثلاً مادلٹ کے لئے انھوں نے یہ شکل پیش کی ہے۔



اس شکل کی مدد سے وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناول ، افسانے کی سی سادگی اور
بلاواسطہ طریقِ کار کا غماز ہے اور نہ اس میں ناول کی سی پیچیدگی اور پھیلاؤ ہی پیدا ہوتا ہے۔
لیکن اندازِ تشریح سے ایک نئی صنفِ ادب کا وجود تو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ناولٹ کے
بارے میں مسٹر اس اُڈل کی پیش کردہ شکل بھی زیادہ سے زیادہ اسے ناول کی ایک صورت
قرار دے سکتی ہے اور بس! وہ اس طرح کہ کہانی میں اگر اثرات مرکز پر بلاواسطہ طریق سے
پہنچیں تو یہ افسانے کا روپ ہوگا اور اگر بالواسطہ طریق سے پہنچیں تو ناول کا۔ چونکہ اُڈل
کے قول کے مطابق ناولٹ میں اثرات بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں لہٰذا ہم زیادہ سے
زیادہ اسے ایک مختصر ناول کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح بلاواسطہ طریق کی حامل کسی
ایک کہانی کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک طویل مختصر افسانے کا نام دے سکتے ہیں۔ پس
بطور ایک علیحدہ صنفِ ادب کے تا حال کٹھالی میں ہے اور اس کی حدود کا تعین کرنے
سے پہلے ایک لمحے کے لئے رُکنے اور سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔

کمیں گاہ

شوکت صدیقی

پھول والی گلی کی نکڑ پر پہنچ کر، راجو مہاراج نے معمول کے مطابق، پان کے دو بیڑے لیکر کلے میں دبائے، ہار والے سے چنبیلی کا گجرا لے کر گلے میں ڈالا اور تنبولی کی دوکان کے قدآدم آئینہ کے سامنے اپنی سج دھج دیکھنے لگا۔ چوڑا چکلا ہاڑ، مضبوط پٹھے، آنکھوں میں جوانی کا خمار، راجو مہاراج منجھلا قد آور اور رنگیلا جوان تھا۔

ذرا دیر وہ آئینہ کے روبرو کھڑا سر کے بالوں کو ہاتھوں سے جماتا رہا پھر سینہ چوڑا کر کے گردن اکڑا کر، گھومتا ہوا، دوکان کے بارہ میں پڑے ہوئے اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا اور بالاخانہ کی جانب تاک جھانک شروع کر دی۔ اللہ رکھی کے کوٹھے پر اس وقت خلاف توقع سناٹا تھا۔ نہ پائل کا چھناکا، نہ طبلہ کی تھاپ اور نہ تال سر کا اتار چڑھاؤ۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں تنبولی سے پوچھا۔ "ابے لوٹن، معلوم ہوتا ہے آج وہ کمبولی والا سیٹھ اللہ رکھی کے یہاں نہیں آیا۔"

لوٹن نے اس کی بات پر توجہ نہ دی، چپ چاپ بیٹھا پان کترتا رہا۔ راجو مہاراج کچھ زیادہ بےچین معلوم ہو رہا تھا۔ اصرار کر کے پوچھنے لگا۔ "یار منہ سے تو بول، یہ اللہ رکھی کے یہاں سناٹا کیوں پڑا ہے؟"

لوٹن نے اس کی جانب دیکھے بغیر بلی کی طرح غرا کر کہا۔ "مجھے کیا پتہ، میں یہاں بیٹھا کیا اس سالی کے دھگڑوں کی فہرست بنایا کرتا ہوں؟"

راہو مہاراج کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ "تو تو جان بوجھتا ہے کہ گھر والی سے جھگڑا کر آیا ہے۔ اچھا یہ تو بتا کہ اندر کمرے میں نے دو جو نگین سالو نڈا ملازم رکھا ہے، وہ یہاں پیسے تو نہیں آیا۔ کمبولی سے جب بھی، ترلوکی چند آتا ہے تیری تو چاندی ہو جاتی ہے۔" پھر ٹن نے یارانہ طور پر کہا۔ "سنا ہے وہ تو کوکین کے پان کھلاتا ہے۔"

لوٹن تیز لہجے میں بولا۔ "دیکھو جی مہاراج، تم یہاں دوکان پر بیٹھ کر ایسی باتیں مت کیا کرو۔ تمہارا کیا ہے، تم ٹھہرے پولیس کے مخبر، جھوٹ موٹ ہی مخبری کر دی تو میا تو میں پاش ہو جائے گا۔"

راہو کو اس بات پر واقعی تاؤ آ گیا۔ بگڑ کر بولا۔ "ابے ہوش میں ہے۔ ابھی ساری گرمی اُتار کر رکھ دوں گا۔ سالا سیدھی طرح بات ہی نہیں کرتا۔"

لوٹن راہو مہاراج کی آئے دن کی دھونس سے عاجز آ گیا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "یہ ہیکڑی کہیں اور جا کر دکھانا، کیا گرمی اُتار دو گے، تم ہو کیا؟"

راہو نے چھوٹتے ہی گالی دی اور لپک کر اس کے گریبان کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ لوٹن دوکان سے نیچے آ گرا۔ راہو نے اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور لگا لپا تپا مارنے۔ چوک میں اچانک سنسنی پھیل گئی۔ دوکاندار گردنیں اونچی کر کے اس طرف دیکھنے لگے، راہ گیر ٹھٹک کر ٹھہر گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھول والی گلی کے نکڑ پر خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

یہ گرمیوں کی شام تھی۔ چوک میں ٹریفک بند ہو چکا تھا۔ سڑک پر ابھی ابھی چھڑکاؤ ہوا تھا، تماش بینوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی، بازار کی چہل پہل بہار پر تھی، بالا خانوں سے طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنا جھن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رام جی بہرام گھاٹ سے ٹرک لے کر آ رہا تھا۔ راستے میں اُنھوں نے کچھ مسافر بٹھائے تھے۔ ڈرائیور نے اس میں سے کچھ روپے اس کو بھی دیے تھے۔ یوں تو وہ ٹرک پر کلینر کا کام کرتا تھا لیکن ڈرائیور پر اس نے ہمیشہ اپنا رعب رکھا۔ گول دروازے کے پاس پہنچ کر

اس نے ٹرک رکوایا، پھر نیچے اتر کر دونوں نے کالا کھنڈار سے بھنگ کا ایک ایک گلاس چڑھایا۔ ڈرائیور تو وکٹوریہ پارک میں ہوا خوری کے لئے چلا گیا لیکن رام بلی چوک کی سیر کرنے کی غرض سے بازار میں آگیا۔

پھول والی گلی کے نکڑ پر بھیڑ دیکھ کر وہ بھی ہجوم میں گھس گیا۔ اس وقت راہو مہاراج لوٹن کے ٹینٹوے پر گھٹنا رکھے بُری طرح اس کو پیٹ رہا تھا۔ سہمی بدن کا لوٹن، بلی کے پنجوں میں دبے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ ہجوم میں ہر شخص دم بخود کھڑا تھا۔ کس کی شامت آئی تھی جو راہو مہاراج کو ٹوکنے کی ہمت کرتا۔ چوک کے علاقہ میں راہو مہاراج کی دھاک بیٹھی تھی۔ دوکاندار ہاتھ جوڑ کر اس کی مزاج پرسی کرتے تھے۔ طوائفیں جھک کر تسلیم کرتیں۔ بقول شخصے چوک کے اندر تو اس کے پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔

رام بلی ذرا دیر تک تو حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹوک کر کہا "ہو گا جانے دو، آخر ہوا کیا ہے؟" اس کو لوٹن کی حالت پر ترس معلوم ہوا۔ راہو کے خلاف اس نے خود میں ایک نفرت کا جذبہ ابھرتا ہوا محسوس کیا۔

راہو مہاراج نے رام بلی کی بات کو نظر انداز کر کے لوٹن کے منہ پر اسی وقت ایک گھونسہ لگایا۔ اس دفعہ رام بلی چیخ کر بولا "چھوڑ دو جی، کیا مار ڈالو گے؟"

راہو نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور وہیں سے گرج کر کہا "کون ہے بے تو؟"

"بس بہت مار لیا۔" رام بلی نرم پڑ گیا۔

راہو مہاراج نے اس دفعہ پھر اس کو ڈانٹا۔ "چپکا کھڑا رہ، یا تو بھی کچھ لے گا۔"

رام بلی بے وجہ مسکرا دیا۔ "بڑا مان ہے تم کو اس بے چارہ کو کمزور سمجھ کر دبوچ لیا تو تم سمجھتے ہو سب ہی ایسے ہیں۔"

راہو مہاراج نے چھریرے جسم کے اس لمبے آدمی کو دیکھا جس کے جھلسے ہوئے سیاہ چہرے پر غضب کی کرختگی تھی۔ موبل آئل کے دھبوں سے داغ دار بے ڈھنگا لباس اور آواز میں جھنکار سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ لوٹن کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور اُس سے کہنے لگا۔

"جا جا اپنا راستہ لے، کیوں تیری شامت آئی ہے۔"

رام بلی کو اس کا اس طرح ڈر کر رکر دینے کا انداز بڑا ہی برا معلوم ہوا کہنے لگا "ایسے ویسوں پر ہاتھ اٹھا کر مت اکڑو گے جو کسی رام بلی سے سابقہ نہیں پڑا۔"

راجو مہاراج نے ایک گندی سی گالی دی اور جھپٹ کے رام بلی کے سر پر ایک ہاتھ رسید کیا تو وہ چکرا کر رہ گیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا ہاتھ پڑا اور وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔

مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ رام بلی نے زمین پر لیٹے لیٹے بھاگتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ راجو مہاراج کو دیکھا جو حقارت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رام بلی اٹھ کر چیتے کی طرح راجو مہاراج پر جھپٹا لیکن قریب پہنچتے ہی اس نے وہ دولتی ماری کہ رام بلی منہ کے بل دُور جا گرا۔ اس دفعہ اس نے رحم کھانے کے سے انداز میں کہا "اب جا اپنا راستہ لے، سالا خواہ مخواہ سر ہو گیا ہے۔"

مگر رام بلی باز نہ آیا۔ وہ کھڑا ہو کر راجو کو قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا اور پھر اس کی جانب لپکا۔ اب کی دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ راجو مہاراج رام بلی کو جس قدر کمزور سمجھ رہا تھا ایک ہی بار کی زور آزمائی میں اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے ہاتھ پیروں میں بڑا کس بل ہے۔ اسی عالم میں دونوں زمین پر آ گئے۔

راجو مہاراج پھر بھی بھاری پڑ رہا تھا لیکن ایک موقع پر رام بلی کے مضبوط ہاتھوں میں راجو کی گردن آ گئی۔ پھر جو اُس نے سڑک کے پختہ فرش پر راجو مہاراج کو رگڑنا شروع کیا تو دو ہی گھسوں کے بعد راجو مہاراج کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔

پہلے تو وہ رام بلی کو دھمکیاں دیتا رہا "ابے گردن تو چھوڑ۔ سالے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں گا۔ ابے دیکھ اب بھی باز آجا۔ نہیں تو نہیں چھوڑوں گا" لیکن رام بلی ذرا مرعوب نہ ہوا۔ آخر راجو مہاراج نے اس کو ماں بہن کی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ مگر وہ جتنی موٹی گالی دیتا، رام بلی اتنی ہی زور سے اس کی گردن دبا کر رگڑ دیتا۔

لوگوں کا ہجوم پھر وہاں اکٹھا ہوگیا تھا کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کو چھڑا دے۔
راہو مہاراج کا تمام چہرہ لہولہان ہوگیا تھا ہر بار جب بھی اس نے رام جی کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اس کو یہی تجربہ ہوا کہ رام جی کے ہاتھ فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ تکلیف سے بدحواس ہوکر زور سے چیخا "ہائے مرا" رام جی نے اس کی گردن چھوڑ دی، مگر وہاں سے ہٹا نہیں، راہو مہاراج بے سدھ پڑا رہا۔
آخر ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے نکل کر اس کو اٹھایا۔ اس کی حالت بڑی غیر ہورہی تھی پھر دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لے کر وہاں سے کراہتا ہوا چلا گیا۔ رام جی نے اطمینان سے کھڑے ہوکر اپنے کپڑے جھاڑے اور تنبولی سے کہنے لگا "لا بھائی ایک پان تو کھلا، گلا خشک ہورہا ہے۔"
بھیڑ اب چھٹنے لگی تھی لوگوں کو اس کی بے نیازی پر بڑی حیرت ہوئی۔ دوکانداروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔
"آج سیر کا بھائی سوا سیر ملا۔"
"مہاراج کا سارا گھمنڈ تکلے کے بل کی طرح نکال کر رکھ دیا۔"
"بھئی دیکھنے میں تو ڈیڑھ پسلی کا آدمی لگتا ہے۔ مگر صاحب ہاتھوں میں معلوم ہوتا ہے کہ سیسہ پلا ہوا ہے۔"
"میاں یہ قوت بھی خداداد چیز ہوتی ہے۔"
آس پاس دوکانوں، راہگیروں میں اسی طرح چرچے ہوتے رہے۔ رام جی مزے سے کھڑا پان چباتا رہا۔ طوائفیں چھجوں پر کھڑی انگلیاں اٹھا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ چوک میں یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا حیرت انگیز تھا کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ راہو مہاراج ایسے چھٹے ہوئے بدمعاش کو کوئی اس طرح سربازار نیچا دکھا دے گا۔
لیکن پورے بازار میں جو شخص اب بھی متفکر نظر آرہا تھا، وہ لوٹن تھا۔ اس کو اس بات کی

تشویش تھی کہ کہیں راجو مہاراج اپنے گروہ کے بدمعاشوں کو لے کر نہ آجائے۔ آج اُس کی دوکان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور رام بلی کو کہیں جوش میں راجو مہاراج قتل ہی نہ کر دے۔ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس پر قتل کے کئی مقدمات چلے، جیل بھی کاٹی، پھانسی کے تختے تک پہنچنے کی نوبت آگئی، مگر اس کی حرکتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ کچھ یہی سوچ کر اُس نے رام بلی سے کہا۔ "اچھا اب تم جاؤ، کہیں وہ سالا اپنے آدمیوں کے ساتھ نہ آجائے۔"

رام بلی کڑک کر بولا "آنے دو جی، ان کو بھی دیکھ لیں گے۔"

لوٹن نے پھر کچھ نہ کہا اور سامان صندوقچی جلدی جلدی ہٹا کر دکان بند کرنے کا بندوبست کرنے لگا آخر رام بلی بھی وہاں سے چل دیا۔ سڑک کے پاس پہنچ کر اُس نے دیکھا ڈرائیور دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے آتے ہی اس نے انجن سٹارٹ کیا اور دونوں چل دیئے۔

راجو مہاراج کو اپنی چوٹ کا اتنا احساس نہ تھا۔ جتنی اس کو اس بات کی تکلیف تھی کہ بھرے بازار میں اس کی ہیٹی ہو گئی تھی۔ سارا بھرم جاتا رہا تھا۔ حقہ بند آدمی تھا۔ سیدھے اپنے گرگوں کے پاس پہنچا اور جب وہ ان کی جمعیت میں چوک کے اندر پہنچا تو لوٹن کی دوکان بند تھی اور رام بلی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ جھینپ مٹانے کے لئے وہ دیر تک بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر رام بلی کو گالیاں دیتا رہا۔

اب وہ اس تاک میں تھا کہ کسی طرح رام بلی ہاتھ آجائے تو چوک میں اس کی جو ہوا اکھڑ گئی تھی وہ دھاک پھر بٹھا دے۔ شامتِ اعمال تین ہی چار دن بعد رام بلی پھر ٹہلتا ہوا اس طرف آنکلا۔ راجو مہاراج نے اس کو دیکھتے ہی دور سے گالی دی اور مجھو رسیئے کو للکار کر بولا۔ "ابے دیکھ کیا رہا ہے مار سالے کو۔"

مجھو رسیا اس وقت تک رام بلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر رام بلی پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا۔ رام بلی نے بڑھ کر اس کو کلائی پر روکا دوسرا ہاتھ خالی دیا۔

مجھو رسیئے نے گو یہ حملہ بالکل اچانک کیا تھا مگر دوسرے وار تک رام بلی سنبھل چکا تھا۔ اس کے لئے یہ پہلا موقع نہ تھا۔ جن دنوں وہ پریس میں بکی پر کام کرتا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی بات پر لاٹھی چل جاتی۔

دو چار زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جاتے اور کچھ ایک آدھ روز کے لئے حوالات کی سیر کر آتے۔

رام بلی نہتا ہونے پر بھی بھورئیے کے چھکے چھڑا دیتا، مگر اب راہو مہاراج اپنے گرگوں کے ساتھ آگیا تھا وہ سب مل ملا کر سات آدمی تھے اور رام بلی اکیلا۔ چاروں طرف سے اس پر لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ ایک آدھ ہاتھ اس نے خالی دیا کچھ کلائی اور بازو پر روکے۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ سر پر ضرب نہ آئے۔ اگر سر پھٹ گیا تو خون بھی زیادہ نکل جائے گا اور لڑنے کی سکت بھی نہ رہے گی۔ ذرا دیر تک وہ کھڑا لاٹھیوں کے وار روکتا رہا پھر وہ سڑک پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور سر کو ٹانگوں کے اندر چھپا لیا۔

کئی منٹ تک رام بلی کے جسم پر لاٹھیاں پڑتی رہیں۔ مارنے والوں کے اب ہاتھ شل پڑنے لگے تھے۔ اتنے میں ہیرا باسی نے ہاتھ اونچا کر کے کہا "بس۔"

راہو مہاراج نے ڈانٹ کر کہا۔ "ابے کیا نامردوں کی سی بات کرتا ہے۔"

ہیرا باسی جہاں دیدہ آدمی تھا۔ ایسے سیکڑوں معرکے دیکھ چکا تھا راہو کو سمجھانے لگا۔ "بس مہاراج اب جانے دو۔ بچ گیا تو سالا سال بھر کھٹیا پر پڑ کر کھائے گا۔"

راہو اس دفعہ رضامند ہو گیا کہنے لگا۔ "جیسی تیری مرضی، میں نے تو سوچا تھا کہ یہاں سے اب ارتھی ہی اٹھ کر جائے۔" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ٹھہر جاؤ بے لونڈو۔"

سب نے ہاتھ روک لئے۔ پھر راہو مہاراج نے اپنی لاٹھی بلند کر کے اونچی آواز سے کہا۔ "کوئی اور اس کا حمائتی ہو تو آ جائے، اس کی تو ماں . . .۔"

اور اس نے چیخ چیخ کر گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ مگر وہاں رام بلی کا کون حمائتی بیٹھا تھا۔ راہگیروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دوکاندار جلدی جلدی دوکانوں میں تالے ڈال رہے تھے۔ رنڈیاں زینوں کے دروازے بند کر کے کنڈیاں لگا دیں اور سہمی ہوئی چھجوں پر کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں چوک بھر میں سنسنی پھیل گئی تھی۔

رام بلی ابھی تک سڑک پر بے سُدھ پڑا تھا۔ اس نے نہ تو حلق سے کوئی آواز نکالی اور نہ جسم کو حرکت دی۔ بھورئیے نے گھبرا کر کہا۔ "کہیں سالا مر تو نہیں گیا!"

اتنا کہہ کر اس نے رام بلی کی کمر پر لاٹھی کا ہاتھ مارا۔ اسی وقت رام بلی نے تیزی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اس کی لاٹھی تھام کر اسی پھرتی کے ساتھ جھٹکا دیا کہ لاٹھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ لاٹھی کا ہاتھ میں آنا تھا کہ وہ بندر کی طرح اچھل کر دور ہٹ گیا۔ راجو اور اس کے ساتھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ رام بلی نے پہلا ہی وار کھوپڑی پر کیا۔ ہاتھ کچھ ایسا جم کر بیٹھا کہ کھوپڑی سر کے بل زمین پر آ گیا۔ پھر تو اس نے پینترے بدل بدل کر ہاتھ دکھائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کوئی مداری ہے جس کے ہاتھ پڑا وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

راجو مہاراج کے آدمی ایک ایک کر کے تھک چکے تھے اور پھر رام بلی اس غضب کا پھرتیلا تھا کہ اس نے کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجو مہاراج کے ساتھیوں کے پیر اکھڑ گئے۔ البتہ ہیرا پاسی ابھی تک جما ہوا تھا اور اسی کی کمک پر راجو مہاراج بھی بڑھ بڑھ کر ہاتھ چلا رہا تھا۔ پھر ایک لاٹھی ہیرا کی کنپٹی پر کچھ اس طرح بیٹھی کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ راجو نے جو اس کو گرتے ہوئے دیکھا تو بھاگنے کے لئے گلی کی طرف لپکا، مگر پیر اس کا پھسلا کر وہ گھبرا کر ایک دوکان کے چبوترے کے نیچے گھس گیا۔ رام بلی نے گالی دے کر کہا "ابے اب ما کہاں رہا ہے!"

اس نے راجو مہاراج کی ٹانگ پکڑ کر اس کو کھینچ کر باہر نکالا۔ موری کی کیچڑ میں اس کے سارے کپڑے لت پت ہو گئے تھے۔ رام بلی ٹانگ پکڑے ہوئے بیچ سڑک پر اس کو دور تک مرے ہوئے کتے کی طرح کھینچتا ہوا لے گیا۔ لوگ انھیں کوٹھوں پر کھڑے سہمی ہوئی نظروں سے راجو مہاراج کی یہ درگت دیکھ رہے تھے۔ کچھ دور تک راجو مہاراج کھینچتا چلا گیا پھر اس نے چیخ کر کہا۔ "ابے ٹانگ تو چھوڑ!"

رام بلی نے اس کی کمر پر کس کر ایک لات ماری۔ "سالے ابھی تک تمھاری ہیکڑی نہیں گئی۔"

راجو مہاراج ذرا دیر تک چپ رہا، پھر اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "اچھا بابا تو میری ٹانگ تو چھوڑ دے، پھر جو چاہے کر لینا۔"

رام بلی کو ہنسی آگئی۔ اس نے دو لاتیں اور لگائیں اور حقارت سے بولا۔ "دھت

تیری کی، سالا۔ بڑا مہاراج سا گھومتا تھا،

راجو مہاراج ذرا دیر تک تو پڑا رہا۔ پھر گردن جھکا کر سڑک پر بیٹھ گیا اور اچانک اُٹھ کر دھپ دھپ کرتا ہوا اس طرح بھاگا کہ رنڈی کے کھڑوؤں تک کو ہنسی آگئی۔

رام لی لاٹھی کو مضبوطی سے انگلیوں میں دبائے سینہ تانے کھڑا تھا اسی وقت کسی نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا۔ "پولیس آگئی۔" راہگیر، جو دور کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے سراسیمہ ہو کر اس طرح بھاگے کہ بعض تو گھبراہٹ میں زخمی بھی ہو گئے رام لی کی نظر اتفاق سے اُوپر اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا اللہ رکھی چھجے پر کھڑی ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے رستے کی طرف آنے کے لئے کہہ رہی تھی وہ احمقوں کی طرح اس کا مُنہ تکنے لگا

وہ جل کر بولی " ارے کمبخت اندر آجا۔ پولیس آگئی ہے۔"

اتنا سنتے ہی وہ لپک کر اللہ رکھی کے زینے پر چڑھ گیا۔

گھاؤ ابھی تازہ تھے، اس لئے اللہ رکھی کے کمرے میں جا کر بھی رام لی اسی طرح سینہ تانے بیٹھا رہا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد جب چوٹ سرد پڑنے لگی تو زخموں کی ٹیس نے اسے بے چین کر دیا۔ اس کے جسم سے خون کم نکلا تھا لیکن اندرونی چوٹ زیادہ آئی تھی۔ بعض جگہ خون کھال کے اندر ہی گوشت میں جم کر رہ گیا تھا۔

اللہ رکھی نے دودھ گرم کر کے اس میں پھٹکری ملا کر اس کو پلایا۔ اور چوٹ پر لگانے کیلئے جلدی جلدی لیپ تیار کرانا شروع کر دیا۔ رام لی سے اس کو یہ ہمدردی اس لئے تھی کہ اول تو وہ اس کے جیالے پن سے مرعوب ہو گئی تھی اس کے علاوہ صرف اللہ رکھی ہی پر موقوف نہیں، راجو نے اپنی غنڈہ گردی سے بوک کی تمام طوائفوں کا ناک میں دم کر دیا تھا پھر اللہ رکھی کے ساتھ تو یہ مصیبت تھی کہ راجو اس کی محبت کا بھی دم بھرتا تھا اور خواہ مخواہ وقت بے وقت پریشان کیا کرتا۔

چوٹ خاصی آئی تھی، اس لئے رام لی کئی روز تک اللہ رکھی کے گھر میں اپاہجوں کی طرح پڑا رہا۔ اللہ رکھی نے اس کی تیمارداری میں خاصی تندہی دکھائی۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے

اُس کے زخموں پر پٹیاں باندھتی اُن پر دوا لگاتی رام بلی کو بڑا سکھ ملتا۔

اللہ رکھی ایسی زیادہ خوبصورت تو نہ تھی۔ کھلتا ہوا رنگ، چہرے کے سیدھے سادے خدوخال، مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک خاص ادا تھی۔ کلی کھلنے کی تشبیہ تو محض شاعری ہوئی بس یوں سمجھئے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن والی بات تھی۔ جب وہ مسکراتی تھی تو بے ساختہ اُس پہ پیار آجاتا تھا۔ رام بلی کو بھی اس کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ اسی لئے جب وہ اس کے زخموں پر ہاتھ لگاتی تو وہ منہ بنا کر ہائے ہائے کرنے لگتا۔ اللہ رکھی مسکرا کر کہتی "واہ ٹھاکر، لاٹھیاں پڑتی رہیں تو اُف تک نہ کی اب ہائے ہائے کر رہے ہو۔"

رام بلی کو اس مسکراہٹ کے ایک خاص لہجے سے ٹھاکر کہنا بھی بڑا اچھا لگتا۔

کئی روز بعد جب وہ اللہ رکھی کے گھر سے نکل کر بازار میں ٹہلتا ہوا آگیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ دوکاندار خواہ مخواہ اس کو جھک کر سلام کر رہے تھے۔ بالاخانوں پر کھڑی طوائفیں اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارے کر رہی تھیں۔ غرور سے رام بلی نے سینہ تان دیا اور گردن اکڑا کر چلنے لگا۔

مگر وہ اس طرح کب تک اللہ رکھی کے یہاں پڑا رہتا لہٰذا ایک روز وہ بیرام گھاٹ اپنے کام پر چلا گیا البتہ جب بھی موقع ملتا تو چوک کی طرف چلا آتا۔ وہ اللہ رکھی کے یہاں ضرور جاتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتی۔

یہ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اللہ رکھی کے یہاں بیٹھا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا اتنے میں ایک بڑھی مائیکہ سیڑھیوں پر دھم دھم کرتی ہوئی تیزی سے کمرے کے اندر آکر چلانے لگی۔ "ہائے اللہ، میں لٹ گئی، ارے کوئی میری بچی کو بچاؤ۔"

رام بلی نے گھبرا کر کہا۔ "کیا ہوا؟"

وہ گھگھیا کر بولی۔ "اللہ ان کو غارت کرے، میری بچی کو زبردستی اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔"

رام بلی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو تو دیکھوں کون ہے۔" اس نے لاٹھی اٹھائی اور اس کے ساتھ ہولیا۔

دو ہی چار مکانوں کے بعد بڑھی نائیکہ کا کوٹھا تھا۔ رام بلی نے دور سے دیکھا کہ تین چار آدمی ایک لڑکی کو ہاتھوں پر اٹھائے دروازے میں سے نکل رہے تھے۔ وہ اُن کی گرفت میں بُری طرح مچل رہی تھی، بڑھی نائیکہ سر پیٹ کر بولی" ہائے اللہ! وہ اس کو لئے جا رہے ہیں۔ ارے جلدی کرو"

رام بلی تیز قدموں سے اس طرف چل دیا۔ مگر اس کے وہاں پہنچنے سے پیشتر ہی وہ اس کو سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے تانگہ میں ڈال کر خود بھی بیٹھ چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تانگہ چل دیا۔ رام بلی نے تانگے والے سے ڈانٹ کر کہا "روک تانگہ!" مگر کوچوان نے تانگہ روکنے کے بجائے گھوڑے کے ایک زوردار چابک لگائی اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔ رام بلی لاٹھی سنبھال کر اس کے پیچھے بھاگا۔

سڑک تنگ تھی اور راہگیروں کی آمدورفت بھی زیادہ تھی۔ اس لئے تانگہ ایک مقام پر ذرا سست ہو گیا اس عرصہ میں رام بلی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کو دیکھ کر تانگے والے نے گھوڑے پر سڑا سڑ چابکیں چلانا شروع کر دیں۔ تانگہ کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ رام بلی نے لاٹھی تانگہ کے پہیئے میں اڑا دی۔ گھوڑا مُنہ کے بل سڑک پر گر گیا، اور تمام سواریاں آندھی کے آموں کی طرح ادھر اُدھر سڑک پر گر پڑیں۔ اب رام بلی لاٹھی لے کر ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے للکار کر کہا۔

"خبردار جو کسی نے جنبش کی، ورنہ یہاں سے سب کی لاشیں جائیں گی"

کسی نے مزاحمت نہ کی۔ رام بلی نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھایا اور نائیکہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بولا۔ "سنبھالو اس کو" اور پھر ان لوگوں کو جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گالیاں دینے لگا۔ بہر حال بات آگے نہ بڑھ سکی۔

اس واقعہ سے چوک میں رام بلی کی اور دھاک بیٹھ گئی۔ طوائفیں اسکا اصرار کر کے بلاتیں اور ہر طرح سے اس کی خاطر کرتیں۔ کسی طوائف کے یہاں کوئی جشن ہوتا، شاہ مینا پر چادر چڑھائی جاتی یا کوئی اور تقریب ہوتی تو رام بلی کو خاص طور پر دعوت دی جاتی۔ راجہ مہاراج کے ساتھ

جھگڑے کے بعد چوک کے دوسرے بدمعاش بھی رام بلی سے بڑے مرعوب ہو گئے تھے اگر کبھی کسی کا رام بلی سے آمنا سامنا ہو جاتا تو دور ہی سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "ٹھاکر مزاج تو اچھا ہے" اور راجو مہاراج تو اس روز کے بعد سے کچھ ایسے غائب ہوئے کہ پھر چوک کا کبھی رخ نہیں کیا۔ سننے میں آیا کہ اس نے لکھنؤ چھوڑ دیا اور اب کملاپور کے تاڑی خانہ میں پڑا رہتا ہے۔

رام بلی ابھی تک ٹرک پر کام کر رہا تھا۔ البتہ ہفتہ میں وہ چوک کا ایک آدھ چکر ضرور لگاتا۔ ایک دفعہ اس کی غیر حاضری میں کسی بدمعاش نے ایک رنڈی کی ناک کاٹ لی۔ شراب کے نشے میں چوک کے اندر دیر تک ہنگامہ برپا کرتا رہا اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ اور اب کی جب وہ چوک آیا تو اندر کلی کے توسط سے تمام رنڈیوں نے یہ پیش کش کی کہ رام بلی چوک ہی میں رہائش اختیار کر لے، ہر کوٹھے سے اس کے اخراجات کے لئے کچھ نہ کچھ ماہانہ رقم مقرر کر دی جائے گی۔ رام بلی کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ ایک دم بگڑ گیا۔ کہنے لگا۔ "میں دیکھ رکھ کر اب ان سالی رنڈیوں کی کمائی کھاؤں گا۔ اندر کلی تم نے مجھ کو کوئی بھڑوا سمجھا ہے" وہ اس کو سمجھانے لگی تو وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ اندر کلی نے جیسے تیسے کسی طرح اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ مگر یہ بات رام بلی کو ۔ معلوم کیوں اتنی بری لگی کہ وہ عرصہ تک وہاں نہ گیا۔

کئی ہفتہ بعد کا ذکر ہے۔

بڑا سہانا موسم تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ رام بلی اس روز ٹرک کے ساتھ لکھنؤ آیا۔ شراب کا ایک ادھا چڑھا کر وہ موٹروں کے اڈے پر ڈرائیوروں اور کلینروں کے ساتھ ٹین بجا بجا کر دھوبیا راگ گا رہا تھا سب ہی نشہ میں دھت تھے۔ کچھ گا رہے تھے، کچھ بے ڈھنگے پن سے ناچ رہے تھے کچھ صرف شور مچا رہے تھے۔ بڑے ٹھاٹھ سے جشن ہو رہا تھا۔

یکایک رام بلی کو اندر کلی کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس وقت چل کر اس سے

کوئی ٹھمری سُنی جائے۔ اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ بھیگتا بھاگتا اسی کی دھن میں اللہ رکھی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ اس کے یہاں حسب توقع محفل جمی ہوئی تھی۔ اللہ رکھی پیروں میں گھونگھرو باندھے ہوئے تھی اور کوئی چلتا ہوا سا گیت لہک لہک کر گا رہی تھی۔ ایک ایک بول پر اس طرح بھاؤ بتاتی کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی۔

رام بلی کمرے کے فرش پر ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کمرے میں تماش بینوں کا جمگھٹا بھی نہ تھا۔ صرف ترلوکی چند گاؤ تکیہ کا سہارا لئے بیٹھا تھا۔ وہ آج ہی شام کمبولی سے آیا تھا۔ اس لئے پرائیویٹ سی محفل تھی۔

اللہ رکھی نے رام بلی کو دیکھا تو مسکرا دی، وہی بانکی ادا، وہی شگفتگی، رام بلی اپنے غلیظ دانت نکال کر بھوہڑ پن سے ہنسنے لگا۔ ترلوکی چند کو رام بلی کی یہ حرکت بہت شاق گزری۔ دونوں کا یہ پہلا سابقہ نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی رام بلی کو وہاں دیکھ چکا تھا اور ہمیشہ اس نے رام بلی کو حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کو رام بلی کی موجودگی کچھ زیادہ بُری معلوم ہوئی۔ نشہ ہونے کے باعث رام بلی اس روز کچھ ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور بے تکے پن سے داد دے رہا تھا۔ آخر جل کر ترلوکی چند نے اللہ رکھی سے کہا۔ "اچھا بھئی میں تو اب ذرا آرام کروں گا۔"

اللہ رکھی نے رک کر پوچھا۔ "کیوں، خیریت تو ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "سر میں کچھ درد معلوم ہو رہا ہے۔"

اللہ رکھی نے سازندوں کو اٹھا دیا اور ترلوکی چند کے پہلو میں جھک کر بولی "لاؤ سر دبا دوں" اور پھر وہ مسکرا مسکرا کر اس کا سر دبانے لگی۔ رام بلی خاموش بیٹھا رہا۔ اسی اثنا میں تین آدمی زینے پر چڑھتے ہوئے کمرے کے اندر آ گئے۔ شاید باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان میں سے ایک نے کوٹ کی جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور اطمینان سے غالیچہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کچھ تلاش کرنے کے سے انداز میں کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر اللہ رکھی کو مخاطب کرکے ان میں سے ایک نے کہا۔ "بائی جی!

کسی لڑکے کو بلا کر تین گلاس اور آدھی ۔ رحمن سوڈے کی بوتلیں تو منگواؤ۔"

اللہ رکھی کو ان کی یہ بے تکلفی ناگوار تو گزری۔ مگر رنڈی پیشہ جو ٹھہرا وہ آنے والوں کو خلاص کیسے کر سکتی تھی۔ ذرا نرم لہجہ میں بولی " جی۔ لڑکا تو اب سو گیا ہے۔"

انھوں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔

" کوئی بات نہیں۔"

اور ان میں سے ایک نے بوتل سے منہ لگا کر غٹا غٹ پینا شروع کر دی۔

پھر بوتل دوسرے کی طرف بڑھا کر اللہ رکھی سے بولا " اچھا تو پھر کوئی پھڑکتی سی چیز ہو جائے۔"

اللہ رکھی نے اس دفعہ بھی ٹالنے کی کوشش کی۔ " دیکھئے آج تو میں بہت تھک گئی ہوں، پھر ہمارے سیٹھ صاحب کے سر میں اس وقت درد ہو رہا ہے۔"

وہی آدمی ہنس کر بولا " تم بھی کمال کرتی ہو بائی جی ذرا تان تو چھیڑو، بس یوں چٹکیوں میں سر کا درد کافور ہو جائے گا۔ ہم تو تمہارے گلے کی تعریف سن کر بڑی دور سے آئے ہیں۔"

وہ زچ ہو کر بولی " اب تو سازندے بھی سو گئے ہیں۔"

ان میں سے ایک آدمی جو ذرا پستہ قد کا تھا تیزی سے بولا " ابھی سے سو گئے۔ اب تو رات شباب پر آئی ہے۔" پھر اس نے ذرا اونچی آواز سے کہا۔ " اماں کہاں گئے، استاد جی خدارا سارنگی دھنگی تو لاؤ۔"

استاد جی جو ابھی ذرا دیر پہلے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گئے تھے، خاموش پڑے رہے، مگر وہ آدمی باز نہ آیا اس دفعہ تقریباً چیخ کر بولا۔ " اماں اب آ بھی جاؤ۔ ہمیں زیادہ تو ٹھہرنا نہیں۔ دو ایک چیزیں سن کر چلے جائیں گے۔"

استاد جی نے اب بھی جواب نہ دیا تو وہ آدمی اٹھ کر اس کمرے کی جانب جانے لگا۔ تو لکھی چند جو اب تک خاموش بیٹھا تھا بگڑ کر بولا۔ " صاحب کوئی زبردستی ہے اس وقت نہیں ہے گلے کا موڈ تو آپ زبردستی کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ آدمی ہنس کر کہنے لگا۔ "ابھی یہ موڈ کیا ہوتا ہے" پھر اپنے ساتھ والوں سے مخاطب ہو کر بولا "یہ بھی ایک ہی رہی، آج معلوم ہوا کہ رنڈیوں کا بھی موڈ ہوتا ہے۔"

اندر کھی نے سوچا کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ مصالحت کرانے کے سے انداز میں بولی "سچ کہہ رہی ہوں آج میں بہت تھک گئی ہوں"

وہ آدمی بڑی بے تکلفی سے بولا "زیادہ نخرے نہ کرو، بس اب شروع ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے لپک کر اندر کھی کی کلائی پکڑ لی اور اس کو کھڑا کر دیا۔

اندر کھی کے پیروں میں گھونگھرو ابھی تک بندھے تھے ایک بارگی چھم چھم کرکے بج اُٹھے۔ وہ آدمی قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "لو اب تو گھونگھرو خود ہی بج اٹھے! اب تم کوئی پھڑکتی سی چیز چھیڑ دو، میں ابھی سازندوں کو لایا" اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف لپکا۔

ترلوکی چند نے اس کو ٹوک کر کہا "آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں۔ ایک بار کہہ دیا کہ گانا نہیں ہوگا۔ پھر آپ اس طرح پریشان کیوں کر رہے ہیں" وہ آدمی تو چپ ہو گیا مگر اس کے ساتھیوں میں سے ایک بولا "کیسے نہیں ہوگا۔ گانا تو اس وقت ضرور ہوگا"

اُس نے کوٹ کی جیب کے اندر سے لمبا سا چاقو نکالا اور اس کو کھول کر سامنے کر دیا۔

"ٹکڑے کرکے پھینک دوں گا سالی کے، گائے گی کیسے نہیں؟"

اندر کھی بڑے ناز سے بولی "واہ کوئی زبردستی ہے"

ترلوکی چند جو محض سیٹھ نہیں تھا، ان سے مرعوب ہوئے بغیر بولا "چاقو دکھا کر عورت کو دھمکی دیتے شرم نہیں آتی، یہی تمھاری مردانگی ہے؟"

وہ کہنے لگا "ابے پھر تو ہی آجا، بڑا عاشق بن کر آیا ہے" اور وہ ترلوکی چند کی طرف لپکا۔

رام بلی خاموش بیٹھا سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ خود اس کی بھی خواہش تھی کہ ذرا دیر کے لئے کچھ ناچ گانا ہو جائے تو اچھا ہے۔ یہ سالا سیٹھ کا بچہ خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کر رہا ہے۔

اندر کھی اس کی طرف دیکھ کر بولی "تم کیا تم خاموش بیٹھے ہو اور یہ مشٹنڈے

ادھم مچا رہے ہیں!"

رام لی جیسے ایکبارگی چونک پڑا۔ تڑپ کر بجلی کی طرح اٹھا اور اس آدمی کو باپ کے ہاتھوں میں دبوچ کر چاقو چھین لیا۔ اس کے ساتھی یہ دیکھ کر رام لی پر ٹوٹ پڑے مگر وہ ان تینوں پر بھاری پڑا۔ ایک کے سینے پر اس نے اس زور سے لات ماری کہ وہ لڑھکتا ہوا زینے تک چلا گیا۔ اب طیلی اور استاد جی بھی وہاں آ گئے تھے۔ ترلوکی چند بھی دور ہی دور سے جھوگا رہا تھا۔ اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر دونوں یونہی گھبرا گئے تھے کہ اس اثنا میں طیلی کو کچھ اور نہیں ملا تو اس نے طبلہ اٹھا کر ایک کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر سیدھا زینے کی طرف بھاگا۔

رام لی نے آخری آدمی کی گردن دبوچی اور اس کو زور سے زینے کی طرف دھکیل دیا۔ تینوں دھم دھم کرتے لڑھکتے لڑھکاتے گالیاں بکتے باہر چلے گئے۔

دیر تک کمرے کے اندر سراسیمگی کا عالم رہا۔ بعد میں اس واقعہ پر باتیں ہونے لگیں۔ سب کو طیلی کی حرکت پر ہنسی آرہی تھی لیکن اس حادثہ سے اتنا ضرور ہوا کہ ترلوکی چند بھی رام لی کا لوہا مان گیا۔ وہ اس سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ باتوں باتوں میں اس نے رام لی سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ٹرک کی ملازمت چھوڑ کر اس کے پاس آجائے۔ کچھ اندر کھی کی سفارش اور کچھ ترلوکی چند کا اصرار۔ ان سب باتوں سے رام لی بھی رضامند ہو گیا ——— اس نے ٹرک پر کام ختم کر دیا اور ترلوکی چند کے ہمراہ کھولی چلا گیا۔

کھولی کے چھوٹے سے قصبہ میں ترلوکی چند بڑی عالیشان کوٹھی میں رہتا ہے جہاں اس کا چینی کے برتنوں کا کارخانہ ہے۔ اس کارخانے میں کئی سو آدمی کام کرتے ہیں جو اس کو بڑے صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ترلوکی چند نے کوٹھی کے قریب ہی جہاں ساگرد پیشہ لوگ رہتے ہیں، رام لی کی رہائش کے لئے ایک کوارٹر میں بندوبست کر دیا۔

وہ دن بھر کمرے کے اندر پڑا اینڈا کرتا۔ سویرے اٹھ کر بھنگ کا ایک بڑا سا

گلاس چڑھاتا۔ دونوں وقت کا کھانا کوٹھی کا رسویا اس کو پہنچوا دیتا۔ کبھی کبھار ترلوکی چند اس کو بلوا لیتا۔ عام طور پر وہ پہلا سوال یہی کرتا "تم کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ٹھاکر۔" وہ بھی اس کو ٹھاکر کہہ کر مخاطب کرتا۔ پھر دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور اس کے بعد رام بلی واپس چلا آتا۔

کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ اس عرصہ میں وہ ترلوکی چند کے ہمراہ اللہ رکھی کے یہاں بھی گیا مگر اس دفعہ اس کی پہلی سی آؤ بھگت نہ ہوئی۔ وہ تمام وقت ترلوکی چند کے مسکہ لگاتی رہی۔ اسکی ناز برداری کرتی رہی۔ بڑے صاحب کے سامنے اس کی بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اللہ رکھی سے ذرا بے تکلفی سے بات کر لے پہلے وہ اس کو اللہ رکھی کہہ کر پکارتا تھا مگر اس روز وہ اس کو بائی جی کے علاوہ اور کسی لفظ سے مخاطب نہ کر سکا لیکن اس کے بعد وہ اللہ رکھی کے بالاخانہ پر پھر نہیں گیا۔ ایک آدھ بار ترلوکی چند نے کہا بھی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال گیا۔

رام بلی جفاکش آدمی تھا۔ محنت کرنا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس آرام طلبی سے وہ جلد ہی اکتا گیا۔ چربی بڑھ جانے سے اب اس کا چھریرا جسم بے ڈول ہو گیا تھا۔ اعضاء میں جو پھرتیلا پن تھا، وہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ ترلوکی چند کے پاس پہنچ گیا۔ خلاف معمول سویرے ہی سویرے اس کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "کہو ٹھاکر آج اس وقت کیسے آ گئے؟"

وہ کہنے لگا۔ "سرکار خالی پڑے پڑے جی اوب گیا۔ اب کچھ کام کاج ہونا چاہیئے۔"
ترلوکی چند ہنس کر بولا۔ "گھبراؤ نہیں، جلد ہی تمھارے لئے کوئی نہ کوئی کام نکالوں گا۔"
رام بلی کے چہرے پر شگفتگی آ گئی۔ خوشی خوشی واپس آ گیا۔

کئی ہفتے ہو گئے۔ لیکن ترلوکی چند نے نہ تو اس کو بلوایا، نہ کوئی کام بتایا۔ لہٰذا وہ پھر اس کے پاس گیا مگر کمرے کے اندر نہ جا سکا۔ ترلوکی چند کسی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ وہ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اندر سے برابر باتوں کی آواز آتی رہی۔ آخر وہ واپس چلا گیا۔

دوسرے روز بھیجا تو اس روز بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ مسلسل کئی دن وہاں جاتا رہا اور ہر بار چپراسی اس کو اندر جانے سے روک دیتا۔

لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ چپراسی کسی ضرورت سے اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ترلوکی چند باتوں میں محو ہے اس کے سامنے ایک گول مٹول سے چہرے کا پستہ قد آدمی بیٹھا تھا۔ یہ نربدارائے تھا، جو کسی زمانے میں فیکٹری کے اندر کیمسٹ کا کام کرتا تھا اور بیرونی ممالک کا دورہ کرکے اسی ہفتہ واپس آیا تھا۔ بڑی سی میز پر دونوں کے سامنے کچھ نقشے، کچھ فائلیں اور کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ نربدارائے نے ایک سکیم بنائی تھی جس کے مطابق دیسی مٹی سے ایسے برتن تیار کئے جا سکتے تھے جو کارخانہ میں تیار ہونے والے برتنوں سے زیادہ خوبصورت بھی بنتے، پائیدار بھی ہوتے اور نسبتاً کم لاگت سے۔ اس نے قصبہ کے قریب بہنے والی ندی کے کنارے ایک مقام پر ایسی مٹی دریافت کی تھی جس میں بعض کیمیائی اجزا ملا کر اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا تھا۔ فیکٹری میں اس کا تجربہ بھی کیا جا چکا تھا جو حسب توقع کامیاب ثابت ہوا۔ ترلوکی چند کو اسکیم پسند آگئی۔ مسئلہ اب یہ تھا کہ نربدارائے نئے کارخانے میں ۳۰ فی صد حصہ رکھنا چاہتا تھا۔ ترلوکی چند چاہتا تھا کہ وہ دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر کام کرے۔ کئی روز کی بحث کے بعد ۱۰ فی صد تک نربدارائے کو حصہ دار بنانے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی یہی بحث ہو رہی تھی۔ ترلوکی چند بار بار اس امر کی اہمیت جتا رہا تھا کہ اس منصوبہ پر تمام سرمایہ اس کا لگے گا۔ صرف اسکیم تیار کرنے کے لئے ۳۰ فی صد کا حصہ بہت زیادہ ہے۔

رام جی دروازے کے قریب چپ چاپ کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ باتیں چونکہ کسی قدر تلخ لہجہ میں ہو رہی تھیں۔ اس لئے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ایک بار گفتگو نے ایسا رُخ پلٹا کہ دونوں کے چہرے سرخ پڑ گئے۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔ ترلوکی چند نے میز پر زور سے گھونسا مار کر کہا: "کاغذ کے ان چند ٹکڑوں کی تم اتنی اہمیت سمجھتے ہو۔ دیکھ لینا الماری

کے اندر پڑے پڑے ان کو دیمک چاٹ جائے گی۔"
زبدا سائٹ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔" شاید آپ کو پتہ نہیں ابھی میں نے کسی کو اس اسکیم کے متعلق تفصیلی طور سے نہیں بتایا صرف سرسری تذکرہ کیا تو کئی پارٹیاں تیار ہو گئیں۔ میں تو آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ میں آپ کے کارخانے میں کام کر چکا ہوں، اس لئے میں اس کی تباہی نہیں چاہتا۔"
تراوکی چند چونک کر بولا۔" تباہی؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"
" یہی کہ جب یہاں دوسرا کارخانہ بن کر کھڑا ہو جائے گا اور جو سستے اور کم قیمت برتن تیار کریگا تو اس کا جو کچھ اثر آپ کے کارخانے پر پڑے گا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔"
تراوکی چند بگڑ کر بولا" تم مجھکو دھمکی دے رہے ہو، لے جاؤ اپنی یہ اسکیم اور یہ سارا کاٹ کباڑ۔" اس نے غصے سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اٹھا کر زبدا سائے کی طرف پھینک دیئے۔
رام بلی نے دیکھا کہ اس وقت بڑے صاحب کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ بے قدموں وہاں سے نکل کر باہر آگیا اور سیدھا اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔
اسی روز رات کو کوئی دو بجے کسی نے رام بلی کے کواڑ پر دستک دی۔ وہ گھبرایا ہوا دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے کوٹھی کا پہرہ دار کھڑا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑے صاحب نے اسی وقت بلایا ہے۔ رام بلی فوراً اس کے ہمراہ کوٹھی کی طرف چل دیا۔
کمرے کے اندر داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ تراوکی چند خاموش بیٹھا ہے رام بلی کو دیکھ کر بولا" تم آگئے ٹھاکر۔ تم روز کہا کرتے تھے کہ کوئی کام دو۔ آج میں نے تمہارے لئے ایک کام نکالا ہے۔" پھر اس نے چاروں طرف کمرے میں چوکنا نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولا" کمرے کا دروازہ بند کردو"
رام بلی نے جا کر دروازہ بند کر دیا۔
اس وقت کمرے کے اندر صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی میں

ترلوکی چند ڈرائیور سرار نظر آرہا تھا۔

اس نے کھڑے ہوکر رام بلی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"اندر آجاؤ" رام بلی نے غور کیا۔ اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی

وہ اندر چلا گیا۔ کمرے کے اندر تاریکی تھی۔ گہری خاموشی میں ترلوکی چند کی گہری گہری سانسوں کی اور صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ شاید وہ ہانپ رہا تھا۔ پھر اس نے بجلی کا سوئچ دبایا۔ کمرے کے اندر روشنی ہوگئی۔ رام بلی نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ سامنے دیوار کے قریب ایک آدمی فرش پر پڑا تھا۔ اس کا تمام جسم خون میں لت پت تھا۔ رام بلی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ نربدا مائے تھا۔

اس نے گھبرا کر ترلوکی چند کی طرف نظریں اٹھائیں۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں لمحہ بھر کو ملیں۔ رام بلی تھرا اٹھا۔ اسی وقت اس نے سنا، ترلوکی چند کہہ رہا تھا "تم کیا کر ڈر رہے ہو؟"

رام بلی نے سنبھل کر جھٹ سے کہا "نہیں سرکار، لیکن ـــــ"

"لیکن؟ لیکن یہ کہ یہ باتیں تمہارے جاننے کی نہیں" اس نے رام بلی کو ڈانٹ دیا۔

رام بلی کے منہ سے پھر ایک لفظ نہیں نکلا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر کمرے کی خاموشی میں آہستہ آہستہ ترلوکی چند کی آواز ابھری۔ یہ آواز بالکل نئی آواز تھی۔ ایسی آواز جو اس نے ترلوکی چند کی زبان سے اس سے قبل نہیں سنی تھی۔ وہ نربدا رائے کی لاش کے برابر ستون کی طرح تنا ہوا کھڑا تھا اور بہت سنبھل سنبھل کر کہہ رہا تھا۔ "دیکھو، رام بلی ابھی دو بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ ٹھیک دو بجے کوٹھی کے پھاٹک پر جیپ آجائے گی۔ سن رہے ہو تم؟"

رام بلی نے جھٹ سے کہا۔ "جی سرکار!"

وہ پوچھنے لگا "پھر تم کیا کروگے؟"

"جو آپ حکم دیں گے۔"

ترلوکی چند خوش ہو کر اس کو شاباشی دینے لگا۔ "بالکل ٹھیک۔ رام بلی تم بہت کام کے آدمی ہو۔ میں نے اس بات کو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔"

رام بلی خاموش کھڑا رہا۔

وہ کہتا رہا۔ "دو بجے جب جیپ آجائے تو تم فوراً وہاں پہنچ جانا۔ ڈرائیور تم کو چمڑے کا بڑا سا تھیلا دے گا۔ اس کو لے کر تم یہاں آجانا۔"

رام بلی بیچ میں بول اٹھا۔ "بہت اچھی بات ہے۔"

ترلوکی چند کہنے لگا۔ "اس کے بعد تم نرمدا رائے کی لاش کو چمڑے کے تھیلے کے اندر بند کر کے لے جانا اور ڈرائیور کے ساتھ جیپ میں بیٹھ جانا۔ تم کو ابھی ۱۱ میل سے زیادہ کا سفر طے کرنا ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ڈرائیور بہت ہوشیار ہے۔ اس کے بعد پرانے قصبہ کے کھنڈروں کے پاس زمین کھود کر لاش کو تھیلے کے ساتھ گاڑ دینا۔ گھبراؤ نہیں تمہارے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ ایک آدمی اور بھی ہوگا۔ —— لیکن یہ سارا کام پو پھٹنے سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہئے۔ ٹھیک ہے نا۔"

رام بلی تذبذب میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ "سرکار یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے پر ایک بات ہے ——" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

ترلوکی چند نے جلدی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ رک رک کر بولا۔ "صاحب میں سب کچھ کر لوں گا، مگر نرمدا رائے کی لاش کو میں کھود کر زمین میں نہیں گاڑ سکتا۔"

ترلوکی چند ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کیوں؟"

رام بلی اسی انداز سے کہنے لگا۔ "ارتھی کو سرکار میں تیل ڈال کر پھونک تو سکتا ہوں مگر مٹی میں نہیں گاڑ سکتا۔"

ترلوکی چند بگڑ کر بولا۔ "کیا واہیات بات کرتے ہو" مگر رام بلی اپنی بات پر اڑا رہا۔

"آپ چاہے جو کچھ کہیں مگر یہ دھرم کی بات ہے۔"

وہ اور ناراض ہو کر بولا۔ "دھرم، دھرم کا اس سے کیا تعلق۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم ڈر رہے ہو۔ جھوٹ موٹ کا بہانہ کیوں کرتے ہو؟"

رام بلی نے اصرار کیا۔ "نہیں سرکار، یہ بالکل دھرم کی بات ہے۔"

"تمھارے اس دھرم کی ایسی کی تیسی۔"

رام بلی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "سرکار ایسی بات مت کرو۔ ہم سے کہو تو ہم آدمی کا سر اُتار کر تمھارے سامنے ڈال دیں۔" رام بلی جوش میں آگیا۔ "آزمانا چاہتے ہو تو ابھی آ۔ مالو، ہے کوئی آدمی، ابھی حکم کر کے دیکھ لو۔"

ترلوکی چند کو رام بلی پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ کرتا بھی کیا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ اوندھی کھوپڑی کا آدمی ہے۔ سمجھانا بیکار ہے۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ رام بلی کو وہ ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ اب تو وہ اس کا رازدار بن چکا تھا اس کے علاوہ آدمی تھا حیالا۔ آیندہ بھی اس سے کام لینا تھا۔ لہٰذا وہ ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "اچھا ٹھاکر جیسی تمھاری مرضی۔"

رام بلی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سرکار میں بہت پاپی آدمی ہوں، اپنے کرموں سے ڈرتا ہوں۔"

ترلوکی چند کہنے لگا۔ "نہیں ٹھاکر، تم پروا نہ کرو۔ کام ہو جائے گا۔ میں کسی دوسرے آدمی کو لگا دوں گا۔ تم اب جا کر سو جاؤ۔"

رام بلی ذرا دیر تک سر جھکائے پشیمان کھڑا رہا، پھر خاموشی کے ساتھ کمرے کے باہر آگیا۔

ایک عرصہ تک وہ ترلوکی چند کے سامنے جانے سے کتراتا رہا مگر ترلوکی چند کے رویّے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اس بات کو بالکل بھول چکا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں رام بلی سے پھر کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ رام بلی حسبِ معمول بیکار پڑا اینڈتا رہا۔

یہ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ دسہرہ ہو چکا تھا۔ دیوالی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اچانک رات گئے دروازے پر دستک ہوئی۔ رام بلی نے باہر نکل کر چوکیدار کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ آج پھر اس کو کوئی خطرناک کام کرنا ہے۔ وہی ہوا چوکیدار سے معلوم ہوا کہ بڑے صاحب نے بلایا ہے۔ وہ اسی وقت وہاں پہنچا۔ ترلوکی چند اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس وقت وہ لمبا سا گاؤن پہنے موٹا سا سگار پی رہا تھا۔ چہرے پر بڑی سنجیدگی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی بولا "پہلے جا کر کمرے کا دروازہ بند کر دو۔"

رام بلی نے چپ چاپ جا کر دروازہ کا بولٹ چڑھا دیا۔ جب وہ اس کے سامنے دوبارہ پہنچا تو ترلوکی چند لمحہ بھر تک اس کو گھورتا رہا پھر اس نے میز کی دراز کھولی اور اس کے اندر سے بڑا سا چاقو نکال کر رام بلی کے سامنے ڈال دیا اور منہ سے سگار کا بہت سا دھواں نکال کر کہنے لگا۔ "اس دفعہ تم کو ارتھی کھود کر زمین میں دابنا نہیں پڑے گی، جلانا پڑے گی۔"

رام بلی آہستہ سے بولا۔ "ایسا ہی ہوگا سرکار۔ اُس دن تو بات یہ تھی کہ ——"

ترلوکی چند نے بات کاٹ کر کہا "میں اس وقت پچھلی باتوں کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ تم خواہ مخواہ اپنی صفائی مت پیش کرو۔"

وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

ترلوکی چند ذرا دیر رُک کر بولا "رانی بوا کا بنگلہ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ تم کو اس وقت وہیں جانا ہے جب تم پچھلی دیوار کے پاس پہنچو گے تو تم کو وہاں ایک آدمی ملے گا۔ وہ تم کو غسل خانے کی کھڑکی تک لے جائے گا۔ اس آدمی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھڑکی تم کو کھلی ملیگی، تم اس پر چڑھ کر اندر چلے جانا۔" رام بلی مبہوت بنا ہوا ترلوکی چند کی باتیں سنتا رہا۔ "رانی بوا اس وقت سو رہی ہوں گی، ان کا کمرہ تم نے دیکھا ہے۔ اس کمرے کی بھی کھڑکی کھلی ہوگی۔ ہوشیاری سے اندر چلے جانا۔ چاقو تمہارے پاس ہے۔ میں رانی بوا اور منوہر کے متعلق کل یہ سننا نہیں چاہتا کہ وہ زندہ ہیں یہ کام تم کو کرنا ہے۔ جب اس

کام سے فارغ ہو لو تو پھر سل جائے گی کہ لڑکی یہ بیچی ماما۔ وہیں تم کو پٹرول کا ٹین مل جائے گا، اس کو چھڑک کر کمرے میں آگ بھی تم ہی کو لگانا پڑے گی۔ سب کچھ سمجھ گئے نا؟"

رام لل نے سینہ تان کر کہا۔ "جی سرکار، ایسا ہی ہوگا۔"

پھر ترلوکی چند نے درشتی سے کہا۔ "اس دفعہ کام نہیں ہوا تو سمجھ لو کہ یہ بہت بُری بات ہوگی۔ واپسی تک میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر رام لل نے چاقو اٹھایا۔ اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ترلوکی چند نے اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رام لل کے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔

جب کوٹھی کا پھاٹک کھول کر رام لل دور چلا گیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پچھلے کئی ہفتے سے وہ بے حد پریشان تھا۔ پہلی مصیبت تو یہ تھی کہ شہر سے کچھ ٹریڈ یونین ورکر آ گئے تھے انھوں نے کارخانے کے مزدوروں سے میل جول کر کے ان کی ایک چھوٹی سی یونین بنا ڈالی تھی۔ قصبہ کے ایک مکان میں اس کا دفتر بھی قائم کر دیا جہاں روزانہ شام کو مزدوروں کے جلسے ہوتے تھے اس طرح کارخانے کے کاریگروں اور قلیوں کی زبان سے ایسی باتیں سننے میں آ رہی تھیں جن سے کارخانے میں گڑبڑ ہو جانے کا خطرہ تھا۔

دوسرا خطرہ رانی لُوا تھیں جو سورگ باشی سیٹھ مرلی چند یعنی اس کے پتا کی دوسری بیوی تھیں، جن کے اکلوتے لڑکے سوہن چند کا کارخانے میں ۵۰ فیصدی کا حصہ تھا۔ اور بقول ترلوکی چند جن کے عیاش بھائی رانی لُوا کو اس بات پر اکساتے رہتے تھے کہ ترلوکی چند سراسر بے ایمانی کر رہا ہے اس نے کارخانے کے اکاؤنٹنٹ اور دوسرے عملے کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور کارخانے کے منافع کو بہت کم کر کے بتاتا ہے۔ اس کام کے لئے اس نے جعلی رجسٹر تیار کئے ہیں لہٰذا کارخانے کے انتظام میں ان کو برابر سے شریک کیا جائے ورنہ کارخانہ فروخت کر کے رانی لوا کے حصہ کی رقم ان کو دے دی جائے۔ ترلوکی چند کے لئے یہ بڑا کٹھن

رجلہ تھا۔ وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی ملنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔

تراو کی جید دیر تک بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔

رام علی درختوں کے سایوں میں دبے دبے قدموں چلتا ہوا رانی بوا کے بنگلے کے پاس پہنچ گیا۔ اب چاند ڈوب چکا تھا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ صرف کارخانہ کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں سنائی پڑ رہی تھی۔ پچھلی دیوار کے پاس پہنچ کر وہ ٹھہر گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا اب کیا کیا جائے!

ذرا دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا۔ رام علی نے چاقو کو مضبوطی سے تھام لیا۔ آخر دیوار کے اس طرف کسی کی پرچھائیں سی معلوم ہوئی، اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "رام علی۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "چلے آؤ۔"

رام علی اس کے قریب پہنچ گیا۔ اندھیرے میں وہ اس کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ وہ پُراسرار آدمی لمبے قد کا تھا اور کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی چپ چاپ ساتھ چلتے رہے جب وہ ایسی جگہ پہنچ گئے، جہاں سے بنگلے کے پھاٹک پر جلنے والی بجلی کی روشنی ان پر پڑ سکتی تھی تو وہ آدمی ٹھہر گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "غسل خانے کی کھڑکی کھلی ہے۔ یہاں سے جو تیسری کھڑکی ملے گی، وہی کھڑکی ہوگی۔"

رام علی نے بھی رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "اچھی بات ہے۔"

چلتے چلتے اس آدمی نے کہا۔ "میں یہیں رہوں گا۔ تم دوبارہ آؤ گے تو مجھ سے پٹرول لے جانا۔"

رام علی اس کی ہدایت کے مطابق تیسری کھڑکی پر چڑھ کر بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا آہٹ سننے کا انتظار کرتا رہا مگر بالکل سناٹا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا راہداری میں آیا اور رانی بوا کے کمرے کی جانب چل دیا۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا اندر روشنی ہو رہی ہے مگر ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ اندر جانے کا منصوبہ بھی تیار نہ کر سکا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ ارے یہ تو رانی بُوا تھیں۔ وہ دیوار کے سائے میں چمٹ کر کھڑا ہو گیا وہ اس کے برابر سے گزر کر دوسرے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ وہ بالکل بے خبری کے عالم میں چل رہی تھیں۔

رام بلی نے چاقو پر ہاتھ رکھ کر سوچا کہ پیچھے سے حملہ کر دوں لیکن پھر اس نے ہاتھ روک لیا۔ ابھی موقع نہیں ہے۔ اگر وار اوچھا پڑا اور انھوں نے زخمی ہو کر ہائے کی تو غضب ہو جائے گا ابھی فیکٹری کے سارے چوکیدار یہاں اکٹھے ہو جائیں گے وہ وہاں سے ہٹ کر سامنے والے کمرے کے باہر لٹکتے ہوئے پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئیں اس دفعہ رام بلی دروازہ کے بجائے کھڑکی پر پہنچا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ اس سے اندر جھانک کر دیکھا رانی بُوا کے ہاتھ میں پیتل کی جھلکتی ہوئی گنگا جلی تھی اور وہ کمرے میں خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھیں۔ دوہرا بدن، درمیانہ قد، سر کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں پر جھلکتے ہوئے سفید بال، چہرہ پر سنجیدہ وقار، کمرے کی دھندلی روشنی میں وہ کسی قدر بے چین نظر آ رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد انھوں نے چوکنا نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر گنگا جلی میز پر رکھ دی۔ رام بلی ایک آنکھ دبائے، سانس روکے ان کو کھڑکی کی جھری سے دیکھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے رانی بُوا نے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر رام بلی کانپ اٹھا۔ پھر انھوں نے میز پر سے گنگا جلی اُتاری اور ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئیں۔ کچھ لمحے وہ اسی عالم میں پڑی رہیں۔ پھر انھوں نے گنگا جلی کا منہ کھول کر اس کا پانی اپنے برہنہ جسم پر چھڑکنا شروع کر دیا۔ ہر بار جب پانی کا چھینٹا ان کے بدن پر

پڑتا تو وہ سردی سے کپکپا کر ہلکی سی سسکی بھر لیں۔

رام بلی ان کو اس حالت میں نہ دیکھ سکا۔ ایکبارگی خوف زدہ سا ہو گیا۔ ڈر کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کھڑکی کے پاس سے فوراً ہٹ گیا۔ اس کا جسم خوف سے کانپ اٹھا۔ بوجھل سانسیں بھرتے ہوئے اس نے سوچا یہ تو بہت بُرا ہو گیا۔ جب کوئی عورت گنگا جی کا پوتر جل اپنے بدن پر چھڑک رہی ہو تو اس کو اس طرح چوری چوری دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے بھگوان!! یہ تو بہت بڑا پاپ ہو گیا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر غسل خانے کی جانب تیز تیز قدموں سے چل دیا۔

جب وہ کھڑکی پر پہنچا تو کسی نے دبی زبان سے کہا "بہت دیر لگا دی' لو یہ لو۔ سب کام ٹھیک ہے نا" رام بلی نے چپ چاپ اس کے ہاتھ سے پٹرول کا ٹین لے لیا اور کھڑکی سے لگا خاموش کھڑا رہا۔

آخر اس پراسرار آدمی کے قدموں کی آواز جب درختوں کے تاریک سایوں تلے ڈوب گئی تو وہ کھڑکی پھاند کر باہر آ گیا اور سیدھا کوٹھی کی طرف چل دیا۔

جس وقت وہ ترلوکی چند کے سامنے پہنچا تو اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا اور ہانپنے کے سے انداز میں لمبی لمبی سانسیں بھر رہا تھا۔ ترلوکی چند اس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ "بیٹھ جاؤ" لیکن رام بلی خاموش کھڑا رہا۔ ترلوکی چند پوچھنے لگا "سب ٹھیک ہے نا؟"

رام بلی کوئی جواب نہ دے سکا اس نے چپ چاپ سر جھکا دیا

ترلوکی چند نے اس کو شک کی سی تیز نظروں سے دیکھا اور آواز پر زور دے کر کہا،

"بولتے کیوں نہیں۔ بولو کیا کر آئے؟"

رام بلی کے ہاتھ میں پٹرول کا ٹین ابھی تک لٹک رہا تھا۔ اس نے ٹین کو ترلوکی چند کے سامنے کر دیا۔

"صاب، آپ پٹرول چھڑک کر میرے بدن کو آگ لگا دیجیے، مجھ سے عورت پر چاقو نہیں چلایا جا سکتا۔"

ترلوکی چند پھر بولا "تم اُلّو کے پٹھے ہو۔"

رام بلی سنتا کھڑا رہا

ترلوکی چند نے طعنہ دیا "تم تو صرف رنڈیوں کی چوکیداری کر سکتے ہو۔"

رام بلی نے ایک بارگی ترلوکی چند کی طرف گہری نظروں سے دیکھا

"سرکار ایسی بات مت کہئے، یہ جھوٹ ہے۔"

ترلوکی چند ہوشیار آدمی تھا۔ رام بلی کے بدلتے تیور دیکھ کر اس نے اپنا انداز بدل ... "ٹھیک ہے" "ہوں" کر کے خاموش بیٹھا سگار پیتا رہا

کمرے میں اب سگار کے دھوئیں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی کے پیچھے ... کالا کلوٹا رام بلی ستون کی طرح کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے ترلوکی چند کا موٹا جسم کرسی میں دھنسا ہوا بے حد حقیر نظر آ رہا تھا دونوں خاموش تھے۔ شاید ایک دوسرے کے متعلق سوچ رہے تھے ذرا دیر بعد ترلوکی چند نے نظر اٹھا کر رام بلی کی جانب دیکھا اور رک رک کر کہنے لگا۔ "رام بلی، ابھی رات باقی ہے، تم بہت اور کام کر سکتے ہو۔"

رام بلی نے جواب تو کوئی نہیں دیا۔ البتہ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"اچھا اب کرم پیٹرول کا ٹین یہاں سے اٹھاؤ اس کو لے جاؤ اور قصبہ میں مزدوروں میں کا جو گودام ہے اس کو پھونک دو۔" رام بلی کے لئے یہ دوسرا خطرناک کام تھا۔

رام بلی نے حسب معمول حامی بھر لی۔ "بہت اچھا سرکار!"

ترلوکی چند بولا "ایک بار پھر میں یہاں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

رام بلی نے پیٹرول کا ٹین سنبھالا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

ترلوکی چند اسی طرح کرسی میں دھنسا سگار کا دھواں کمرے میں بکھیرتا رہا۔ اس کے چہرے پر لیمپ کی روشنی کا ہلکا ہلکا عکس جھلک رہا تھا۔ اس وقت وہ صرف اس

بات پر غور کر رہا تھا کہ اس دفعہ بھی رام بلی نے دھوکا دیا تو کیا کیا جائے۔ رام بلی کو ایک اور موقع دیا جائے، نکال دیا جائے یا مروا دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ اُس کے کئی راز جان گیا تھا۔

گھنٹہ بھر تک رام بلی واپس نہ آیا تو ترلوکی چند کو تشویش ہوئی اور وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب چار بجنے والے تھے۔ ہوا خاصی سرد ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کارخانے کی رات والی شفٹ کی چھٹی کا سائرن بجنے لگا۔ قلی ایک دم سے کارخانے کے بڑے پھاٹک سے نکلنا شروع کر دیں گے۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا، رام بلی کو واپس آجانا چاہئے۔ پھر جھنجھلا کر وہ رام بلی کو گالیاں دینے لگا۔ اسی وقت باہر دروازے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ترلوکی چند نے تشویشناک نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رام بلی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ترلوکی چند نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا کر آئے؟"

رام بلی نے سینہ تان کر کہا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

ترلوکی چند جھٹ سے اس کھڑکی پر پہنچا جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ اس نے قصبہ کی جانب دیکھا، ایک مقام پر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور لوگوں کی ملی جلی آوازوں کا دبا دبا شور رات کے سناٹے میں صاف سنائی پڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے اور تیز ہو گئے۔ قصبہ پر گہری سرخ رنگت پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رام بلی کے پاس پہنچا۔ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "یہ کام ہوشیاری سے کیا ہے نا، کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

رام بلی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

ترلوکی چند نے بڑے پیار سے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔ "اچھا ٹھاکر اب تم جاکر سو جاؤ۔"

رام بلی دروازے کی طرف چل دیا۔ ابھی اس نے دروازہ کھولا بھی نہیں تھا کہ ترلوکی چند نے اس کو ٹھہرالیا اور میز کی دراز کھول کر رم کی ایک بوتل نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

"تھوڑی سی پی کر سو جانا، اچھی نیند آئے گی۔"

رام بلی اپنے غلیظ دانت نکال کر خوشی سے ہنسنے لگا۔

"سرکار اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو بہت بڑھیا شراب لگتی ہے۔"

اس نے بوتل لی اور جلدی سے باہر چلا گیا

یونین کا دفتر جل کر بالکل برباد ہوگیا۔ مزدوروں میں کھلبلی پڑگئی۔ تفتیش کے لیے پولیس بلائی گئی قصبے کے کئی آدمیوں کو پولیس نے حوالات میں بند کرکے اچھی طرح زدوکوب کیا مگر آگ لگانے والے کا کوئی سراغ نہ مل سکا

ترلوکی چند کا اندازہ غلط نکلا۔ کارخانے کے قلیوں میں گڑبڑ ہو جانے کا خطرہ اچانک بڑھ گیا۔ آگ لگنے کے واقعہ کو ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ یونین کی جانب سے ... کو ایک نوٹس ملا۔

جس وقت اس کو سکریٹری نے نوٹس دیا، وہ نربدا رائے کی اسکیم کے کاغذات میز پر پھیلائے اس پر کام شروع کرنے کے متعلق غور کر رہا تھا۔ اس نے نوٹس دیکھا یونین نے مطالبہ کیا تھا

"کارخانے کے مزدوروں کا مہنگائی الاؤنس بڑھایا جائے
کام کے اوقات پر سختی سے عمل کیا جائے۔ دیر تک کام کرنے کا پورا پورا اوور ٹائم دیا جائے۔
کسی کاریگر کو بلا وجہ ملازمت سے برطرف نہ کیا جائے۔
رہنے کیلئے کوارٹر، علاج کیلئے مفت طبی امداد اور بچوں کے لئے مفت تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔"

ترلوکی چند نے پورا نوٹس ٹھیک سے پڑھا بھی نہیں غصہ سے اٹھا کر سیکریٹری کے

سامنے۔ ڈال دیا۔ سالوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس سے کہنے لگا۔ "کہہ دینا، نوٹس کا جواب ان کو مل جائے گا۔"

سیکریٹری چلا گیا۔ ترلوکی چند اب اس نئے مسئلہ پر غور کرنے لگا۔

ہفتہ بھر کا وقت دیا گیا تھا۔ وہ ہفتہ بھر تک اس فتنہ کو دبانے کی سازش تیار کرتا رہا۔ لیکن ابھی سازش تیار بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے سنا مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ شام کی شفٹ میں کوئی مزدور کام پر نہ آیا۔ کارخانے کے باہر جو بڑا سا میدان تھا۔ اس میں یونین کے جلسہ کا انتظام کیا جا رہا تھا۔

ترلوکی چند نے رام بلی کو بلایا۔ جب وہ آگیا تو اس نے پہلا سوال یہ کیا۔ "تم نے شام کو ٹھنڈائی (بھنگ) کے کتنے گلاس پیئے ہیں؟"

رام بلی مسکرا کر بولا۔ "سرکار، صرف دو چھوٹے گلاس۔"

ترلوکی چند نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔ "یہ تو بہت کم ہے۔" اس نے میز کے خانے سے سیر رم کی بوتل نکالی اور رام بلی کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ "پوری جا کر ابھی ختم کر دو۔"

رام بلی گھبرا کر بولا۔ "یہ تو بہت ہے۔"

ترلوکی چند نے پیار سے ڈانٹ کر کہا۔ "ٹھاکر جھوٹ مت بکو۔"

رام بلی جھوم کر بولا۔ "جیسی مرضی سرکار کی۔"

وہ کہنے لگا۔ "آج رات کو کارخانے کے سامنے مزدوروں کا جلسہ ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ جلسہ نہ ہو۔ میں تم کو کچھ آدمی بھی دے دوں گا۔"

رام بلی اکڑ کر بولا۔ "نہیں سرکار، آدمیوں کی کیا ضرورت ہے۔ بس ایک بڑھیا سی لاٹھی منگوا دو، آپ کی مہربانی سے ایک بھی سامنے ٹھہر جائے تو یہ گردن سر سے اتار دینا۔"

ترلوکی چند ہنسنے لگا۔ "نہیں نہیں، کچھ نہ کچھ مدد تمہارے ساتھ ضروری ہے، وہ بہت سے ہوں گے۔"

رام جی ایسی بات بڑا ڈرامیا ، صاحب آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ آپ نے رام جی کے ہاتھ ابھی دیکھے نہیں، دو دن تماشا تو دیکھیے گا، کوئی مائی کا لال میدان میں رہ جائے تو بیتا ہے کو سیکھ کر دیدیا

اس نے مونچھ مروڑ دیا اور سینہ تان کر پٹھان کی طرح کھڑا ہو گیا۔
تھوڑی دیر ایک مرد کی ہدایتیں لیتے رہے، بعد رام جی کوٹھی سے باہر چلا گیا۔
اب گاڑی میں جا کر اس نے بوتل کھولی اور روپے سے ٹکوڑے تلوا کر منگائے۔

جھوم جھوم کر شراب پینے لگا۔
ایک گھنٹے تک وہ اسی طرح پیتا رہا۔ جب بوتل ختم ہو گئی تو وہ اٹھ کر کوٹھی کی طرف چل دیا۔ چوکیدار سے معلوم ہوا کہ تیرہ آدمی جیپ موٹر سے لگ کر آ گئے ہیں۔ لیکن وہاں تیرہ آدمی موجود تھے خوب مضبوط کڑیل جوان ابھی ہاتھ جوڑ کر رام جی سے کہا تمہیں رام جی نے شاکر۔ رام جی نے خوش ہو کر ان کو دیکھا۔ "بھیا تم سب آ گئے۔"
وہ اس کو لاٹھیاں کھانی گئیں اس نے ایک لمبی سی لاٹھی نکالی جس کے دونوں سروں پر لوہے کا ٹھوس خول چڑھا تھا رام جی نے اس کو لچا کر دیکھا۔ دو چار ہاتھ کھائے۔ لاٹھی اس کو پسند آ گئی۔

آدھ گھنٹے تک وہ کوٹھی کے قریب درختوں کے اندھیرے میں بیٹھے رہے سامنے میدان میں ایک گیس بتی جل رہی تھی۔ کارخانے کے مزدور آہستہ آہستہ میدان میں اکٹھے ہوتے جا رہے تھے، کوئی پونے نو بجے جلسہ شروع ہوا، ایک مزدور لیڈر کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگا۔ بیچ بیچ میں نعرے لگتے۔ تالیاں بجتیں۔ جب جلسہ گرمی پر آیا اور رام جی نے اپنے آدمیوں کو ساتھ لیا اور جلسہ گاہ کی طرف چل دیا۔

جلسہ سے تھوڑی دور ہٹ کر وہ سب ایک جگہ اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ اسکیم کے مطابق پہلے ایک آدمی کو جلسہ گاہ میں بھیجا گیا۔ وہ ایسے زاویے سے جا کر کھڑا ہوا کہ گیس بتی کی پوری روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ تین بار وہ سر کھجانے کے انداز میں ایسے

ہاتھ کینٹین تک لے گیا۔ یہ بڑے صاحب کے ان آدمیوں کے لئے اشارہ تھا جو پہلے ہی سے جلسہ میں مختلف مقامات پر تعینات کر دیئے گئے تھے۔

اسی وقت جلسہ کے ایک کونے سے کسی نے گرج کر "اٹھا کر رکھا ہوا جملہ" دہرایا۔ "بکواس بند کرو، یہ بالکل جھوٹ ہے۔"

ابھی یہ آواز رکنے بھی نہیں پائی تھی کہ دوسری سمت سے آواز آئی "ایسا کبھی نہیں ہوا، تم مزدوروں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتے ہو۔"

پھر تو کئی طرف سے مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں، سیٹیاں بجنے لگیں، مرغوں اور بکریوں کی آوازیں نکال نکال کر ٹولی کے آدمیوں نے جلسہ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اب ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں شور بڑھ رہا تھا۔

آوازیں دھیمی بھی نہیں پڑنے پائی تھیں کہ اچانک رام بلی اپنی ٹولی کو لے کر جلسہ کے اندر گھس گیا اور اندھا دھند لاٹھیاں چلانا شروع کر دیں۔ کارخانے کے قلی جو گڑبڑ سے پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے اس حملہ سے بالکل بدحواس ہو گئے۔ رام بلی نے گیس بتی کے پاس پہنچ کر اس پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ مارا۔ گیس بتی دور جا کر گری۔ اس کی جیسی چمک تھی وہ گم ہو گئی ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا اور اس اندھیرے میں لاٹھیاں تڑا تڑ چلتی رہیں شور اور تیز ہو گیا۔ قلیوں میں بھگدڑ پڑ گئی، جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر ہی بھاگا چند ہی منٹ میں جلسہ گاہ کھنڈر کی طرح ویران ہو گئی۔ ٹوٹی ہوئی گیس بتی ایک طرف الٹی پڑی تھی۔

رام بلی اور اس کے ساتھ کے لوگ بھی کارخانے کے اندر واپس آ گئے۔ انھوں نے کچھ دیر تک کوٹھی کے قریب درختوں کے نیچے بیٹھ کر آرام کیا۔ جب ذرا سستا گئے تو اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

جلسہ نہ ہونے کے باوجود بھی ہڑتال جاری رہی۔ سویرے ہی سویرے مزدوروں کی ٹولیاں پھاٹک پر اکٹھا ہونے لگیں۔ مگر کام پر کوئی نہ گیا۔ اگر کوئی آدمی اندر جانے کی

کوشش بھی کرتا تو پکٹنگ کرنے والے مزدور اس کی تھوڑی کو چھو کر خوشامد کرتے بعضوں نے سختی کی تو انھوں نے پیروں پر ٹوپی تک ڈال دی۔ اس طرح وہ مزدور بھی کارخانے میں نہ جا سکے جو ہڑتال میں شریک نہیں تھے اور جنھوں نے ترلوک چند کے ایجنٹوں سے صبح کارخانے میں کام کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

ترلوک چند واپس آگیا تھا اور اس وقت دفتر میں موجود تھا۔ ہڑتال کے متعلق اس کو لمحہ لمحہ کی خبر مل رہی تھی جب دن خاصا چڑھ گیا اور کوئی مزدور کام پر نہ آیا تو اس نے تھانے پر ٹیلیفون کیا اور پھاٹک پر پہرہ دینے کے لئے کچھ کانسٹبل بلوائے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔

جب پولیس آگئی تو ترلوک چند نے فوراً اپنے ایجنٹوں کو دوڑایا کہ وہ مزدوروں کو دلاسا دے کر، ڈرا دھمکا کر کسی نہ کسی طرح ترغیب دلا کر کام پر بلا لائیں۔ اس لئے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ کارخانہ کسی طرح بند نہ ہو، اس طرح مزدوروں کے حوصلے بڑھ جانے کا خطرہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کو فوج کے لئے ایک ضروری آرڈر سپلائی کرنا تھا لیکن پولیس کو دیکھ کر بھی ہڑتالی مزدور مرعوب نہ ہوئے۔ پکٹنگ بدستور جاری رہی۔

دوپہر کو ترلوک چند نے رام لی کو بلایا اور اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ہڑتالی مزدوروں کو مار پیٹ کر کے پھاٹک سے پرے بھگا دے۔ رام لی نے رات والے آدمیوں کو اکٹھا کیا، لاٹھیاں سنبھالیں اور نہتے مزدوروں پر حملہ کر دیا۔ ایک ہی ریلے میں مزدور تتر بتر ہو گئے، مگر ذرا دیر کے بعد ادھر ادھر سے اکٹھے ہو کر پھر وہیں آگئے۔

اس دفعہ وہ کارخانے کے پھاٹک سے خاصا دور رہے، اور گلا پھاڑ پھاڑ کر پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ رام لی پھر بدمعاشوں کے گروہ کے ساتھ پھاٹک سے نکلا۔ اس دفعہ مزدور بھی تیار تھے۔ انھوں نے رام لی پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پتھروں سے رام لی کے گرگوں کے علاوہ پولیس والوں کے بھی تھوڑی بہت چوٹ آگئی مگر ان کو گولی چلانے کا حکم نہیں تھا اس لئے وہ پھاٹک کے اندر چلے گئے۔

پتھر برابر چلتے رہے جب کبھی رام بلی پھاٹک پر نمودار ہوتا مزدور پتھروں کی بارش شروع کر دیتے۔ انھوں نے اچھا خاصا محاذ بنا لیا تھا۔ وہ دو گروہوں میں بٹ گئے تھے، جو لوگ پیچھے تھے وہ سڑک کی مرمت کے لئے پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیروں میں سے پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے اور جگہ جگہ ان کی ڈھیریاں بناتے جا رہے تھے۔

کئی بار جب رام بلی کو ناکامی ہوئی تو جھنجھلا کر اس نے اپنے آدمیوں کو للکارا اور پتھروں کی بوچھار میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کئی پتھر اس کے آ کر لگے مگر وہ ٹھہرا نہیں آگے ہی قدم بڑھاتا رہا۔ قریب پہنچ کر وہ مزدوروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور جلد ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ترلوکی چند پھاٹک سے دور کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ رام بلی مزدوروں کا پیچھا کرتا ہوا دور تک چلا گیا اور دیر تک کھڑا ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، مگر جب کوئی بھی نظر نہ آیا تو وہ واپس آ گیا۔ اس وقت اس کے جسم پر کئی جگہ سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ سینہ تانے ہوئے چل رہا تھا۔

مزدور کچھ اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ وہ شام تک پکٹنگ کے لئے نہ آئے۔ دوسرے دن رام بلی سویرے ہی سویرے پھاٹک کے پاس جا کر اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ مگر اس روز بھی کوئی پکٹنگ نہ ہوئی۔ اب ترلوکی چند کے آدمیوں نے بھاگ دوڑ تیز کر دی تھی۔ اس روز بھی کارخانہ چل نہ سکا لیکن کچھ مزدور کام پر آ گئے۔ مزدور یونین ہڑتال جاری نہ رکھ سکی۔ اس نے غیر مشروط طور پر ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

ترلوکی چند اتنا خوش ہوا کہ اس نے رام بلی کی تنخواہ چالیس روپے سے ایک دم سو روپے کر دی۔ اس کے علاوہ اس کو دو سو روپے نقد، شراب کی تین بوتلیں اور اپنا ایک اوور کوٹ بھی دیا جس کو پہن کر رام بلی تھانیدار کی طرح اکڑ کر چلتا۔

جس روز رام بلی کو تنخواہ کے پورے سو روپے ملے۔ اسی دن اس نے ترلوکی چند سے

ہفتہ بھر کی چھٹی لی اور رات کی گاڑی سے بیرام گھاٹ کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت وہ بیرام گھاٹ پہنچا۔ وہاں اور تو کوئی اس کا رشتہ دار نہ تھا صرف ایک بہن تھی وہ سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ بہن نے عرصہ دراز بعد اس کو دیکھا تو خوشی سے چیخ نکل گئی اس کا بہنوئی جو ریلوے میں پوائنٹ مین تھا اور ہمیشہ اس کو گالیاں دیا کرتا تھا، یہ سن کر کہ وہ سو روپے مہینہ کا ملازم ہو گیا ہے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

شام کے وقت وہ بسوں کے اڈے پر گیا۔ اس روز سردی تیز تھی۔ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ٹین کے لمبے شیڈ کے نیچے موٹر ڈرائیور، کلینر اور اسی قبیل کے لوگ الاؤ دہکا کر زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ رام بلی اس وقت اپنا اوورکوٹ، خاکی پتلون اور سیاہ پالش سے چمکتا ہوا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ مجسم رام بلی اس لباس میں ٹمبر کے پاسنگ افسر کی طرح شاندار نظر آرہا تھا۔ اس کو دیکھ کر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ باتوں کا شور یکبارگی ٹھہر گیا۔ یکایک کسی نے اس کو پہچان کر زور کا نعرہ بلند کیا

"ابے یار رام بلی تو ہے، کب آیا؟"

پھر کئی طرف سے آوازیں آئیں۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ تو مر کھپ گیا پر تیرے تو بڑے ٹھاٹھ دکھائی دے رہے ہیں۔"

"سالے نے سچ مچ ڈرا ہی دیا تھا۔ میں تو سمجھا کہ ٹریفک کا انسپکٹر اس وقت آمرا!"

"آؤ میری جان ادھر آؤ۔"

رام بلی کو اُن کا یہ انداز کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ کہنے لگا "نہیں! مجھ کو یہیں رہنے دو زیادہ دیر تک مجھ کو ٹھہرنا نہیں ہے۔"

کسی نے ایک گندی سی گالی دی۔ "ابے تیری تو —— سالا بالکل لاٹ صاحب ہو گیا ہے۔"

"ہاں جی، بات کیسے کر رہا ہے۔" دوسری طرف سے ایک اور آواز آئی۔

پھر دو آدمی اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔ رام لی انکار کرتا رہا، مگر وہ اس کو زبردستی کھینچ کر الاؤ کے پاس لے آئے۔ ایک ڈرائیور نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر ایک کلینر کے سامنے پھینک کر کہا۔ "جانا یار لپک کے ایک بوتل تو لانا۔" کلینر نے روپیہ اٹھایا اور شراب لینے چلا گیا۔

سب نے مل کر رام لی پر سوالوں کی بوچھار کر دی —— وہ ہنس ہنس کر سب کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ اب ذرا وہ ان سے مانوس ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں بوتل آئی..... اور مہوے کی تلخ اور تیز شراب کا دور چلنے لگا۔ اس وقت وہاں نو آدمی موجود تھے؛ ذرا دیر میں بوتل ختم ہو گئی۔ رام لی نے سرور کے عالم میں جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔

"لو یار، سب کی شراب لے آؤ۔"

اسی وقت ایک ڈرائیور نے اس کو پیار سے ڈانٹا۔ "سالے بڑا رئیس ہو گیا ہے جیلیں رعب جما رہا ہے۔ تُھکتی کے اگر جیبیں جھاڑ دوں گا تو کئی دس کے نوٹ گر پڑیں گے۔"

اس بات پر بڑا زور کا قہقہہ پڑا۔

"ہاں، ہاں بھئی اس کو جیب میں رکھ لے۔"

"کیا تو ہم کو اتنا گرا ہوا سمجھتا ہے، پھٹے ہوئے ٹائر کے ٹیوب۔"

سب نے مل کر اس کو خوب ڈانٹا۔ رام لی نے آخر نوٹ جیب کے اندر ڈال ا

پھر انھوں نے آپس میں چندہ کیا اور اکٹھی دس بوتلیں منگا ڈالیں؛

شراب زیادہ تھی، اس لیے سب فراخ دلی سے پی رہے تھے۔ بوتل پر بوتل کھلتی چلی گئی۔ اسی وقت کوئی ڈھولک بھی کہیں سے اٹھا لایا اور سب نے لہک لہک کر اپنا پوربیا راگ چھیڑ دیا۔ نشہ کے ساتھ ساتھ راگ تیز ہوتا گیا تیز اور تیز سب گلا پھاڑ کر بے ہنگم پن سے بھونڈی آوازیں نکال رہے تھے۔ راگ تو نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا اب صرف شور و غل رہ گیا تھا۔ پھر تالیاں بجا بجا کر وہ الاؤ کے گرد جھوم جھوم کر ناچ

لگے۔ ایسی رنگ رلیاں عام طور وہ ہولی کی رات کو منایا کرتے تھے

دیسی شراب کی پوری دس بوتلوں کا نشہ رنگ لاکر رہا کسی نے مستی کی تو وہیں بے سدھ ہوکر پڑ گیا۔ کچھ بے سُری لے میں گا گا کر بہک رہے تھے۔ کسی کو اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا

رام بلی نشہ میں دھت ہو چکا تھا۔ اس نے ایک خالی بوتل اٹھالی اور بار بار اس کو ہونٹوں سے لگا کر اس طرح گردن کی رگیں پھیلاتا جیسے غٹا غٹ شراب پی رہا ہے کسی نے ہنسی ہوئی آواز میں کہا۔ "لو یار یہ اپنی ماں کا یار رام بلی تو ابھی سے بہکنے لگا۔ سالا خالی بوتل سے پی رہا ہے۔"

کسی اور نے جھوم کر کہا "پی رہا ہے، پینے دو، ہاں یار پی ضرور پی، یہ گدھے کا پیشاب ضرور پی، تیری تو ...... ! سالا بڑا شرابی بنا پھرتا ہے"

رام بلی لڑکھڑا کر بولا "کس .. .. والے نے مجھ کو گالی دی۔ میں اس کو جان سے مار دوں گا۔"

"ارے تو جان سے مارے گا، ہہ ہہ۔" وہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر زوردار قہقہے لگانے لگا پھر اس نے رام بلی کو طعنہ دیا۔ "حرام کی کھا کھا کر بہت چربی چڑھ گئی ہے، تو اپنے کو سمجھتا کیا ہے؟"

رام بلی نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی لیکن اس نے اس زور سے رام بلی کے پیٹ میں گھونسا مارا کہ رام بلی کے ہاتھ سے گردن چھوٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام لیا۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے رام بلی کے منہ پر کس کس کر کئی گھونسے اور جڑ دیئے۔

رام بلی لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ ایک بار وہ اٹھا بھی، پھر گر پڑا، ذرا دیر اسی حالت میں پڑا گالیاں بکتا رہا پھر وہ اس آدمی پر اچانک جھپٹا اور دونوں گتھ گئے۔ لوگوں نے شور مچانا بند کر دیا اور ان کے چاروں طرف اکٹھے ہو گئے۔ اب ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"برابر کی چوٹ ہے، خبردار کوئی بیچ میں نہ بولے۔"

"ہاں، ہاں ہی کوئی نہیں بول سکتا"

"ہے شاباش، واہ میری جان، کیسا اڑنگا مارا ــــــ" نشہ کی جھونک میں وہ خود بھی دھم سے گر پڑا۔

"ہے جیو، دیکھو گردن بچ جائے"

"اے لا ڈنگڑی پر، او تیری ماں کا ـــ!"

دونوں بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور چاروں طرف سے زور زور سے للکار اور گالیاں پڑ رہی تھیں۔ آخر ایک دفعہ اس آدمی نے رام بلی کی گردن کو اس طرح اپنے بازو میں دبایا کہ وہ بے بس ہو گیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے رام بلی کے چہرے پر تابڑ توڑ کئی زوردار ہاتھ رسید کر دیئے۔ اس بات پر چاروں طرف کھڑے ہوئے شرابی اس آدمی پر ٹوٹ پڑے اور اُس کی ٹھکائی شروع ہو گئی۔

رام بلی نے لمحہ بھر کے لئے چیخ پکار سنی اور پھر وہ بے سدھ ہو گیا

ابھی سویرا نہیں ہوا تھا کہ رام بلی کی آنکھ کھل گئی۔ سردی اب بہت تیز ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا بدن پانی میں بھیگتا جا رہا ہے اور وہ سردی سے کانپ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا دھندلی روشنی میں ایک آدمی اس کے سامنے کھڑا پیشاب کر رہا ہے جس کی دھار اس کی کنپٹی پر گر رہی ہے، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اس سے ڈانٹ کر کہنے لگا۔ "اے یہ کیا حرکت، سالا منہ پر موت رہا ہے"

وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا "اے منھ پر نہ موتوں تو کیا تیرے چوتڑوں پر موتوں یہ بھی اچھی رہی۔" اتنا کہہ کر وہ چند قدم آگے بڑھ کر دھم سے زمین پر لیٹ گیا۔

رام بلی اب تھوڑا بہت سنبھل چکا تھا، اس کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا، جبڑے میں درد ہو رہا تھا ـ اس نے منہ چھو کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک طرف کا رخسار پھولا ہوا ہے تمام جسم بھیگی ہوئی رسی کی طرح اینٹھ رہا ہے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا سائبان سے باہر آ گیا۔ صبح کی ہلکی دودھیا روشنی میں آ کر

اس نے دیکھا کہ اس کا تمام جسم خاک میں لتھڑا ہوا ہے۔ اس نے نفرت سے گھوم کر سائباں کی جانب دیکھا اور جھومتا ہوا گھر کی جانب چلدیا۔ اس کا بہنوئی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رام لال کو اس حالت میں دیکھا تو ہمیشہ کی طرح زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ وہ تو اس کو اسی وقت گھر سے دھکے دے کر نکال دینا چاہتا تھا مگر بہن نے خوشامد کر کے اس کو ڈیوٹی پر بھیجدیا۔

رام لال دن بھر چارپائی پر پڑا کراہتا رہا۔ اس کے بدن میں بڑا درد ہو رہا تھا۔ سہ پہر تک اس کو بخار ہو گیا۔ بخار کے حال میں وہ اڈے کے ڈرائیوروں اور کلینروں کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ اس واقعہ پر اس قدر پشیمان تھا کہ بہنوئی کے گھر میں آتے ہی وہ جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر کے سو جاتا۔

کئی روز بعد جب ذرا اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو وہ اڈے کی طرف گیا بھی نہیں۔ سیدھا بس میں سوار ہو کر لکھنؤ چل دیا۔ اس کو ڈرائیور اور کلینر اب بیحد حقیر نظر آتے تھے حالانکہ ان کو رام لال کی ناراضگی کا مطلق احساس نہ تھا۔ اس روز رات کو جو کچھ ہوا تھا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اڈے پر اکثر ایسے ہنگامے ہوتے تھے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ بازار میں ایک نئی طرح کی چہل پہل تھی۔ رام لال جس وقت چوک کے اندر پہنچا شام ہو چکی تھی۔ اس نے پھول والی گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر لوٹن سے پان کے دو بیڑے لئے اور منہ میں دبا لئے۔ لوٹن پان دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ رام لال کو اس کی یہ بے نیازی بری معلوم ہوئی۔ کہنے لگا "ابے لوٹن تو نے مجھ کو پہچانا نہیں بے؟"

لوٹن نے حسب معمول روکھے پن سے کہا "ہاں جی پہچانا کیوں نہیں۔ تم رام لال ہو نا۔" اور سر جھکائے پانوں پر تیز تیز ہاتھوں سے کتھا چونا لگاتا رہا۔ رام لال جھنجھلا کر رہ گیا۔

"ابے کیا تیری جورو بھاگ گئی ہے، جو اس طرح مُنہ لٹکائے بیٹھا ہے"
وہ بگڑ کر بولا۔" دیکھو جی منہ سنبھال کر بات کرو"
رام بلی کو زیادہ غصہ نہیں آیا۔ خواہ مخواہ مسکرا کر کہنے لگا۔" او ہو، تو تو بڑا لاٹ صاحب ہو گیا ہے"
اُس نے پھر اسی لہجہ میں کہا " بات کرنا ہے تو ٹھیک سے بات کرو، ورنہ اپنا راستہ لو"
رام بلی وہاں لڑنے نہیں گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ یہ سالا پنواڑی واقعی جوتے خور ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اس کی خاطر راہو مہاراج سے جھگڑا مول لیا۔
وٹن کی دوکان پر اس وقت بدمعاشوں کی ایک ٹولی موجود تھی۔ رام بلی جھنجلایا ہوا جب آگے بڑھا تو ان میں سے کسی نے کہا" کون تھا جی یہ ؟"
دوسرے نے ہنس کر کہا۔" معلوم ہوتا ہے نیا بگڑا ہے"
رام بلی نے ان کی باتیں سنیں تو سخت تاؤ آیا۔ مگر وہ اس وقت لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا، خاموشی سے آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر اللہ رکھی کے دروازے پر پہنچ کر زینہ میں داخل ہو گیا۔
اللہ رکھی دروازے ہی پر مل گئی۔ دیکھتے ہی ہنس کر بولی" ارے ٹھاکر تم ہو۔ کہاں رہے اتنے دن تک، اللہ قسم تم تو بڑے بے مروت نکلے"
رام بلی دانت نکال کر خوشی سے ہنسنے لگا۔
اللہ رکھی نے اس کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی۔
" سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے تم کو کتنا یاد کیا۔ کئی بار ترلوکی چند سے کہا بھی کہ رام بلی کو اپنے ساتھ لے آنا۔ مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ٹھاکر آتا ہی نہیں۔ سچ مچ تم بڑے بے وفا ہو"
رام بلی خوشی سے پھول سے گیا۔
دونوں دیر تک اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اللہ رکھی نے باتوں میں بتایا۔

"تم چلے گئے تو مجھ پر کیسے کیسے وقت پڑے۔ چوک میں اب نئے نئے غنڈے آگئے ہیں۔ وہ الگ اودھم مچاتے ہیں۔ پھر وہ حرّافہ نکہت میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس کے ایک بھتیجے نواب صاحب تھے، ایک دن میرے یہاں آگئے۔ تم ہی بتاؤ میں کوئی اس بھڑوے کو بلانے تو گئی تھی بس اسی بات پر جل گئی ہے۔ اس کے کئی لگوار ہیں سالی کو بھیج کر کوٹھے پر بلوہ کراتی ہے، کئی بار ایسی حرکت ہو چکی ہے۔ تم ہی ذرا سوچو، اگر کسی کوٹھے پر روز جھگڑا ہو تو کتنی بدنامی کی بات ہے کوئی شریف آدمی یہاں کیوں آنے لگا۔ اور تو اور تمھارے سیٹھ صاحب کے سامنے ایک دن ایسی گڑبڑ ہو گئی تو وہ کہہ رہے تھے کہ 'اللہ رکھی اب تمھارے یہاں آنے کا نہیں ہا'۔ وہ مسکرا مسکرا کر منہ بنا بنا کر باتیں کرتی رہی رام بلی خاموشی سے بیٹھا اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھتا رہا کہ اللہ رکھی کی مسکراہٹ میں کیا پیاری ادا ہے اُس کے اداس ہو جانے میں کس قدر خوبصورتی ہے اس کا جی چاہا کہ وہ یوں ہی باتیں کرتی رہے اور وہ سنتا جائے

پھر اللہ رکھی نے کہا۔ "آج تم اس حرامزادی کے لگواروں کو ذرا ڈانٹ تو دو۔ میری جان مصیبت میں کر دی ہے"

رام بلی گردن اکڑا کر جھوٹ بولا۔ "کون ہیں کون! سالوں کو میں ٹھیک کر کے رکھ دوں گا کیا وہ آج بھی آئیں گے۔"

وہ کہنے لگی "ان کا اس وقت آنا ضروری تو نہیں۔ مگر وہ یہیں۔ ججّو مرزا کے چائے خانے میں بیٹھے ہوں گے۔"

رام بلی ایک بارگی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اللہ رکھی نے پوچھا "کہاں چلے؟"

"میں ابھی آیا، ذرا دیکھوں تو کون سے بدمعاش ہیں؟"

وہ روکتی بھی رہی، مگر وہ زینے پر کھٹ کھٹ کرتا ہوا تیزی سے نیچے اُتر گیا اور سیدھا ججّو مرزا کے چائے خانہ میں گھس گیا۔ اس نیم روشن اور نیچی نیچی چھت والے

تنگ سے چائے خانے میں کئی آدمی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ رام لی ان کے سامنے سینہ تان کے یوں کھڑا ہو گیا کہ وہ سب بونوں کی طرح حقیر نظر آنے لگے۔ رام لی نے بڑے رعب سے پوچھا۔ "کون ہے جی! جو رُوند اشفر رکھی کے کوٹھے پر جا کر بلوہ کرتا ہے؟"

وہ لوگ حیرت سے بیٹھے اس کا منہ دیکھتے رہے۔

رام لی نے اس دفعہ گالی دے کر کہا۔ "جس کو بڑا مان ہو آ جائے سامنے، سالوں کو شرم نہیں آتی عورت کو جا کر ستاتے ہیں۔ بنے پھرتے ہیں بانکے۔ تمھارے بانکوں کی تو......!"

ان میں سے ایک شخص، جس کا جسم گٹھا ہوا تھا، مونچھوں پر تاؤ تھا، اکڑ کر بولا۔ "جو اس سالی کو ستاتا ہو اس سے جا کر کہو، یہاں ہمارے سر پر کیوں شور مچا رہے ہو آخر یہ کہاں کی شرافت ہے؟" رام لی چونکہ لڑنے ہی کی غرض سے آیا تھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "کون ہے وہ سالا اپنی ماں کا یار۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس کی مردانگی؟"

دوسرے آدمی نے جو ذرا صلح کُن تھا، سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "تو بھائی جا کر اس کی گردن پکڑو ہمارے سر کیوں خواہ مخواہ ہوئے جا رہے ہو!"

رام لی چکر میں پڑ گیا۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ کھڑے ہو کر برابر گالیاں بکتا رہا۔ اس دفعہ پھر گھنی مونچھوں والا اکڑ کر بولا۔ "دیکھو جی! خواہ مخواہ نہ الجھو، ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔"

رام لی للکار کر بولا۔ "کیا نتیجہ بُرا ہوگا، ابھی پتہ لگے جاتا ہے۔"

مگر بجھو مرزا نے بات بڑھنے نہ دی۔ انھوں نے سوچا جھگڑے میں خواہ مخواہ سارا سامان ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ یہ سالے تو لڑ بھڑ کر چلے جائیں گے۔ یہاں مفت کی چپت پڑ جائے گی۔ وہ جھٹ وہاں پہنچ گئے۔ اور رام لی کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر بولے۔

"میاں جانے دو۔ خواہ مخواہ کے جھگڑے سے کیا فائدہ۔"

رام جی بگڑ کر بولا۔ "نہیں جی، میں ذرا اس کی ماندگی دیکھنا چاہتا ہوں۔"
پھر اس شخص کو مخاطب کر کے بولا۔ "ابے تو جانتا نہیں تو کس سے بات کرتا ہے۔
اسی چوک میں راجو مہاراج کو ٹھوک کر مارا تھا۔ ایک کو نہیں، پورے سات لٹھ بند
بدمعاشوں کو بہتے اور اکیلے دم پر مارا تھا۔"
ٹیکھو مرزا کہنے لگے "ٹھاکر صاحب آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں، چوک میں آپ کو
کون نہیں جانتا۔ بچہ بچہ پہچانتا ہے، یہ لونڈے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ان کے منہ لگ

رہے ہیں۔"
رام جی آپے سے باہر ہوئے جا رہا تھا، کہنے لگا "مرزا جی آپ ہٹا دیجیے ان کو
اب جو انھوں نے اللہ رکھی کے یہاں جا کر اودھم مچایا تو چوک میں لاشیں گر جائیں گی۔
ایک ایک کو گھونس گھونس کر ماروں گا۔"
ان سب کو غصہ تو بہت آیا مگر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ اس لیے کہ رام جی کا نام
سن کر وہ واقعی دھونس کھا گئے تھے۔ باوجودیکہ رام جی چوک میں عرصہ بعد آیا تھا۔ مگر اس
بازار کے دوکانداروں اور بالاخانوں پر جب کبھی بدمعاشوں کا ذکر آتا تو رام جی کے جیالے
پن کے بارے میں طرح طرح کے قصے سنائے جاتے۔ ہر شخص یہی کہتا۔ "صاحب ایسا
جی دار آدمی تو دیکھنے میں نہیں آیا۔ بڑے بڑے غنڈوں کا اس کے سامنے پیشاب خطا
ہو گیا۔" کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ سہمے ہوئے چپ چاپ بیٹھے رہے۔
ٹیکھو مرزا نے رام جی کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔ رام جی لوٹتے ہوئے سوچنے لگا۔
چلو سستے چھوٹ گئے۔ جھگڑا فساد ہو جاتا تو خواہ مخواہ چوٹ چپیٹ آ جاتی۔ سانپ بھی مر گیا۔
اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔
اللہ رکھی اس کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "ٹھاکر تم نے تو کمال کر دیا۔ میری بات بھی نہیں
سنی اور چل دیئے۔"
وہ روٹھے ہوئے انداز میں بولا "پہلے تو خون کھولا دیا، اب کہتی ہو کہ چلے کیوں گئے؟"

"ہائے ہے! جتنی دیر تم وہاں رہے میرا تو دل دھڑکتا رہا کہ کہیں بات نہ بڑھ جائے۔"
رام بلی بولا "بات بڑھ جاتی تو کیا ہوتا' وہ تو سب سالے ہیجڑے تھے میں نے
ہزاروں گالیاں دیں، کان دبائے بیٹھے رہے۔ ساری بدمعاشی ابھی نکال کر رکھ دیتا۔
وہ تو مرزا جی نے ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا۔ بوڑھا آدمی ہے اس کی بات ماننا پڑی۔
ورنہ میں تو ابھی دو چار کی ہڈیاں پسلیاں توڑ تاڑ کر رکھ دیتا:"
وہ اسی طرح بیٹھا بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا رہا اور اللہ رکھی مسکرا مسکرا کر بڑھاوا
چڑھاوا دیتی رہی، اسی خاص ادا اور لگاوٹ کے ساتھ جو رام بلی کو بہت بھلی لگتی تھی۔
وہ دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر مجرے کا وقت ہوگیا۔ اللہ رکھی نے لباس تبدیل کیا
اور ناچ گانے کی محفل جم گئی۔ رات گئے تک خوب ہنگامہ رہا۔
رام بلی نے اللہ رکھی سے کمبل لیا اور باورچی خانہ کے پاس والی کوٹھری میں جاکر
سوگیا۔ وہ دیر تک بے خبر سوتا رہا۔ نہ معلوم کتنی رات بیت چکی تھی کہ کسی کے قدموں کی
آہٹ سے اچانک رام بلی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اندھیرے
میں کوئی گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"
"کوئی نہیں، میں ہوں" یہ اللہ رکھی کی آواز تھی۔
رام بلی نے پوچھا "کیوں، کیا ہوا، اس وقت کیسے ادھر آگئیں؟"
وہ اس کے پائنتی بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "ٹھاکر، مجھ کو بڑا ڈر
لگ رہا ہے"
رام بلی نے پوچھا۔ "کیوں؟"
وہ بتانے لگی "میں نے سنا ہے کہ تم نے جوان لوگوں کو جاکر گالیاں دی
تھیں اب وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے تمہارے خلاف سازش کر رہے ہیں۔"
رام بلی لاپرواہی سے بولا "وہ سالے ہیجڑے کیا بدلہ لیں گے؟"
اللہ رکھی کہنے لگی "نہیں ٹھاکر، وہ میرے گھر کا جھگڑا ہی تو ہے نا، نکہت محلے کی طرف

گیا تھا کہ سچ پوچھو تو میں نے خود بھیجا تھا کہ ذرا سن گن لے کر آئے کہ اب وہ مال زادی کیا کر رہی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب وہاں اکٹھے تھے، بڑے غصے میں تھے۔ تم کو گالیاں دے رہے تھے۔"

رام لال بولا "تم رنڈیوں کی یوں ہی باتیں چلتی ہیں۔ جاؤ جا کر سو جاؤ، بے کار نیند نہ خراب کرو۔"

وہ تھنک کر کہنے لگی "مجھ کو تو بڑا ڈر لگ رہا ہے"

اندرکھی کا جسم رام لال کے جسم سے ملا ہوا تھا۔ رام لال کو بڑی الجھن معلوم ہو رہی تھی اکتا کر بولا "اچھا اب نیند خراب نہ کرو، جا کر سو جاؤ جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

اس کو بیزار دیکھ کر اندرکھی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ رام لال کمبل تان کر پھر سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو ہی وہ کمبولی چلا گیا

سفر کی تکان بھی دور کرنے نہ پایا تھا کہ ترلوکی چند کا آدمی اس کو بلانے آ گیا

رام لال بادل ناخواستہ ترلوکی چند کے پاس پہنچ گیا۔

ترلوکی چند کہنے لگا "تم خوب وقت پر آئے، میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

رام لال نے پوچھا "سرکار، کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟"

وہ بولا "ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے، جو تمہاری اتنی ضرورت پڑی" اتنا کہہ کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی۔

اس کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ترلوکی چند نے ریسیور اٹھایا اور باتیں کرنے لگا۔

"ہیلو صاحب! کیا خبر ہے؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں نے سب بندوبست کر لیا ہے"

"اچھا تو وہ مان گیا، چلو یہ بھی اچھا ہوا"

"دس ہزار تک پر تیار ہو جائے گا، اگر ایسا ہے تو طے کر لو۔"

"یہیں آرہے ہو، یہ تو سب سے اچھی بات ہے۔"

"نہیں اب اس کا موقع نہیں، اس مسئلہ پر یہیں بات کریں گے۔"

"میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں، ذرا جلدی آنا۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر رکھ دیا۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ رام بلی سے ہنس کر کہنے لگا۔ "جاؤ، تم جا کر اب سو جاؤ۔ شاید تمھاری ضرورت نہیں پڑے گی۔"

رام بلی اس وقت جاہتا بھی یہی تھا، خوشی خوشی واپس چلا گیا۔

ترلوکی چند نے سگار سلگایا اور باجپئی کا انتظار کرنے لگا۔ باجپئی یوں تو کارخانے میں اسٹور کیپر کا کام کرتا تھا۔ لیکن آدمی ذہانتیز اور معاملہ فہم تھا۔ اس لئے جب کبھی کوئی خاص الجھن درپیش ہوتی تو وہ ایسے کاموں کے لئے ہمیشہ اس کی ذہانت سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

آج شام کو بھی اس نے باجپئی کو ایک اہم کام کے لئے بھیجا تھا اور وہ اہم کام تھا کہ حکومت کی نئی منصوبہ بندی کے تحت کھولی کے لئے بھی بجلی فراہم کرنے کا بندوبست کیا جا رہا تھا لیکن ترلوکی چند چاہتا تھا کہ یہ اسکیم کامیاب نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قصبہ میں ایک نیا پاور ہاؤس تعمیر ہو جاتا جو سرکاری ریٹ پر سستی بجلی سپلائی کرتا۔ اور اب تک ترلوکی چند اپنے جنریٹر سے جو بجلی سپلائی کر رہا تھا وہ بند کر دی جاتی۔ اس طرح اس کا جنریٹر بے کار ہو جاتا جو اس نے ۷۰ ہزار روپیہ صرف کر کے لگوایا تھا۔ انہی دنوں ترلوکی چند کو یہ اطلاع ملی کہ پاور ہاؤس کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک انجینئر اپنے عملہ کے ساتھ کھولی پہنچ چکا ہے۔ اس کا قیام سرکاری ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ ترلوکی چند نے سوچا کہ معاملہ کا سارا دارومدار اس کی رپورٹ پر ہے۔ اگر اس نے مخالفت کر دی تو اسکیم کئی سال کے لئے التواء میں پڑ جائے گی۔ اس لئے پہلے تو اس نے یہ کوشش کی کہ وہ اس کی کوٹھی پر آکر ٹھہر جائے۔ مگر جب وہ اس کے لئے راضی نہ ہوا تو اس نے باجپئی کو بھیجا مگر وہ بے حد خشک آدمی نکلا۔ جب بھی باجپئی نے معاملہ کی بات چھیڑی، وہ فوراً

دوسرا ذکر چھیڑ دیتا۔ کئی ہفتے یہی سلسلہ چل رہا تھا، اور اس کا عملہ برابر سروے میں مصروف تھا ترلوک چند کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، آخر میں اس نے زچ ہو کر سوچا کر دام ہی سے کام لیا جائے۔ انجینئر کو مار دیا گیا تو بہت ممکن ہے، دوسرا انجینئر آئے تو اس سے کچھ نہ کچھ کام چل جائے اور نہیں تو کم از کم کچھ عرصہ کے لئے، یہ جھنجھٹ تو ٹل ہی جائے گا لیکن سرکاری آدمی کا معاملہ تھا اسلئے اس خطرناک کام کو کرتے ہوئے ترلوک چند ہچکچا رہا تھا باجپئی کی اطلاع نے جیسے اسکے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا تھا۔ اس کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد کوٹھی کے باہر سڑک پر موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ ترلوک چند اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ انجینئر کو لینے دروازہ تک گیا۔ باجپئی اس کے ہمراہ تھا۔ دونوں آکر کمرے میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ ترلوک چند نے وہسکی کی بوتل منگوائی کہ باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی دور چلتا رہے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ترلوک چند نے حرف مطلب زبان پر لاتے ہوئے کہا "مسٹر دوبے آپ ہی دھرم سے بتایئے کہ کیا ایسے چھوٹے سے قصبہ کے لئے، لاکھ، سوا لاکھ روپیہ لگا کر بجلی گھر بنانا مناسب ہوگا۔ اتنا روپیہ تو حکومت کسی اور کام پر صرف کرے تو اچھا ہے۔"

انجینئر تجربہ کار آدمی تھا، بات کے شروع ہی میں وہ اپنی اہمیت کم کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے ذرا اختلاف کیا، کہنے لگا "مسٹر ترلوک چند، آپ کی رائے سے میں اتفاق نہیں کروں گا، یہ تو پندرہ ہزار آبادی کا قصبہ ہے۔ میں نے تو یورپی ممالک میں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک کو بجلی سے جگمگاتے دیکھا ہے۔"

ترلوک چند بولا "آپ بھی کیا بات کرتے ہیں، کہاں یورپ [illegible]ں ہمارا ملک۔ ابھی تو اس اسٹینڈرڈ پر پہنچنے کے لئے ایک صدی لگے گی۔ اس وقت آپ کا یہ سوچنا مناسب ہوگا۔"

وہ مسکرا کر بولا "مسٹر ترلوک چند یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ آپ لوگوں کو زیادہ دیر تک

اندھیرے میں نہیں رکھ سکتے۔ وہ روشنی بھی مانگیں گے، پانی بھی مانگیں گے، ہر وہ چیز مانگیں گے جو اُن کو چاہیئے ہے۔"

ترلوکی چند سٹ پٹا سا گیا۔ لیکن باجپئی نے فوراً سہارا دیا، کہنے لگا۔" بحث کا یہ موقع نہیں، اب کچھ کام کی بات ہو جائے، رات خاصی ہو چکی ہے۔"

ترلوکی چند جھٹ سے بولا۔" چلو ٹھیک رہے گا یا آپ مناسب سمجھیں تو کیش کا بھی بندوبست ہو جائے گا مطلب یہ ہے کہ رپورٹ میں اس اسکیم سے قطعی اختلاف کیا جائے۔"

دوبے کہنے لگا۔" ابھی روپے کی ضرورت نہیں، پہلے کچھ کام تو ہو جانا چاہیئے۔ اس وقت تو میں اس لئے آیا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔"

ترلوکی چند ہنسنے لگا۔" بڑی کرپا کی آپ نے۔ میں تو چاہتا تھا کہ آپ یہیں آکر ٹھہرتے مگر نہ جانے آپ نے کیوں یہ بات منظور نہیں کی۔"

دوبے بولا۔" نہیں سیٹھ صاحب، کوئی خاص بات نہیں تھی، بس یونہی نہیں آیا۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر وہاں اور بیٹھا اور رخصت لے کر چلا گیا۔ باجپئی بھی اس کو چھوڑنے کی غرض سے چلا گیا۔ جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو ترلوکی چند نے آہستہ سے میز کی دراز کھولی، اس میں سے ریوالور نکالا اور اس کو لئے ہوئے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ رام جی قصبے سے لوٹ رہا تھا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اپنے کوارٹر کی جانب جا رہا تھا کہ بارش آنے سے پیشتر ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ ایکا ایکی بادل زور سے گرجے اور موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں، اس وقت وہ رانی لجا کے بنگلے کے پاس تھا کہیں اور جانے کا موقع نہ تھا۔ لہٰذا وہ بنگلے کے بیرونی ویرانڈے میں بارش سے بچنے کے لئے ٹھہر گیا۔

ویرانڈے میں اندھیرا تھا۔ ہوا درختوں میں شور مچاتی ہوئی چل رہی تھی۔ رام جی

سردی سے سکڑا ہوا دیوار سے ٹیک لگائے اُمڈ اُمڈ کر برستی ہوئی بدلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ بنگلے کے اندر دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر وہاں بالکل سناٹا تھا، نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی آواز۔ رانی بوا غالباً اب سو چکی تھی۔

بارش لگاتار ہوتی رہی، یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے۔ ایکا ایکی برابر والے کمرے کی کھڑکی کھلی اور کسی نے سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ ویرانڈے میں کون کھڑا ہے؟"

رام بلی نے مڑ کر اس طرف دیکھا، کھڑکی پر اس کو رانی بوا کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کہنے لگا۔ "کوئی نہیں رانی بوا، بارش پڑ رہی تھی، سو میں یہاں آگیا۔"

وہ حیرت سے بولیں۔ "ارے رام بلی تو ہے، وہاں اندھیرے میں کیوں کھڑا ہے، اندر آجا۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ذرا دیر میں آبنوسی جسم والا رام بلی ان کے سامنے موجود تھا۔ سردی کے مارے اس کے سر کے خشک بال کھڑے ہوگئے تھے موٹے موٹے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ کہنے لگیں۔ "ارے! تو تو معلوم ہوتا ہے کہ بھیگ بھی گیا ہے، چل دوسرے کمرے میں چل۔"

رام بلی پالتو کتے کی طرح چپ چاپ ان کے ہمراہ چل دیا۔ اس کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ رام بلی کو اس کمرے میں بڑا سکون محسوس ہوا۔ رانی بوا آتشدان کے پاس پڑی ہوئی ایک لمبی سی کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں۔ رام بلی ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگیں۔

"ارے کھڑا کیوں ہے، یہیں آتشدان کے پاس بیٹھ جا۔"

رام بلی وہیں آتشدان کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اور لوہے کی سلاخ اٹھا کر دہکتے ہوئے انگاروں کو کریدنے لگا۔ رانی بوا کچھ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

دیر وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے رام بلی سے پوچھا۔ "رام بلی ایک بات بتا۔ میں نے سنا ہے کہ تو شراب پیتا ہے؟"

رام بلی اپنے غلیظ دانت نکال کر بدتمیزی سے ہنسنے لگا۔

وہ بگڑ کر بولیں "رام بلی تب تو بہت برا ہے" پھر انھوں نے یقین نہ آنے کے سے انداز میں استفسار کیا "سچ رام بلی تو شراب پیتا ہے؟"

رام بلی صاف گو آدمی تھا، کہنے لگا "دارو ملتی کہاں ہے، جو پیوں، پر ٹھنڈائی کا ایک آدھ گلاس روز ضرور چڑھا لیتا ہوں۔"

ان کو اس کی یہ سادگی بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے کہنے لگیں "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مل جائے تو تو ضرور پی لے گا؟"

رام بلی نے خوشامد سے "اچھے موسم میں اگر تھوڑی سی پینے کو مل جائے تو ٹھاٹھ ہو جائیں، کہنے لگا "رانی بوا اس وقت دارو کی بات نہ کرو، کیا بڑھیا موسم ہو رہا ہے۔"

رانی بوا اس کی اس بے تکلفی پر ذرا بھی ناراض نہ ہوئیں، خاموش بیٹھی اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہیں جس پر اب نئی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوفناک حد تک بے چین معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے لوہے کی سلاخ اٹھائی اور خواہ مخواہ کوئلوں کو کریدنے لگا۔

انگارے اب خوب دہک رہے تھے۔ ان کے تیز تیز شعلوں سے کمرے کی خاموش فضا میں حرارت جھلکتی ہوئی سرخ روشنی پھیل گئی تھی۔ رانی بوا کو اس کی یہ بے چینی بڑی دلچسپ معلوم ہوئی، کہنے لگیں۔

"اس وقت تجھ کو شراب مل جائے تو؟"

رام بلی کو جیسے ان کی بات پر یقین نہ آیا۔ "کیا رانی بوا؟" پھر جلد ہی ناامید ہو کر بولا "یہاں شراب کیسے مل سکتی ہے؟"

وہ ہنسنے لگیں "اوہ بھول جائے!"

وہ امید اور ناامیدی کے عالم میں بولا "مذاق نہ کرو رانی بُوا!"

انھوں نے کہا "اچھا تو بھی کیا یاد کرے گا کہ رانی بوا کے بنگلہ پر گیا اور تیری خاطر نہ ہوئی" اتنا کہہ کر وہ کھڑی ہو گئیں اور اس سے بولیں "میں ابھی آئی" پھر وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

رام بلی بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں برانڈی کی بوتل تھی۔ ٹرے میں گلاس رکھا تھا اور ایک طشتری میں مٹھائی کے چند ٹکڑے اور تھوڑی سی دال موٹھ رکھی تھی۔ رام بلی خوشی سے اچھل پڑا۔

"ارے واہ!" اور بے خودی میں ہُو ہُو کر کے زور سے ہنسنے لگا اور جب رانی بُوا نے ساری چیزیں اس کے سامنے لاکر رکھ دیں تو جوش میں آکر اس نے نعرہ لگایا۔ "رانی بوا کی جے!"

انھوں نے اس کو فوراً ڈانٹا "شور مت مچا، برابر والے کمرے میں منوہر سو رہا ہے، اس کی آنکھ کھل جائے گی۔" شراب کا رسیا رام بلی اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہنے لگا۔ "بڑی غلطی ہو گئی رانی بُوا، پر یہ بوتل آئی کہاں سے؟"

وہ برانڈی کی بوتل کو ہاتھ میں لے کر اس کے لیبل کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ "بڑی بڑھیا شراب لگتی ہے۔"

وہ بولیں۔ "برانڈی ہے برانڈی۔" پھر وہ ذرا رازدارانہ انداز میں کہنے لگیں۔ "کسی سے کہنا مت، تمھارے بڑے سیٹھ جی کو اس کا بڑا شوق تھا۔ انھیں کی کچھ بوتلیں ابھی تک پڑی ہیں۔"

رام بلی نے جھٹ سے پوچھا "ابھی اور بھی ہیں؟"

وہ بولیں "کیوں نہیں! پر تو تو بڑا رنگیلا آیا۔ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ سب تیرے

ہی لئے، میں سے رکھ چھوڑی ہیں۔"

رام بلی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ اس نے اپنے مضبوط دانتوں سے بوتل کھولی تھوڑی سی برانڈی گلاس میں ڈالی اور ایک ہی گھونٹ میں غٹا غٹ چڑھا گیا۔

رام بلی جھوم جھوم کر برانڈی پیتا رہا۔ رانی بوا کرسی پر نیم دراز لیٹی خوابناک نظروں سے رام بلی کی ہر حرکت کا معائنہ کر رہی تھیں۔ آتشدان میں کوئلے خون سے لال لال انگارے دہک رہے تھے۔ باہر درختوں میں ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ بارش ابھی جاری تھی۔ بلا اوش رام بلی نے فرانسیسی برانڈی کی پوری بوتل دیکھتے ہی دیکھتے ختم کر دی۔ ذرا دیر خواہ مخواہ آگ کریدتا رہا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا رانی بوا اب میں چلوں گا۔"

وہ بولیں "مینہ تو بند ہو جانے دے۔ کوارٹر تک جاتے جاتے بھیگ کر پوٹا ہو جائیگا۔"

رام بلی نے جانے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ خاموشی سے جاکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ رانی بوا بولیں — "رام بلی ایک بات میں نے غور کی۔ تو نے پوری بوتل چڑھالی مگر تو ذرا نہیں بہکا۔ بڑا زبردست شرابی معلوم ہوتا ہے۔"

وہ بولا "سرکار، اپنا اس ولایتی شراب سے کہاں بھلا ہوتا ہے۔ ہم تو دیسی ٹھرا پینے والے ہیں۔ اپنے کو تو اسی سے نشہ ہوتا ہے۔" رانی بوا ہنسنے لگیں۔

"کہتا تو تو ٹھیک ہے۔ بڑے سیٹھ جب پیتے تھے تو بڑا اودھم مچاتے تھے۔ گھر کے نوکروں کی تو بیا مر کر رہ جاتی تھی، یہ توڑ، وہ پھوڑ، کسی پر چلا رہے ہیں، کسی کو مار رہے ہیں۔ میری تو سب سے زیادہ مصیبت آجاتی تھی، کبھی تو میری گود میں سر ڈالے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں، تو کبھی بدن کے سارے کپڑے نوچ نوچ کر پھینک دیتے تھے۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے تو ان میں ایک اور بُری عادت پیدا ہو گئی تھی یعنی کہ ننگی ننگی حرکتیں کرتے تھے کتے کی طرح جہاں موقع ملا گوشت پر دانت گاڑ دیئے۔ ایک بار تو میری کمر پر انھوں نے اس زور سے کاٹا کہ خون نکل آیا۔" اتنا کہہ کر انھوں نے بلاؤز سرکا کر اپنی ننگی کمر رام بلی کے سامنے کر دی۔

بلد پر ابھی تک دانتوں کا سیاہی مائل بھورا سا نشان موجود تھا۔
رام لی نے ان کی برہنہ جلد کو دیکھا تو اس کو وہ رات یاد آگئی۔ جب وہ غسل خانے کی کھڑکی پھاند کر اس بنگلہ میں آیا تھا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ایک ایک بات اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ پھر اس کو رانی بوا کا برہنہ جسم پر گنگا جلی سے پانی چھڑکنا بھی یاد آگیا۔
وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس نے جھک کر رانی بوا کے پیر پکڑ لئے اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔
"رانی بوا، میں بہت پاپی آدمی ہوں، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔"
وہ گھبرا کر رہ گئیں، پھر ذرا سنبھل کر اپنے پیروں پر سے اس کو اٹھایا۔ اب وہ نشہ میں دھت تھا، اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور جسم بے قابو ہوئے جارہا تھا انھوں نے اس کو ڈانٹ کر کہا۔
"ارے تو تو بہکنے لگا۔ یہ کیا واہی تباہی بکنے لگا ہے"
رام لی اب ذرا سنبھل چکا تھا۔ اس نے زبان سے تو ایک لفظ نہ نکالا اور گہری نظروں سے رانی بوا کو دیکھنے لگا۔ آتشدان کے دہکتے ہوئے انگاروں میں اُن کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ گردن پر ہلکی نیلی نیلی رگیں گٹھے ہوئے جسم پر چست بلاؤز اس وقت وہ اسکو بڑی اچھی لگیں۔ وہ ان کو یوں ہی گھورتا رہا۔ رانی بوا نے کئی بار اس کی طرف نظریں اٹھائیں مگر وہ رام لی کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لاسکیں۔
ایکا ایکی رام لی نے نہ جانے کیا سوچا کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور رانی بوا نے ٹوک کر کہا۔ "کہاں جارہا ہے؟"
وہ نشہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب جاکر سوؤں گا۔"
"یہیں سو جا، سویرے چلے جانا۔ مینہ بہت تیز برس رہا ہے۔"
وہ جھوم کر بولا۔ "برسنے دو، یہاں نہیں سوؤں گا۔ ڈر معلوم ہوتا ہے۔"
وہ حیرت زدہ ہو کر بولیں۔ "ڈر معلوم ہوتا ہے کس سے؟"
وہ بہک کر بولا۔ "تم سے، رانی جی ——" بقیہ جملہ اس کے حلق ہی میں رہ گیا۔

وہ نشہ کی جھونک میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کی ٹانگیں درختوں کی شاخوں کی طرح جھول رہی تھیں۔

رانی بوا کہنے لگیں: "تو تو واقعی بہکنے لگا ہے۔ مجھے کیوں ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولا: "تم بہت خطرناک عورت ہو۔"

وہ سادگی سے مسکرانے لگیں۔ رام بلی کھڑا ان کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہی دمکتا ہوا لال بھبوکا چہرہ، وہی گردن کی نیلی نیلی رگیں، وہی بھرا بھرا جسم۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ اور ان پر جھک کر بولا: "رانی جی" اور اس نے ان کا شانہ اس زور سے اپنے کھردرے مضبوط ہاتھوں سے دبایا کہ ان کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ سہمی ہوئی آواز سے بولیں۔

"ارے میرا کندھا تو چھوڑ دو"

لیکن ہیم شحیم رام بلی جس کا کالا کلوٹا بدن انگاروں کی تیز روشنی میں اور بھی زیادہ سیاہ فام نظر آرہا تھا، وہ وہاں سے نہ ہٹا۔ پھر رانی بوا کی گھٹی ہوئی آواز ابھری، اور پھر وہ خاموش ہو گئیں۔

باہر طوفانی ہوا چیختی ہوئی چل رہی تھی۔ موسلا دھار بارش کے قطرے درختوں کے پتوں پر ٹپ ٹپ کر کے گر رہے تھے۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔

سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے منوہر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اللہ کرایاں کی مسہری کی طرف دیکھا، ان کو وہاں نہ پا کر پانچ برس کا ننھا منوہر زور زور سے رونے لگا۔ اچانک برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور رانی بوا بے کمرے میں آ گئیں۔ رام بلی بھی اسی وقت اللہ کرایاں کے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ بارش بھی اب تھم گئی تھی لیکن آسمان میں چاروں طرف بادل گھرے ہوئے تھے۔ ہوا پھر سے زوروں سے چل رہی تھی۔ سردی کے مارے دانت بجنے لگے۔

تمام دن وہ کچھ پریشان سا رہا۔ اسی پریشانی کے عالم میں اس نے بھنگ کے گلاس

چڑھائے۔ اس طرح پریشانی تو کم نہیں ہوئی البتہ نشہ کی دھن میں اس نے بڑی دلچسپ حرکتیں کیں اپنے گالوں پر زور زور سے طمانچے مارے۔ دھاڑیں مار کر خوب رویا کہیں سے رسی ڈھونڈ کر نکالی اور اس کو پنڈلی پر باندھ کر اس قدر جکڑا کہ اس کی چیخ نکل گئی

شام تک وہ ایسی ہی احمقانہ سزائیں اپنے لئے تجویز کرتا رہا۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ رانی بوا کے پیر پکڑ کر معافی مانگ لے۔ کچھ یہ سوچ کر وہ ان کے بنگلہ کی طرف چل دیا۔

ابھی سر شام ہی تھی۔ اس نے احاطہ کو عبور کیا اور خوف زدہ سا جا کر ویرانڈے میں کھڑا ہو گیا ذرا دیر بعد اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی اندر سے کوئی آواز نہ آئی وہ سہما ہوا کھڑا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے پھر دوازہ کھٹکھٹایا کسی نے کھڑکی کھولی، مگر اس سے کچھ پوچھا نہیں البتہ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ پھر اس نے سنا رانی بوا کہہ رہی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے، آج پھر تم کو شراب کی طلب ستا رہی ہے"

رام بلی کو ان کی اس بات پر بڑا تعجب ہوا۔ نہ تو وہ اس پر بگڑیں، نہ اس کو بنگلہ سے دھکے دے کر نکالنے کی دھمکی دی بلکہ وہ تو شراب پلانے کے موڈ میں معلوم ہوتی تھیں پھر بھی رام بلی نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔ لیکن رانی بوا اس سے نظریں نہ ملا سکیں۔۔ صرف اتنا کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں

"رام بلی تم یہیں بیٹھو میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گی"

وہ کمرے میں ایک طرف جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا البتہ برابر والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی جس کی شعاعیں کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر اندر آرہی تھیں۔ وہ اس نیم تاریک کمرے میں بیٹھا رانی بوا کا انتظار کرتا رہا۔ ان کی آواز دور سے سنائی پڑ رہی تھی، وہ کسی سے اونچی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔

بہت دیر بعد رانی بوا واپس آئیں۔ مگر وہ اندر نہ آئیں۔ دروازے میں سے جھانک کر

بولیں: "اس کمرے میں آجاؤ" وہ اُٹھ کر اس طرف چلا گیا۔ یہ وہی کل والا کمرہ تھا۔ آتش دان روشن تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ وہیں ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی، جس پر برانڈی کی بوتل اور کچھ چٹ پٹا کھانے کا سامان رکھا تھا۔

وہ حسب معمول فرش پر بیٹھنے لگا تو رانی لوا نے ڈانٹ کر کہا: "وہاں کیوں بیٹھ رہا ہے، آ ادھر کرسی پر بیٹھ جا" وہ سحر زدہ انسان کی طرح میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر رانی لوا نے اس سے شراب پینے کے لئے کہا اور اس نے بوتل کھول کر گلاس پر گلاس خالی کرنا شروع کر دیئے۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس روز بھی وہ صبح کاذب کے دھندلکے میں سردی سے کپکپاتا ہوا واپس لوٹا۔ اب اکثر رات کے سناٹے میں رانی لوا کے بنگلے کے اندر رام بلی کی آواز سنائی دیتی۔

ترلوکی چند ان دنوں ایک نئی اسکیم بنا رہا تھا، لہذا وہ رام بلی کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گیا تھا۔ یوں بھی عام طور پر وہ اس کو کسی خطرناک موقع پر ہی یاد کرتا تھا۔ جب سے کارخانے میں ہڑتال ہوئی تھی، وہ مزدوروں کی جانب سے بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے تھے جو ایک ایک بات کی آکر مخبری کرتے تھے۔ یونین کا آفس تو اس نے جلوا ہی ڈالا تھا، اور جن لوگوں نے ہڑتال میں آگے بڑھ کر حصہ لیا تھا، ان میں سے بعض کو اُس نے مزدوری بڑھا کر اور دوسری مراعات دے کر اپنی "گڈ بک" میں کر لیا تھا، جن سے اس کو خطرہ تھا، ان کی اس نے کڑی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب کسی طرح کارخانے میں ہڑتال نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ایک بار بھی قلیوں نے اپنے مطالبات منوا لئے تو اس طرح اُن کی ہمت بڑھ جائے گی اور وہ روز ہڑتال کرنے کی دھمکیاں دیتے رہیں گے۔ اپنی بات منواتے رہیں گے۔

یونین کو ختم کرنے کے لئے اس نے پہلا کام تو یہ کیا کر ان میں پھوٹ ڈلوا دی۔ اس نے ان کو دو گروہوں میں کر دیا۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جن میں زیادہ تر قصبہ ہی کے رہنے والے تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو دوسرے علاقوں سے آئے تھے، دونوں گروہوں میں اس کے خاص آدمی کام کر رہے تھے۔ آپس میں تعلق اتنا بڑھ چکا تھا کہ ایک بار کارخانے کے باہر میدان میں دونوں گروہوں کے آدمیوں میں زبردست جھگڑا ہوا۔ آزادی کے ساتھ لاٹھیاں چلیں، پتھر چلے، بعض زخمی ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ کچھ کو حوالات میں کئی روز تک بند رہنا پڑا۔

ترلوکی چند مزدوروں کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہو چکا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ دوسرا کارخانہ لگانے کے واسطے جرمنی جا کر خود مشین کا سودا کرے۔ انہی دنوں اس کو یہ اطلاع ملی کہ مزدور پھر گڑبڑ کرنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک پوشیدہ یونین بنالی ہے جس کے جلسے رات کے سناٹے میں کارخانے کے ایک مستری ٹوبک بابا کے گھر میں ہوتے ہیں۔

ترلوکی چند نے بہت کوشش کی کہ یہ پتہ چل جائے کہ ان جلسوں میں کون کون شامل ہوتا ہے مگر اس بات کا اس کو کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ایک بار اس نے ٹوبک بابا کو بلایا بھی، دیر تک باتیں کرتا رہا، اس کو دھمکایا بھی، ہیڈ مستری بنانے کی رشوت بھی دی، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کسی بات کا ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا۔

ترلوکی چند کے ایجنٹ برابر اس کو ہر بات کی اطلاع دیتے رہے۔ ٹوبک بابا کے گھر میں ہونے والے جلسوں کے علاوہ اب انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ مزدوروں میں دبی زبان سے ہڑتال کی بات سنی جا رہی ہے۔ وہ جلدی کوئی گڑبڑ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا سر پر منڈلانے والے اس خطرہ کو ٹالنے کے واسطے اس نے نئی اسکیم بنانا شروع کر دی۔

ہولی کا تہوار قریب آرہا تھا، سردی میں کمی آگئی تھی پھاگن کی ہواؤں میں

کلیوں کی مہک تھی۔ راتیں بڑی سہانی ہو گئی تھیں۔ ایک ایسی ہی رات کو جب پورے چاند کی جھلکتی ہوئی اجلی اجلی چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ رام بلی نے نئی قمیص پہن کر چوٹی بالوں کو دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جمایا اور خوب بن ٹھن کر رانی بوا کے بنگلہ کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی اثنا میں ترلوکی چند کا آدمی آیا کہ بڑے صاحب نے فوراً بلایا ہے، مجبوراً وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

ترلوکی چند نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ وہ اس کو اپنے ہمراہ لے کر کوٹھی کے پچھلے حصہ کی طرف گیا۔ وہاں کچھ دیر تک وہ سرگوشی کے انداز میں آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اس کو اپنے ہمراہ لے کر ایک کمرے کے دروازے پر گیا اس نے بڑے گمبھیر لہجہ میں رام بلی سے کہا۔

"میں نے تم کو ضروری باتیں بتا دی ہیں۔ یہ کام جس طرح بنے صبح تک ہو جائے۔ میں کل تمہاری زبان سے نہیں سننا نہیں چاہتا۔" لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولا "اب تم کمرے کے اندر چلے جاؤ۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر ترلوکی چند وہاں سے چلا گیا — رام بلی خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

اسی وقت اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی، دروازہ تو نہیں کھلا، البتہ کسی نے اندر سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"رام بلی۔"

اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک آدمی نے دروازے سے جھانک کر اس کو دیکھا اور آہستہ سے بولا "اندر آ جاؤ ٹھاکر!" رام بلی چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے کمرے کے اندر جا کر دیکھا کہ دیوار سے ذرا ہٹ کر ایک نیم برہنہ آدمی کھڑا تھا۔ شکرے کی طرح آگے کو جھکی ہوئی ناک، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں،

دُبلا پتلا جسم، اس کے سینے کی ایک ایک پسلی نظر آ رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت نڈھال سا گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اسکے علاوہ وہاں دو آدمی اور تھے، مضبوط جسم، لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں، خونخوار آنکھیں، یہ گردھرا اور ٹونی تھے۔ رام جی دونوں کو جانتا تھا اس نے ٹونی سے آہستہ سے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟"

وہ بولا "ٹوبک بابا، تم اس کو نہیں جانتے؟"

رام جی کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اس کو کوئی بہت خطرناک قسم کا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا کہنے لگا۔

"یہی ٹوبک بابا ہے؟"

اسی وقت نیم برہنہ جسم والے ٹوبک بابا نے اس کی جانب مڑ کر دیکھا اور بڑے صاف لہجہ میں کہنے لگا۔

"ہاں، میرا ہی نام ٹوبک ہے، تم بھی مجھ کو مارنے آئے ہو نا؟"

رام جی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے ٹوبک بابا کی بات کو نظرانداز کر کے ٹونی سے پوچھا "کچھ کام بنا؟" اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ لیکن گردھر فوراً بولا۔

"گھبرانے کی بات نہیں، سالا بتائے گا کیسے نہیں، ابھی بتلاتا ہے۔"

ٹونی نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی "ابھی سر میں ذرا گرمی چڑھی ہوئی ہے تھوڑی دیر میں اتر جائے گی، یوں چٹکیوں میں سب کچھ کہہ دے گا، بس تمہارے آنے کی دیر تھی ٹھاکر!"

رام جی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب تک غصہ نہیں آئے، وہ کسی کو کیسے مار سکتا ہے۔ اب غصہ کیسے پیدا کیا جائے۔ اس کو خاموش

دیکھ کر ٹونی نے پاس رکھی ہوئی بالٹی میں سے المونیم کے گلاس میں پانی بھرا اور پورا گلاس ٹوبک بابا کی ننگی پیٹھ پر ڈال دیا۔ اس نے سوچی سے کیکیا کر ایک سسکی بھری اور اس کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ اسی وقت گردھر نے چمڑے کا لمبا سا تسمہ اٹھایا اور سڑاسڑ اس کی پیٹھ پر مارنا شروع کر دیا۔ ٹوبک بابا کبھی ایک طرف جھک جاتا، کبھی دوسری طرف۔

جب گردھر کے ہاتھ ذرا سست پڑ گئے تو ٹونی نے اپنا تسمہ اٹھایا اور ٹوبک بابا کی کھال ادھیڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

رام بلی کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے، اچانک اس نے سوچا کہ اگر ان دو آدمیوں سے میرا جھگڑا ہو جائے تو کیا میں ان پر بھاری پڑوں گا۔ اُڑنے سے پہلے پَر تولنے والے پرندے کی طرح اس نے بازوؤں سے پٹھوں کو دبا کر اپنی طاقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش فضول تھی، وہ ان کو مار کیسے سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"ٹھہرو جی، بس بہت مار چکے!"

ٹونی کا ہاتھ رُک گیا۔ اس نے دیکھا، رام بلی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ پھر اس نے فوراً ہی اپنی غلطی کو محسوس کیا، نرمی سے بولا۔ "ضدی آدمی ہے تم اس طرح نہیں جیت سکتے۔ کوئی اور تدبیر نکالنا پڑے گی۔" وہ دونوں اس کا منہ تکنے لگے۔ رام بلی سوچنے لگا۔ وہ تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ اسی وقت گردھر نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ کہنے لگا۔

"ابھی تو رات باقی ہے۔ آؤ ذرا سا شغل ہو جائے۔"

یہ کہہ کر اس نے کونے سے شراب کی بوتل اٹھائی اور گلاس میں انڈیل کر گلاس اس کے آگے بڑھا دیا۔ "پہلے تم اس کو تو چڑھاؤ۔ ذرا گرمی آئے تو پھر کوئی اپنی ترکیب ورکیب لگانا۔" رام بلی کو یہ پروگرام بہت پسند آیا۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ تینوں بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ جب ذرا نشہ ہو گیا، تو ٹونی نے رازدارانہ لہجہ میں کہا: "ٹھاکر میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔"

رام بلی بولا: "کیا؟"

ٹونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ گلاس میں شراب انڈیلی اور اس کو لے کر ٹوبک بابا کے پاس لے گیا "لے بے تھوڑی سی تو بھی لگا لے۔ کیا یاد کرے گا کوئی سیٹھ ٹونی چند ملا تھا" ٹوبک بابا کہنے لگا۔

"پلانا ہی ہے، تو اتنی سی کیا، بوتل اٹھا لاؤ تب مزا ہے۔"

ٹونی بھڑکنے لگا: "سالے کی رئیسی تو دیکھو، کس ٹھاٹھ سے بول رہا ہے، ابے تیری تو" اس نے گالی دے کر ساری شراب ٹوبک کے منہ پر انڈیل دی۔ اور اس کی کمر پر تابڑ توڑ کئی لاتیں ماریں۔

ٹوبک درد سے دوہرا ہو گیا۔ ہائے ہائے کرتا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

اب گردھر بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس نے ٹوبک بابا کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا "سالے ابھی سے مزا جا رہا ہے" اور اس نے اپنے گلاس کی شراب بھی اس کے سر پر انڈیل دی اور اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ "بول کیا کہتا ہے، ساری بات ٹھیک ٹھیک بتا دے، نہیں تو سالے ارتھی کی طرح یہیں جلا کر بھسم کر دوں گا۔" اس نے جھٹ سے ماچس جلائی اور اس کے سر کے قریب لے گیا۔ ٹوبک بابا کا جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ بھیگے ہوئے بالوں میں سے شراب کے قطرے اس کے چہرے پر ٹپک رہے تھے۔

گردھر نے دوسری ماچس جلائی اور اس کے قریب لے گیا۔ رام بلی نے دور ہی سے اس کو روکا۔

"ابے کیا کرتا ہے [illegible] یہ شراب پھولوں کی طرح آگ پکڑتی ہے۔ جل [illegible] آ گئے گا۔"

وہ دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ٹوبک کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لی اور چیخ کر بولا۔

"بول کیا کہتا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ رام بلی نے اپنی گرفت کو اور سخت کر دیا۔ ٹوبک نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے لگیں۔ چہرہ سیاہ پڑنے لگا۔ ہڈیاں اور ابھر آئیں۔ اس نے گردن چھوڑ دی۔ ٹوبک بابا پورا منہ کھول کر ہانپنے لگا۔ رام بلی کو اس کا اس طرح سانس بھرنا بڑا تکلیف دہ معلوم ہوا۔ اس نے دیکھا ٹوبک بابا کی پیٹھ پر، بازوؤں پر نیلے اور سرخ نشان جلی ہوئی اینٹوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جن میں جگہ جگہ سے جیتا جیتا خون رس رہا تھا۔

رام بلی کو متلی سی معلوم ہونے لگی، وہ لپک کر اس جگہ گیا، جہاں شراب کی بوتل رکھی تھی اور اس کو منہ سے لگا کر غٹ غٹ پینے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے تسمہ کے سرسرانے کی آواز سنی ٹوبک بابا درد سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ رام بلی نے مڑ کر دیکھا اور خاموشی سے شراب پیتا رہا۔ البتہ اب وہ ڈائرکٹر کے فرائض انجام دینے لگا تھا۔ یوں بھی تراوکی چند نے گردھر اور ٹونی کو اس کی ماتحتی میں دیا تھا جب ایک تھک جاتا تو وہ دوسرے کو اشارہ کرتا، وہ تسمہ لے کر ہاتھ چلانا شروع کر دیتا۔

کئی گھنٹے اسی طرح گذر گئے۔ رات اب آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ ٹوبک کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ جب زیادہ تکلیف ہوتی تو ہائے ہائے کرتا ہوا فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا۔ اس کی اس خاموشی پر اب واقعی رام بلی کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ اور وہ جھنجھلا جھنجھلا کر گردھر اور ٹونی کو للکارتا۔

"ابے ذرا کس کے ہاتھ لگاؤ۔ تمھاری تو ——؟"

ٹوبک کے ساتھ ساتھ وہ ان کو بھی گالیاں دینے لگا۔ آخر وہ جلتا ہوا پھر اس کے پاس گیا اور سامنے جا کر تن کے کھڑا ہو گیا۔

"بول! ابے حرامی بولتا کیوں نہیں؟"

ٹوبک بابا حسب معمول بت بنا کھڑا تھا۔ رام بلی نے جھلّا کر اس کے منہ پر ایک زناٹے کا بھرپور ہاتھ مارا، پھر دوسرا، تیسرا، لگاتار کئی ہاتھ مارے۔ ٹوبک نے حلق کے اندر سے بڑی دردناک چیخ نکالی اور اس کی گردن لٹک گئی، اس کی ایک آنکھ سوج گئی تھی اور ہونٹوں کے گوشوں سے خون ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ رام بلی نے گالی دے کر کہا۔

"بول! بولتا ہے کہ نہیں؟"

اس نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ اس دفعہ ٹوبک نے گردن اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، درد سے کراہتے ہوئے اس نے کہا۔

"مار دست" وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

رام بلی نے ہاتھ روک لیا۔ ٹوبک رک رک کر کہنے لگا۔ تم مجھ کو بڑے صاحب کے سامنے پیش کر دو۔ میں ان سے سب کچھ کہہ دوں گا۔ یہی چاہتے ہو نا

رام بلی بولا۔ "ہاں بس یہی"

ٹوبک میں قوت مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس کو بار بار کھڑا کرتے تھے اور وہ فرش پر گر گر پڑتا تھا۔ پھر اس نے رام بلی سے کہا "میرے ہاتھ تو کھول دو، میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ ہو سکے تو میرے بدن پر کمبل ڈال دو" رام بلی نے کونے میں پڑا ہوا کمبل اٹھایا اور اس کے جسم پر ڈال کر بولا۔

"ہاتھ تو سویرے سے پہلے نہیں کھلیں گے"

رام بلی اب بڑا خوش تھا۔ اس نے ٹوبک کے شانے پر تھپتھپایا۔ وہ درد سے چیخ پڑا۔ "ہاتھ مت لگاؤ درد ہوتا ہے" رام بلی نے ہاتھ ہٹا لیا اور شاباشی دینے کے انداز میں کہنے لگا۔

"ٹوبک بابا، تم بہت اچھے آدمی ہو"

ڈیک بگڑ کر بولا" گالی مت دو" میں نے اپنے ساتھیوں کو دھوکا دیا۔ رام جی تم میرے منہ پر تھوک دو" اور پھر اس کی آواز بھرّا گئی اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ رام جی کچھ پریشان سا ہوگیا۔ اس نے ٹونی سے کہا۔

"تم دونوں باہر جاکر بیٹھو، کمرہ بند کر دینا۔ سویرے بڑے صاحب کے سامنے اس کو لے جانا"

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور وہاں سے سیدھا رانی والے بنگلہ پر پہنچا۔

رات کے کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا پیلا پیلا چاند درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا، خاموشی تھی، صرف کارخانے کی مشینوں کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کئی بار دستک دی۔ اندر بنگلہ میں نہ کوئی آہٹ ابھری، نہ آواز آئی۔

وہ کھڑا دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ آخر رانی بوا کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی

"کون ہے ؟"

رام جی نے اونچی آواز میں کہا: "میں ہوں رام جی، دروازہ تو کھولو"

دروازہ کھلتے ہی وہ رانی بوا کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور ڈانٹ کر بولا "یہ دروازہ اتنی دیر میں کیوں کھلا؟" ان کو اس کا انداز ناگوار گزرا، بگڑ کر بولیں۔

"جب تو نشہ میں ہوا کر تو یہاں مت آیا کر"

مگر وہ اس وقت ان سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ "دیکھو رانی جی، تم مجھ سے اس طرح بات مت کیا کرو" ان کو اور بھی برا لگا۔ کہنے لگیں۔

"اوہو، تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا! ایک تو سوتے میں آکر نیند خراب کر دی۔ اوپر سے اول فول بک رہا ہے"

رام جی نشے میں جھوم کر بولا۔ "میں کہتا ہوں رانی کا تم اب چپ ہو جاؤ" یہ اس کی آواز بنگلہ میں گونج اٹھی۔ رانی بوا واقعی گھبرا گئی تھیں، آہستہ سے بولیں۔

"دھیرے بول منوہر اٹھ جائے گا" ذرا توقف کر کے وہ کہنے لگیں۔ "تو اس وقت نشے میں دھت ہو رہا ہے، جا کر اپنے کوارٹر میں سو"

رام جی کو یہ بات بے حد بری معلوم ہوئی۔ "نہیں میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گا" پھر وہ نشے میں بڑبڑانے لگا۔

"لو ہم تو سالی کے پاس اتنی دور سے چل کر آئے، اور یہ نکال رہی ہے، تیری تو ایسی کی تیسی، بڑی رانی بن کر آئی ہے"

پہلی بار رام جی کے منہ سے گالیاں سن کر وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ چیخ کر بولیں۔

"نکل جا یہاں سے، بدمعاش، الو کا پٹھا" وہ غصے سے کانپ رہی تھیں۔

رام جی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خونخوار نظروں سے ان کو گھورتا رہا۔ پھر اچانک اس نے لپک کر ان کی گردن دبوچ لی۔ لمحہ بھر جھنجھوڑنے کے بعد اس نے اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا کر ٹکرا گئیں۔ پھر اس نے دوڑ کر ان کی کمر پر سینے پر ہر جگہ کئی زوردار کی ٹھوکریں ماریں۔

رانی بوا اس قدر بدحواس ہو چکی تھیں کہ ان کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی رام جی اس وقت بہت بنا ہوا تھا۔ اس نے ان کے تمام کپڑے تار تار کر ڈالے۔

خوف زدہ ہو کر وہ تیزی سے بھاگیں کہ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیں۔ مگر گھبراہٹ میں ان کا پیر کرسی کے پائے سے ٹکرا گیا اور وہ فرش پر دھڑام سے گر پڑیں۔ رام جی خلق کی طرح سرخ سرخ آنکھیں نکالے ان کی طرف بڑھا تو وہ زور سے چیخیں۔

"ہائے مر گئی!"

ان کی آواز اتنی تیز تھی کہ منوہر اٹھ بیٹھا اور اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا

رام جی لمحہ بھر تک رانی بوا کے برہنہ جسم کے پاس کھڑا لمبی لمبی سانسیں بھرتا رہا، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بنگلے کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ سویرے ہی سویرے ترلوکی چند کے پاس گیا۔ وہ اس وقت دفتر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے رام جی کو مسکرا کر دیکھا۔

"ٹھاکر! اب تم بہت کام کے آدمی ہوتے جا رہے ہو۔"

پھر اس نے جیب سے کئی سو سو والے نوٹ نکالے اور رام جی کے سامنے پھینک کر بولا۔ "جاؤ عیش کرو۔" رام جی نے نوٹوں کو اٹھایا اور خوش خوش واپس چلا آیا۔

رقم ہاتھ آگئی تو رام جی نے خوب شراب پینا شروع کر دی۔ ابھی دو روز بعد کا ذکر ہے۔ وہ شراب پی کر نشہ میں جھوم جھوم کر گا رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ کھٹکا۔ رام جی نے سوچا ترلوکی چند نے بلوایا ہوگا۔ پھر کوئی مصیبت آئی۔ اب وہ رات کے وقت ترلوکی چند کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔

سہما ہوا سا وہ دروازے کے پاس گیا۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے سامنے رانی بوا کھڑی تھیں، وہ گھبرا کر بولا۔

"رانی جی، اتنی رات گئے تم یہاں کیسے آئیں؟"

وہ آہستہ سے بولیں۔ "تم کو لینے آئی ہوں، ابھی میرے ساتھ چلو۔"

رام جی نے سوچا ان کا زیادہ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ بنگلے کی جانب چل دیا۔

اب رانی بوا کے یہاں اس کا راتوں کا آنا جانا پھر شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی اس واقعہ کو ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ رانی بوا کا پھر اس سے جھگڑا ہو گیا۔ بات اتنی تھی کہ ایک بوتل ختم کرنے کے بعد وہ دوسری بوتل مانگ رہا تھا اور وہ دینے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ اصرار کرتا رہا وہ انکار کرتی رہیں۔ بات منہ کی گالی تک پہنچی۔ رام جی کو غصہ آ گیا۔ اس نے ان کے سر پر گلاس کھینچ مارا۔ وہ بال بال بچ گئیں۔ گلاس دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش

ہو گیا۔ مگر وہ باز نہ آیا اور اٹھ کر بے تحاشہ مارنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ۔ وہ ان کو اسی عالم میں چھوڑ کر اپنے کوارٹر پر چلا آیا۔

رام بلی نے رانی بوا کے ہاں جانا بند کر دیا۔ وہ ایک بار پھر روٹھ کر بیٹھ رہا۔ ایک دن، دو دن، کئی دن گذر گئے۔ ایک روز رات گئے دروازے پر پھر آہٹ ہوئی۔ رام بلی نے موٹی سی گالی دے کر کہا "آگئی سالی اس کی تو ــــــ!" وہ لپک کر دروازے پر گیا، وہاں ایک عورت کھڑی تھی، مگر رانی بوا نہیں تھی، اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اللہ رکھی تو کہاں سے آگئی؟"

وہ کوارٹر کے اندر آگئی۔ بولی "دروازہ بند کر دو، اندر چل کر اطمینان سے بات کروں گی" رام بلی نے دروازہ کی چٹخنی چڑھائی۔ دونوں کمرے کے اندر آگئے۔ وہ کہنے لگی "مجھ کو تو ترلوک چند کی کوٹھی میں آئے کئی دن ہو گئے ہیں، تمہارا کہیں پتہ نہیں چلتا آج۔ جانے کس طرح یہاں تک پہنچی ہوں"

رام بلی بولا" اور بڑے صاحب کی گھر والی کہاں ہے؟"

"وہ بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی ہے"

"اچھا تو یہ بات ہے"

اللہ رکھی کچھ پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ کہنے لگی "ٹھاکر، میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ یہ سیٹھ تو بڑا خراب آدمی ہے۔ حرامی نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ رات بھر شراب پیتا ہے مجھ کو بالکل ننگا کروا کے نچاتا ہے۔ اور بڑے بڑے حرامی پن کرتا ہے۔ اس وقت شراب میں دُھت ہو کر بے ہوش پڑا ہے۔ جو میں تمہارے پاس آگئی"

رام بلی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"اللہ رکھی میری مان تو یہ دھندا چھوڑ کر کسی کے گھر بیٹھ جا"

وہ جھٹ سے بولی "کس کے گھر بیٹھ جاؤں، کون مجھے بٹھائے گا"

رام بلی بولا "مجھ سے بیاہ کرلے"

وہ حیرت سے بولی" تم سے ٹھاکر! ارے واہ!! تم تو خود سیٹھ کے ملازم ہو تو

رام بلی کہنے لگا۔" نہیں اللہ رکھی، میں اس کے کاموں سے اب گھبرا گیا ہوں۔ ٹرک پر کام شروع کردوں گا۔ دونوں مزے سے رہیں گے ٹھیک ہے نا!"

اس نے پیار سے اللہ رکھی کی پیٹھ پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ اللہ رکھی جو اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سرک کر دور چلی گئی پھر فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔

" تیرے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا۔ تو ٹھہرا شراب کا رسیا۔ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے جو ٹوم جھلا بنایا ہے، اس کو بھی بیچ کر کھا جائے گا۔ نا بابا! یہ ٹھیک نہیں"

رام بلی کھسیانا ہوکر ہنسنے لگا۔" سوچ لے آگے تیری مرضی"

اللہ رکھی کہنے لگی۔" میں تو چاہتی ہوں کہ تم مجھ کو کسی طرح لکھنؤ پہنچا دو"

رام بلی جل کر بولا" اگر بڑے صاحب کو پتہ لگ گیا، تو میری تو شامت آجائے گی۔ تیرا کیا ہے، جب اس کی گھروالی آجائے گی خود ہی تجھ کو جاکر چھوڑ آئے گا۔ ہمیشہ تو تجھ کو ساتھ رکھنے سے رہا۔ جا اسی کی جوتی لات کھا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا"

اللہ رکھی بڑبڑانے لگی۔" بے مروت، خود غرض کہیں کا" اور اسی طرح بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

اس کے جانے کے بعد رام بلی بے چین سا ہوگیا۔ آخر وہ رانی بوا کی طرف چل دیا۔ لیکن اس روز ایسا اتفاق ہوا کہ جب وہ بنگلے کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے سنا احاطے کے باہر سے کارخانے کا ایک پہرے دار ٹوک کر پوچھ رہا تھا۔

" او ٹھاکر رام بلی!"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اندر چلا گیا۔ رانی بوا اس کو دیکھ کر مسکرانے لگیں وہ جیسے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

رانی بوا کے بنگلے میں، رام بلی کا راتوں کو چوری چھپے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن اب یہ بات رانی بوا کے ملازموں میں دبی دبی زبان سے پھیلنے لگی۔ اس کا چرچا بڑے صاحب

کی کرشمی کے نوکروں میں بھی چرچے لگا تھا۔ اڑتے اڑتے اس بات کی بھنک ترلوک چند کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ اس کو یقین نہ آیا مگر وہ جھنجھلایا بہت۔

رام بلی اب شراب پی کر بہت بہکنے لگا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پہ بے قابو ہو جاتا۔ رانی نُوا کو بے تحاشا مارتا۔ اکثر جھگڑا ہوتا۔ پھر وہ خود ہی جا کران کو منا لیتا۔ یا وہ آکر رات گئے چپ کر اس کو منا کرلے جاتیں۔ انہی دنوں ایک بار ایسا ہوا کہ رام بلی نشہ میں مدہوش تھا اور رانی نُوا کو بُری طرح مار رہا تھا۔ یکایک باہر گیلری میں قدموں کی آہٹ اُبھری، اور کوئی کھڑکی سے کود کر کمرے کے اندر آگیا۔ یہ ترلوک چند تھا۔ اس کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

رانی نُوا اس کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ شرم سے ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ترلوک چند نے رام بلی کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھا رام بلی پریشان ہو گیا۔ ترلوک چند غصہ میں اس کو گالیاں دینے لگا

"سور کے بچے، حرامی، کمینے"

گالیاں سن کر رام بلی تن کر کھڑا ہو گیا۔ "سرکار گالی مت بکو!"

ترلوک چند نے ڈانٹ کر کہا۔ "چپ!"

رام بلی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ زخمی بن مانس کی طرح ہاتھوں کے پنجے بھینچ کر جھومتا جھاما ترلوک چند کی طرف بڑھا۔ ترلوک چند سہم کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر اس کو ڈانٹا۔ "رام بلی!"

رام بلی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ ترلوک چند کہنے لگا "جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ!"

رام بلی چپ چاپ بنگلے سے باہر چلا گیا۔

رانی نُوا ترلوک چند کے پیروں پر گر کر گڑگڑانے لگیں۔ "ترلوک چند مجھ کو معاف کر دے میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ منہ کالا کر کے ہر دوار چلی جاؤں گی۔" ترلوک چند کا سہارا

غصہ سرد پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"ہاں جی تمہارے لئے سب سے اچھا یہی ہوگا اسی ہفتہ میں بھی یورپ جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری روانگی سے پہلے تم ہردوار چلی جاؤ" اس نے بازو پکڑ کر ان کو اپنے پیروں سے اٹھایا اور دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی، جاؤ کپڑے بدلو۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔"

یہ کہہ کر وہ بنگلہ سے نکل کر اپنی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

لیکن اس روز کے بعد رام لی کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کا کوارٹر خالی پڑا تھا کسی کو کوئی علم نہیں کہ وہ کہاں گیا۔ رانی بوا ہردوار جا چکی تھیں اور ترلوک چند جرمنی جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

اب ہولی جلنے والی تھی۔ کارخانے کے مزدور رات کو ٹولیاں بنا کر ہولی کے راگ جھوم جھوم کر گایا کرتے۔ جس روز ہولی جلائی گئی، اس روز کسی نے مزدوروں کی ٹولی میں آ کر بتایا کہ پرانے قصبہ کے کھنڈروں میں سے ایک لاش ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ رام لی ہے۔ مزدوروں میں ذرا دیر کے لئے سنسنی پھیل گئی۔

اسی رات تھانے کے باہر مرگھٹ لے جانے والے صندوق میں ایک لاش رکھی جا رہی تھی، اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ چہرہ آگ سے اس طرح جھلسا ہوا تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ یہ رام لی تھا۔ جو نا معلوم کیسے مرا اور کہاں مارا گیا۔ پولیس کی تفتیش سے بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔

ہماری مطبوعات

بچوں کا ادب

جن پر حکومت ہند نے مصنفین کو انعامات دیے

نجومی آپا — اطہر پرویز — ۱٫۲۵

مصنوعی چاند — ۱٫۵۰

ہلاکو سے ہٹلر — ۱٫۲۵

توانائی کا راز — ۱٫۲۵

ستاروں کی دنیا — ۲٫۰۰

ہمارے دیس کی ریلیں — حامد اقبال — ۱٫۰۰

ہماری مادری دنیا — نصاحت حسین — ۱٫۰۰

چند ادبی کتابیں

ادب اور زندگی (تنقید) پروفیسر مجنوں گورکھپوری ۵/-

ادب کا مطالعہ (تنقید) اطہر پرویز ۵/-

رقص بسمل (افسانے) صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲٫۷۵

دودھ اور خون (افسانے) صدیقہ بیگم ۲/۵۰

مولی اور چراغ (ڈرامے) اطہر پرویز ۲/۶۲

سرائے (ڈرامے) اطہر پرویز ۰/۶۵

پتھروں کا مغنی

(مجموعۂ کلام)

قیمت ۶/-

وحید اختر

"وحید اختر کے کلام میں گہرائی، ملاحت اور معنویت ہے ان کے نئے امکانات بیان کی تلاش ہے مگر انھوں نے عالمی کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ اکیس جوہیوں سے یہ مجموعہ ہماری شاعری میں قابل قدر اضافہ ہے"

(پروفیسر) آل احمد سرور

"وحید اختر ہمارے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو شاعری کی موروثی آبرو کا بھرپور پاس رکھتے ہوئے نئی زندگی کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں میں نے ان کے مجموعے کو پہلے سے آخری صفحے تک تامل کے ساتھ پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وحید اختر "پتھروں کا مغنی" سے لے کر "صحرا سکوت" تک یکساں طور پر کامیاب ہیں"

(پروفیسر) مجنوں گورکھپوری

چند اور کتابیں

ہماری سائنس — وزارت حسن — ۲٫۰۰

سائنس کے کرتبے — وزارت حسن — ۲٫۰۰

سائنس کی دنیا — ۲٫۶۴

بدن کی کہانی (معلومات) — اطہر پرویز — ۱٫۲۵

تیس مار خاں (بچوں کا ناول) — شاہد علی خاں — ۰٫۷۵

اکبر و بیربل کے لطیفے — ۰٫۴۰

اردو گھر ○ یونیورسٹی مارکیٹ ○ علی گڑھ

فرحت و تازگی کے لئے

ہمیشہ

اصلی "چیتا فائٹ"

مارکہ بیڑی



چھوٹی

و

بڑی

استعمال

کریں

حاجی لعل محمد بیڑی ورکس. بہادر گنج الہ آباد

چراغ تہہِ داماں

اقبال متین

شاهکار کا

ناولٹ نمبر

آپ کے ہاتھوں میں ہے

اب

احتشام حسین نمبر

کا انتظار کیجئے

شاھکار کا ہر خاص نمبر ایک ادبی
دستاویز ہوتا ہے۔ ایک ایسی دستاویز
جسے آپ شوق سے پڑھیں گے اور
احتیاط سے محفوظ رکھیں گے۔



اقبال متین

۱

وہ بجرہ جو جھیل کے شفاف سینے پر ڈول رہا ہے کوشلیا ابھی ابھی اس سے اتری ہے۔ اس نے ننھے شانوجہ کا ہاتھ تھام لیا ہے جو ابھی تک بجرے ہی میں کھڑا اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسکرا رہا تھا۔

کوشلیا کے چہرے پر پانی کے قطرے دمک رہے ہیں اور اس کی لمبی لمبی سیاہ زلفوں میں بھی پانی کی بوندیں اس طرح اٹکی ہیں جیسے موتی پرو دیئے گئے ہوں — یقیناً پانی کے یہ موتی بجرے کے ان منچلے مسافروں نے کوشلیا پر پھینکے ہیں — ننھا شانوجہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ان مردوں کے مذاق پر ہنستا رہا ہوگا جو کوشلیا سے کچھ ہی پہلے بجرے سے اترے ہیں۔

آج ننھے شانوجہ نے اتنی ضد کی ہوگی کہ کوشلیا کی وہ ممتا جاگ پڑی جسے تھپک تھپک کر وہ سلاتی رہی ہے۔

پردوے گیسٹ ہاؤز اتنی بلندی پر ہے کہ موٹے آدمی اس تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں۔ یہ گیسٹ ہاؤز اپنے پرفضا مناظر، صحت بخش آب و ہوا، چھوٹی چھوٹی اطراف میں بکھری ہوئی پہاڑیوں اور ایک گہری خوفناک کھائی کے لئے مشہور ہے۔

برمن بستی کا قریہ اس گیسٹ ہاؤز سے صرف دو ڈھائی میل ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی ساری دوکانیں برمن بستی ہی میں تھیں۔ برد ھے گیسٹ ہاوز کے چھوٹے سے احاطے سے دو فرلانگ پر فیوزک ہنین کا خوب صورت سا ریسٹورانٹ ہے جس کا نام فیوزے ہے ــــــ فیوزے میں آپ کو ہندوستانی شرابیں، دُنبے اور سور کا گوشت اور گائے کی زبان اتوار، پیر اور کبھی کبھی منگل کو بھی مل سکتے ہیں۔ آج چھ سال سے کوئی اتوار بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ یہ ساری چیزیں دور اور نزدیک سے آنے والے مسافروں اور ٹورسٹوں کو نہیں ملی ہیں۔ پیر اور منگل کی نسبت ہنین کبھی دعویٰ نہیں کرتا ــــــ وہ کہتا ہے کہ اتوار کے دن 'نہیں' کا لفظ وہ اپنی ڈکشنری سے خارج کر دیتا ہے۔

جوں جوں بردھے گیسٹ ہاؤز کی چہل پہل میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے، کوشلیا کے بدن پر نئے نئے کپڑے دکھائی دینے لگے ہیں اور سُنا ہے کہ ہنین بھی ایک چھوٹی سی سکنڈ ہینڈ وین (VAN) خریدنے کے منصوبے بنا رہا ہے کہ وہ روز نہیں تو ہر دوسرے تیسرے دن شہر سے تازہ گوشت مچھلی اور کچھ جھینگے اپنے فیوزے کے لئے لا سکے۔

کوشلیا اور فیوزے، ان دونوں کو بردھے گیسٹ ہاؤز سے الگ کر لیں تو ہم اس کے مناظر کی دل کشی اور خوب صورتی ہی کو سرے سے کھو بیٹھتے ہیں ــــــ کوشلیا تو بردھے گیسٹ ہاؤز کو آغوش میں لئے ہوئے ہر منظر کا ایک حصہ ہو کر رہ گئی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کوشلیا کا تصور ننھے شانو جبر کو ہٹا کر ممکن نہیں۔

شانو جبر پانچ چھ سال کا بڑا پیارا سا بچہ ہے ــــــ کوشلیا نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے، اپنی چھاتیاں چسوا کر اسے پروان چڑھایا ہے ــــــ اور آج بھی کوشلیا کبھی اس کے گال پر طمانچہ لگا کر اس سے کہتی ہے ــــــ تو مر نہیں جاتا۔

ہنسن نے کبھی کبھی سوچا ہے، واقعی شانوجہ مرجائے تو؟ —— پھر اس خیال پر تاسف کرتے ہوئے اس نے اپنی انگلی سے اپنے ہی سینے پر صلیب کا نشان بنالیا ہے۔ یعنی اس نے شانوجہ کی موت کی خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکا ہے اور توبہ و استغفار کا اظہار اس صلیب سے کیا ہے جو ابھی ابھی اس نے اپنے سینے پر انگلی کے اشارے سے بنائی ہے۔

ہنسن کو کبھی یہ خواہش نہیں ہے کہ شانوجہ مرجائے۔ وہ کوسلیا کے دل میں اس مردہ ماتا کو زندہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں کبھی کی مرگئی ہے۔ اس ماتا کو زندہ دیکھنے کے لئے وہ چاہتا ہے کہ شانوجہ مرجائے بھی تو مضائقہ ؟

ہنسن کہتا ہے کہ آنے والے مسافروں نے مل جل کر کوشلیا کی ماتا لوٹ لی ہے۔ نیوزک ہنسن کو کبھی کبھی یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اسے اپنے فیوزے سے جتنا پیار ہے کوشلیا کو شانوجہ سے اتنا پیار بھی نہیں ہے۔

ہنسن اپنا تقابل کوشلیا سے غلط کرتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ فیوزے اگر اس کا بچہ ہے تو بڑا کماؤ پوت ہے۔ شانوجہ کی بات الگ ہے۔ شانوجہ تو اتنا ضدی ہے کہ کوشلیا کو کسی اچھے خاصے سخی مسافر کے پہلو سے اٹھ کر اپنے اتارے ہوئے کپڑے پھر یہیں پہننے پڑتے ہیں —— اور مسافر ہنسا کر کوشلیا سے کہتا ہے۔

"پھینک کیوں نہیں دیتیں اس ردّے کو کھائی میں؟"

کہتے ہی مسافروں نے کوشلیا کو مشورہ دیا ہے کہ وہ شانوجہ کو کھائی میں پھینک دے —— وہ موقع محل دیکھ کر کبھی مسکرا کر رہ گئی ہے کبھی شانوجہ کے گال پر طمانچہ جڑ دیا ہے۔

یہ دونوں مسافر جنھوں نے تارامتی ایم بوٹ پر بجرے کو ترجیح دی تھی بردولے

گیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۲ میں آ گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں ہے ۔۔۔ یہ دونوں گیسٹ ہاؤس ہی میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ہیں۔ جب یہاں سے اتر کر گیسٹ ہاؤس پہنچے تھے اُس وقت ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہر دو گیسٹ ہاؤس کے سارے کمرے چونکہ انگیج تھے اس لئے ان دونوں نے کمرہ نمبر ۳ میں دو اجنبی لوگوں کے رہنے پر سے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

ان دونوں نے آپس میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کوشلیا کے ساتھ رہنے سے متعلق قرعہ اندازی کر لی جائے جس کا نام پہلے اُٹھے گا کوشلیا پہلے اس کی ہو گی اور دوسرا آدمی اس وقت تک شانوجہ کو سنبھالے گا اگر وہ نیند سے جاگ جائے۔

لیکن کوشلیا نے انہیں بتا دیا ہے کہ جناب یہ موا دس بجے رات سے پہلے سوئے گا نہیں کیونکہ یہ دوپہر کو بہت سو کر اُٹھا ہے اور جب تک یہ جاگتا رہے گا میں کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔

جب کوشلیا نے فیصلہ کُن انداز میں یہ بات کہہ دی تو ان دونوں نے رات یہیں گیسٹ ہاؤس میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا اور فیوزرے میں ڈنر کا آرڈر دینے کے لئے روانہ ہو گئے ۔۔۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک نے کوشلیا کو پلٹ کر دیکھا اور کوشلیا نے بھی جواب میں مسکراہٹ پھینک دی اور بڑی ادا سے شانوجہ کو بچے سے کھینچ کر گود میں بھر لیا ۔۔۔

شانوجہ ادھر کوئی چھ سات مہینے سے کوشلیا کو بہت دق کر رہا ہے ورنہ وہ پہلے اتنا ضدی نہیں تھا ایک حد تک وہ بجرے والے کاکا سے مانوس ہو چلا تھا۔ بجرے والے بوڑھے کاکا کو شانوجہ بھی کاکا پکارنے لگا ۔۔۔ بجرے والے کاکا نے بہت کوشش کی کہ شانوجہ اسے دادا پکارے لیکن شانوجہ راضی نہ ہوا۔

بجرے والا کاکا بھوس کی ایک کشادہ کٹیا میں جھیل کے کنارے رہتا ہے۔ کوشلیا بھی کاکا کے ساتھ ہی رہتی ہے اور شالوجہ بھی اسی کٹیا کا باسی ہے۔ رات تھپک تھپک کر اور بان دے دے کر کوشلیا شالوجہ کو سلا دیتی تو پھر اس کے سنورنے سجنے کا وقت شروع ہوتا ـــــ وہ دن بھر شالوجہ کو مشغول رکھتی اور سرِ شام ہی وہ سو جاتا۔ شالوجہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ دن کو ایک منٹ کو بھی اس کی پلک نہ جھپکتی اور شام ہوتے ہوتے وہ دنیا سے بے نیاز ہو جاتا۔ بھوس کے جھونپڑے میں دیے جلتے اور شالوجہ کی آنکھوں کے جگنو اپنی روشنیاں گُل کر لیتے۔ ان دنوں کوشلیا کو آنے والے مسافروں اور دوستوں کو خوش کرنے میں اتنی دیر نہ لگتی۔ شالوجہ کو پچکار کر بہلا کر اس سے جدا ہونے میں اتنے جتن اسے نہ کرنے پڑتے تھے ـــ کئی بار تو یوں بھی ہوتا کہ کوشلیا شام ہوتے ہوتے بن ٹھن کر کسی مسافر کے ساتھ بجرے یا فیروزے چلی جاتی اور شالوجہ کاکا سے کھیلتا کھیلتا سو جاتا۔ کبھی کوشلیا نہ ہوتی اور جھیل کی سیر کے لئے مسافروں کی ٹولی یا کوئی محبت کرنے والا جوڑا آنکلتا تو کاکا شالوجہ کو بھی اپنے ساتھ بجرے میں بٹھا لیتا اور وہ کاکا کی گود میں بیٹھا اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس طرح ہلاتا جیسے کاکا نہیں خود وہ چپو چلا رہا ہے۔

چٹکی ہوئی چاندنی راتوں میں جھیل کے شفاف پانی میں پیر لٹکائے ہوئے جب کوشلیا اکیلی بیٹھی چاند کا عکس پانی کی لہروں میں ٹوٹتا ہوا دیکھتی تو وہ بڑی گم سم سی رہتی۔ پیر ہلا کر جھیل میں ہلکورے پیدا کرتے کرتے وہ ایک دم بت کی طرح خاموش ہو جاتی ـــ پانی آہستہ آہستہ تھم کر آئینہ بن جاتا اور وہ اپنا چہرہ چاند کے برابر جھیل کے دل میں اُترتا ہوا دیکھ کر اُداس ہو جاتی ـــ پھر یکایک پیر ہلا کر اس سارے منظر کو بڑی بے دردی سے وہ تہس نہس کر دیتی۔

بڈھا کاکا کچھ جان کر بھوس کے جھونپڑے سے نکل آتا اور کوشلیا کو آواز دیتا تو

وہ پلو سے آنسو خشک کر کے اٹھ کھڑی ہوتی اور اگر ایسے میں کوئی مسافر بھی کاکا کے ساتھ ہوتا تو کوشلیا اسی طرح ہنستی ہوئی کاکا کی جانب بڑھتی کہ مسافر کو یہی لگتا جی میں اس پہ پیار آ جاتا۔

جبو سے ایک مس (Kuzuy Lakeul) کا مالک سین، کوشلیا کے اس رویے سے قطعی ناواقف ہے کہ چاندنی راتوں میں اس پر اداس رہنے کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ چاندنی راتوں میں کوئی مسافر بجرے میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکلتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی لڑکی یا عورت، محبوبہ یا بیوی نہیں ہوتی ہے تو کوشلیا اس مسافر کے لئے پہلے محبوبہ بن جاتی ہے پھر بیوی۔

بجرے سے اترتے ہوئے دونوں مسافر فیوزے پہنچے تو ہینسن نے لطف تعارف کرانے کا سوانگ کیا۔ ان دونوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ستر اس یہاں ملتا ہے۔ جب اندر سے میں انھوں نے قدم رکھا تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اپنے اپنے اٹیچی میں جو کچھ انھوں نے سنبھال رکھی ہے وہ دونے ناور کے کمرے نمبر ۳ میں پہنچ کر یا زیادہ سے زیادہ لان میں بیٹھ کر اسی سے لطف اٹھانا ہے۔ لیکن یہاں تو فیوزے کی سج دھج ہی اور تھی۔ خوبصورت سی کرسیاں چھوٹی چھوٹی میزیں ـــ تار اور چکریوں سے ٹنگے ہوئے سر سرلئے پردے جیسے چاہو پردہ کھینچ کر دنیا کی نظروں سے اس طرح چھپ جاؤ جیسے ای رد ں ئی زمربی سے چھپتے ہیں۔

ان میں سے ایک مسافر نے، جو گنجا تھا، اس مسافر کی طرف دیکھا جس کے سر کے سارے بال تو تھے لیکن جو عمر سے پہلے شاید سفید ہو گئے تھے حالانکہ ابھی اس کا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ کم سے کم کوشلیا نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا خون سفید نہیں ہوا ہے لیکن اس نے اپنے بال بھی لال کر رکھے تھے۔

دونوں مسافروں کو آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتا ہوا دیکھ کر میوزیم کے ہینن نے بد خوش اخلاقی اور انکساری کا ثبوت دیا۔

"آپ شاید لیک (جھیل) سے آرہے ہیں ؟" ——— اک ذرا گردن کو خم کرکے بڑی نرم مسکراہٹ سے ہینن نے پوچھا۔

"ہاں جی" ——— گنجے مسافر نے بتایا جو گنجا ہونے کے باوجود بڑا اجلا تھا۔

دوسرے نے پوچھا ——— "آپ نے کیسے جان لیا ؟"

"ان پیلے گلابوں سے ——— " ہینن نے مسکراہٹ میں وقار پیدا کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اور انھیں بتایا کہ پیلے گلاب سارے پارک اور گیسٹ ہاؤز میں کہیں نہیں لگائے گئے ہیں ——— یہ رنگ جھیل کے لئے مختص کر دیا گیا ہے ——— کوئی مسافر جھیل سے لوٹتا ہے تو یہی پھول اس کے رومالس کی چغلی کھاتے ہیں۔

دونوں مسافر ذرا سا چونک کر مسکرائے۔

"وہ کیسے ؟" ——— ایک نے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ پھول آپ کو کس نے دئے ہیں ——— اور اس ایک پھول کا دینے کو آپ نے صرف ایک آنہ دیا ہوگا لیکن اور بہت کچھ دے دینے کا ارمان دل میں لے آئے ہوں گے ——— آپ لوگ تو خیر سے اپنی محبوبہ یا بیوی کے ساتھ نہیں آئے ہیں ——— میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی دل نواز بیویوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو اپنے پیلے گلاب ان کی زلفوں میں سجا دیتے ہیں لیکن دوسری بار جب وہ آتے ہیں تو تنہا ہوتے ہیں تاکہ اس پیلے گلاب کو جی بھر کر سونگھ سکیں۔"

دونوں مسافروں نے اس طرح قہقہہ لگایا جیسے قہقہے کی نقل اُتار رہے ہوں۔

"کیوں صاحب کوشلیا نے ہی یہ پھول دیئے ہیں نا ——" ہیس نے ذرا سا قریب ہو کر اس طرح کہا کہ سامنے کھڑا ہوا ہیرا سب کچھ سن کر بھی جیسے کچھ نہ سن سکا۔

لال بالوں والے مسافر نے کہا —— "بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ — ان کو تو کوشلیا نے ہی پھول دیا ہے اور مجھے شانو جم نے۔"

"شانوجم کا زمانہ بھی آ رہا ہے جناب۔"

بینسن نے بائیں آنکھ بند کر کے گنجے مسافر کی طرف دیکھا اور پھر دونوں نے فاتحانہ طور پر لال بالوں والے کی طرف اور سب ہی ہنس پڑے۔

خوش اخلاقی کے اس مظاہرے کے بعد فیوزک ہیس نے مطلب کی بات کی۔

"فرمائیے" گردن کو خم کر کے حسب عادت اس نے پوچھا — "کیا خدمت کروں۔"

"وسکی، رم، برانڈی، بیر جو آپ کہیں۔"

"اور اگر ہم شب کے دوران میں کوشلیا سے باتیں کرنا چاہیں تو —— کیا وہ یہاں آ سکتی ہے —— ؟"

"بیشک بیشک —— کیوں نہیں آ سکتی —— فیوزے پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا کوشلیا پر لیکن آج ٹورسٹ زیادہ آئے ہیں — مہینے کا پہلا اتوار ہے نا —— اور کوشلیا ہی کی وہ شخصیت ہے جو اسٹیم بوٹ کی طرف جانے والے مسافروں کو بھی بجرے کی طرف کھینچ لیتی ہے، بہر حال یہ اس کا اور آپ کا معاملہ ہے —— آپ بلا لائیں —— فیوزے میں کوشلیا ہو یا کسی کی دھرم پتنی سب یکساں ہیں۔"

ہیس پھر ایک بار اسی انداز سے جھکا —— اس نے کہا —— "فیوزے میں ہر عورت کی تعظیم کی جاتی ہے جناب۔"

دونوں مسافروں نے ڈنر اور دس سالہ پرانی ٹھری اکس رم کا آرڈر دیا۔ اور کوشلیا کے لئے جھیل کی جانب روانہ ہوئے تو بینسن نے تعظیماً جھک کر کہا۔

"کوشلیا تو صرف گولڈن انگل بیریمیں ہے اور کبھی موڈ میں ہو تو آپ تھوڑی سی چڑیا بھی اس میں ملا سکتے ہیں اور فیوریٹ میں آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

کوئی آدھے گھنٹے بعد جب دونوں مسافر جھیل سے لوٹے تو کوشلیا اور یشانوجہ دونوں ہی ان کے ساتھ تھے۔

لال۔بوں والے مسافر نے مسکرا کر ہیمینس سے کہا —

"بڑی مشکل سے آئی ہیں کوشلیا دیوی۔"

'وہ تو میں جانتا تھا!' ہیمینس کہنے لگا Father of the lake (جھیل کا باپ) بجرا چلاتا ہے' کوشلیا Fairy of the lake (جھیل کی پری) بڈھے کاکا کے لئے اپنی مسکراہٹ پھینک کر ٹورسٹوں کو گھیر لیتی ہے — میں تو حیران ہوں کہ وہ وقت سے پہلے کس طرح آ سکیں — جھیل کے چار چھ چکر کے لئے تو ابھی کچھ اور لوگ فراہم ہو سکتے تھے' اتنا وقت تو ابھی ہے اور آج لوگ بھی زیادہ ہیں۔"

"ہم نے بجرے کی ٹرلیں رکوا دی ہیں۔" گنجے مسافر نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

'یہ اچھا کیا آپ نے — دس روپے تو دیوی جی کی پیمنٹ کرنے پڑے ہوں گے۔ — لیکن بڈھا کاکا اس عمر میں مزید محنت کرنے سے تو بچ گیا — چلئے اب آپ فراغت سے بیٹھ سکتے ہیں —" گویا ہیمینس نے مسافروں کے اس خرچ کو صحیح قرار دیا اور دونوں مسافر ایک حد تک مطمئن نظر آئے۔

"تم جانتے ہو نا ہیمینس کہ میں نے انھیں ٹھگ نہیں لیا ہے۔" کوشلیا نے مزید توضیح چاہی اور اپنی لمبی لمبی دونوں چوٹیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ننھے شانوجہ کے ہاتھ ان سے باندھنے لگی۔

"کاش کوئی مجھے اس طرح قید کرتا۔" لال بالوں والے نے کہا لیکن ہیمینس نے بولنا شروع کر دیا تھا اس لئے کوئی اور اس بات کو شاید نہ سن سکا سوائے کوشلیا

کے جو مسکرا رہی تھی۔

"ہاں جناب — ہیسن نے ذرا سا جھک کر وکالت کی — بچے کے ٹریس رکوانا چاہے تو کوشلیا دیوی سے محنت کرنے والا ہر مرد یہی کرتا ہے — آپ تو خوش قسمتی سے دو دو ہیں۔ تیر (Share) ہی تو کرلیا ہوگا"

دونوں ہنسے، کوشلیا بھی ہنسی، ہیسن بھی ہنسی میں شامل ہو گیا یہاں تک کہ بے بی بھی۔

لیکن شانو جہ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا — وہ کوشلیا کا ہاتھ چھوڑ کر اسٹیل کی فولڈنگ کرسی سے اُلجھ گیا تھا — اس نے کرسی بند کرنی چاہی جو اس سے پوری طرح بند نہ ہوئی — پھر کھولنی چاہی تو اپنی انگلی پھنسا بیٹھا — لپک کر کوشلیا نے اس کی مصیبت دور کی لیکن وہ مچل گیا تھا اور سب کو اپنے سے ہمدردی کرتا ہوا دیکھ کر بسکٹ اور پیسٹری کی طرف اشارہ کرنے لگا تھا۔

"دیتے ہیں بابا سب دیتے ہیں —" ہیسن شانو جہ سے اس طرح مخاطب تھا جیسے دونوں مسافروں سے کچھ کہہ رہا ہو۔

گنجے مسافر نے پہل کی —

"بے بی کے لئے بسکٹ، پیسٹری اور چاکلیٹ —" اور سب کے سب میز کی طرف بڑھ گئے تو بیرے نے چکریوں پر گھومتا ہوا یہ وہ کھینچ دیا جو سر سے اکھڑ جھول گیا۔

"اور بے بی کی ماں کے لئے جناب؟" — ہیسن آگے بڑھ کر ذرا سا جھک گیا۔

"تم جانتے ہو ہیسن —" کوشلیا نے یہ کہہ کر جیسے ہیسن کو جتلا دیا کہ اب وہ بھی آرڈر دینے کی اہل ہو گئی ہے جس کے لئے ان مسافروں کی منظوری ضروری نہیں۔

"جانتا ہوں کوشلیا دیوی۔"

"تم آج مجھے بار بار دیوی کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔" کوشلیا نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ برا مان رہی ہے۔

"نہیں کہوں گا۔۔۔" مبلسن جھک گیا۔

"کہہ بھی لو تو کیا ہے۔۔۔ کیا میں دیوی نہیں ہوں۔۔۔ اور جو نہیں ہوں تو بھی کیا برا ہے۔۔۔ لیکن تمہارے منہ سے یہ کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔"

مبلسن نے معافی مانگ لی۔

"جاؤ۔۔۔ کر دیتی ہوں معاف"۔۔۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

فیوزے میں لوگ آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گئے تھے۔۔۔ ایک انگریز نژاد مرد کے ساتھ ایک افریقن لڑکی تھی۔ دونوں کے رنگ روپ میں دن اور رات کا فرق تھا لیکن انگریز مرد افریقن لڑکی کو اس طرح رجھا رہا تھا کہ بیرا آرڈر پلیس کرتے وقت یہ وہ سرکا کر رک جاتا اور کھکار کر انھیں موقع دیتا کہ ان کے چسپاں ہونٹ الگ ہو جائیں۔

فیوزے کے دوسرے سارے لوگ ازخود رفتگی کے اس عالم میں نہ تھے۔۔۔ شاید اس لئے بھی کہ فیوزے میں وہ ابھی ابھی آئے تھے اور پینا شروع کئے انھیں دیر نہیں ہوئی تھی۔

ایک سردار جی اپنی سردارنی کے ساتھ دنبے کا بھونا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ سردار جی بہت ہی صحت مند اور دیدہ رو آدمی تھے لیکن سردارنی کا جسم ڈھل گیا تھا اور وہ سردار جی کی بیوی ہونے کے باوجود ان کی بڑی بہن نظر آتی تھیں۔ لیکن دو دو پیلے گلاب سردارنی نے اپنے بالوں میں سجا رکھے تھے جو یقیناً سردار جی نے اپنے ہاتھوں سے ان کے بالوں میں ٹانک دیے ہوں گے۔

اور بھی اِدھر اُدھر کچھ لوگ تھے۔ ہال میں سردارنی کے سوا کوئی عورت نہ تھی جو پہلے عام منظر پر ہو ــــ اور بقیہ لڑکی اور انگریز مرد نے پردہ کھینچ رکھا تھا۔ کوشلیا سالوتہ اور دونوں مسافر بھی پردے ہی میں تھے۔ لوگوں کی نظریں البتہ اس پردے سے بار بار ٹکرا رہی تھیں جس کے پیچھے سے کوشلیا کی بے باک ہنسی سارے ہوٹل میں گونج رہی تھی اور ہال کے لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

لال بالوں والے نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے سالوتہ کے منہ سے مسٹر یہیں لینی چاہی ــــ لیکن وہ جھٹ سے منہ میں ڈال کر ہنس پڑا ــــ

کوشلیا نے پیار سے سالوتہ کو دیکھا اور گنجے مسافر نے کوشلیا کا گلاس جس میں سر کے ساتھ جن ملی ہوئی نہیں تھی اٹھا کر کوشلیا کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

سالوتہ کی ہستی اور تمہاری ممتا کے لئے ــــ"

کوشلیا نے گلاس اپنے ہاتھ سے تھام لیا اور غٹا غٹ پی گئی ــــ گنجے مسافر نے بھی اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور لال بالوں والے نے بھی اپنے خالی گلاس کا آخری قطرہ زبان پر ٹپکا لیا۔

"بناؤ جان ــــ" لال بالوں والے نے کہا۔

کوشلیا نے دونوں گلاسوں میں رم ڈال دی ــــ "دیکھو برابر ہے نا؟"

"ہاں جان ــــ" دونوں مسافروں میں سے کسی نے کہا ــــ اور کوشلیا نے بیر کی دوسری بوتل کے لئے بیرا کو پکارا ــــــ

"اوہ ساری ــــ" دونوں مسافروں نے معافی چاہی۔

بیرا آگیا تو گنجے مسافر نے کہا ــــ" ایک بوتل بیر اور ــــ اور کھانے کے لئے تم بولو جان ــــ"

" زبان ــــ ذرا مرچ زیادہ لگانا ــــ اور بیر بہت ٹھنڈا۔ لال بالوں والے

نے اضافہ کیا ۔۔۔ اور برہیم سے بھی زیادہ ٹھنڈی ۔۔۔" کوشلیا نے کہا ۔

"اور ملا ہوا گوشت اور اُبلے ہوئے انڈے ۔۔۔" پیچھے مسافر نے مزید کہا۔

میرا جا چکا تو لال بالوں والے نے کہا ۔۔۔

" ڈارلنگ تم بہت سوبر ہو ۔۔۔ سوبر بننے سے کیا خاک ہوسکتا ۔"

" بہت کچھ ہوتا ہے ۔ تم چونکہ بہت پی رہے ہو اس لئے میں تمہاری سطح پر نظر نہیں آرہی ہوں ۔"

" مس ڈارلنگ یہ سچ کہتی ہیں ۔" گنجے نے اصرار کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ تم ہر گلاس کے ساتھ نصف پیگ جن ملا لو ۔"

" ہاں ملا لوں گی ۔۔۔ کیا بات ہے ۔۔۔ لیکن تم لوگ مجھے چوپٹ کر کے مجھ سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو ۔۔۔"

" ارے نہیں جان ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم ۔۔۔" لال بالوں والے نے بڑے چاؤ سے کہا جس کو کوشلیا اب پرڈوش ڈیمبر ([illegible]) کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھی

شانو جو بسکٹ، آملیٹ اور پیسٹری ختم کر چکا تھا اور ابھی ابھی اس نے لمبی جماہی لی تھی ۔ "نیند آرہی ہے اس کو ۔۔۔" پرڈوش ڈیمبر نے شانو جو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کوشلیا سے کہا ۔

وہ شانو جو سے مخاطب ہوئی ۔۔۔ " جائے گا کاکا کے پاس ۔۔۔ ؟ جانا راجا بیٹا ۔۔۔ میں جلد آؤں گی ۔ ان دونوں کو تھل دے کر یوں بھاگ آؤں گی ۔" کوشلیا نے چٹکی بجا کر کہا ۔۔۔ " اور ایسے راجو بیٹا سے لگ کر سو رہوں گی ۔"

بیرا نے ٹھنڈی بیر میں آدھا پیگ جن ملا دیا ۔۔۔ خالی پلیٹیں اٹھا کر بھری ہوئی پلیٹیں میز پر سجا دیں ۔

کوشلیا نے آدھ کلاس تانبے دیا اور سرے کو پکڑا — ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تڑپ کر بر دست پرنگاہ ڈالی اس کے پیچھے سے کوشلیا کی سریلی آواز آ رہی تھی۔

اور وہ کوشلیا کی آواز اس کے جسم سے کچھ زیادہ حسین تھی۔ کبھی کبھی کوشلیا کا سارا وجود ایک آواز معلوم ہوتا تھا جو پردوں سے ہاؤس ویوروے رسٹورانٹ اور تحصیل کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔

کوشلیا کی آواز پر اب کی بار سردار جی بری طرح چونکے تھے اور سردارنی نے اپنے بالوں میں پیلے گلابوں کو ٹھیک کر لیا تھا۔ اس پر بھی اس سے رہا نہ گیا تو اس نے سردار جی سے کہا۔

"یہ آواز اسی لڑکی کی معلوم ہوتی ہے جس نے تحصیل پر پھول دیے تھے اور تم نے پھول لینے کے بہانے اسے تاکا تھا — اور اس کا بچہ کتنا پیارا سا ہے — وہ تو تو ہر دالی کوئی شریف عورت ہوتی نا؟"

سردارنی نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دیں تو سردار جی سوچنے لگے کہ اب انہیں بھی تو کچھ کہنا ہے۔

انھوں نے کہا۔

"واہ گرو واہ گرو — میں بھی لوگ بچے ہی کو دیکھ رہا تھا کیسر — اپنا بھی کوئی ہوتا ہوتا۔" سردار جی نے ٹھنڈی آہ بھری جو سردارنی کے سامنے دھری ہوئی گرم پلیٹ سے ٹکرا کر گرم ہو گئی۔ لیکن سردارنی واقعی کچھ کر رہ گئی تھی۔

سردار جی پر جب کبھی کوئی کڑا وقت آتا تو وہ سردارنی کی توجہ پھیرنے کے لیے اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھا لیتے کہ سردارنی بانجھ ہے — سردارنی کا لٹکا ہوا جسم کچھ اور ڈھیلا پڑ جاتا اور وہ تو یہ سامنے دھرا ہوتا تب چاپ کھا لیتی —

سردار جی ایسے میں گنگناتے اور لوگ ناکس پر ایا بیسدہ وہ گیت سننے میں مگن ہو جاتے۔

پردے کے پیچھے شانوجہ نے پھر جا ہی لی۔ اب تو اس کی آنکھیں مدہوش لگی تھیں۔

"جانے کا مت میرا۔" کوشلیا اس کو پچکارنے لگی۔

"نہیں جاؤں گا۔ تم سو ہوں گی تو ڈر لگے گا مجھے۔" ساوجہ لیٹا ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ میز کی سطح پر رکھے ہاتھوں پر سر ٹکائے سونے کو مناسب بنا دینے کے لئے کوشاں تھا۔

رڈش ڈریٹ گال تھپتھپاتے ہوئے شانوجہ سے کہا۔ کل ہم بابا کو بہت سے چاکلیٹ دلائیں گے۔ چلو تمہیں کاکے پاس چھوڑ دوں۔"

شانوجہ بگڑا۔ "نہیں۔" اس نے رخ کر کہا

اور کوشلیا نے بھانپ لیا کہ اب زیادہ اصرار کرنے پر شانوجہ برہم ہو جائے گا۔ وہ جانتی تھی کہ شانوجہ کی برہمی کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ وہ ضد اور ہٹھ میں سے ہرا مالو پھر کسی کی اس کے آگے نہ چلتی تھی۔ چنانچہ کوشلیا نے رڈش ڈریہ کو اشارہ کیا کہ وہ شانوجہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

کوشلیا کی آنکھوں میں پیار اور رس کا جس قدر نشہ تھا اس سے کہیں زیادہ شانوجہ نیند کے نشے میں چور تھا اور اسی لئے کوشلیا چاہتی تھی کہ اب شانوجہ اطمینان سے سو جائے۔

"ڈیر بالڈ۔ پی لیا کرنا۔" کوشلیا نے انگڑائی لے کر اپنے جوبن کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے نام عمدہ دیتی ہو۔" رڈش ڈریہ نے کوشلیا کی تعریف کی اور اس کا ہاتھ چوما۔

"تمہیں کیوں نہ پیارے لال کہوں۔ یہ زیادہ اچھا رہے گا۔"

"خوب خوب۔ نام بھی دیتی ہو، مرحمت بھی کر دیتی ہو۔"

"ارے ہاں۔" ڈیر بالڈ اپنی کرسی سے قریب قریب اچھل پڑا۔ شانوجہ

ہی سے قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں"

"ہاں یار دیکھیں وہ ایسی ماں کا بس کس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے — کاغذ چاہئے — چٹ لکھیں — ورنہ دیر ہو جائے گی — قرعہ اندازی کا نیک کام اسی کے ہاتھ سے ہو جانا چاہئے۔ پیارے لال کہہ رہا تھا اور اس کا چہرہ بادلوں کی سرخی کا عکس معلوم ہو رہا تھا۔

"بیرا — بیرا — بیرا —" ڈیرہ بالڈ نے مسلسل پکارا اور پیارے لال نے ساتھ ہی گھنٹی بجا دی۔

کاؤنٹر پر ہینس چونکا۔ کیا بات ہو گئی آخر — وہ یوں بھی چاہتا تھا کہ اس کیبن کا ایک آدھ چکر لگا آئے تاکہ کوشلیا سے کچھ بیتے وقت رکھی ہو اور اس کے ساتھ ہی خوش ہو جائیں کہ فیروزے کا مالک ان کی طرف اتنی توجہ کر رہا ہے — سیا یہ وہ کیبن ([illegible]) کی طرف چل پڑا۔

ہینس کو دیکھ کر کوشلیا نے کچھ برا سا منہ بنایا — پیارے لال اور ڈیرہ بالڈ کو بھی اس وقت اس کا چلا آنا کچھ ناگوار گزرا لیکن ہینس نے جھک کر بڑے ادب سے مسکرا کر مسلسل پکار اور گھنٹی کی آوازیں وہ خود چلا آیا ہے کہ کوئی بات انھیں ناگوار ہوئی ہو تو جان سکے۔

"تھوڑا سا کاغذ بھجوا دیجئے —" ڈیرہ بالڈ نے ہینس کو ٹال دینے کے لئے کہا۔

"بہت اچھا۔ اور آپ کہیں تو ایک اور کرسی بھجوا دوں تاکہ دونوں کو ملا کر اس ننھے بیچارے کو سلا سکیں —" ہینس نے شانو جہ سے ہمدردی کی۔

کوشلیا کو ہینس کی اس ہمدردی میں اپنے لئے طنز اور تضحیک کا پہلو نظر آیا اور اس نے تنک کر کہا — "میں اس کی ماں ہوں ہینس۔"

"ہاں میں جانتا ہوں لیکن اس واقعے کے بعد تو تمہیں شانو جہ کی بہت حفاظت کرنی چاہئے۔"

کوشلیا نے ہینسن کو گھائل ہرنی کی طرح تڑپ کر دیکھا۔ "ہاں اس کا اچھا بُرا میں جانتی ہوں، شکریہ۔"

ہینسن جان گیا تھا کہ کوشلیا پر بھرپور وار اس نے کیا ہے۔۔ اب مزید کچھ کہنے کی اس نے جرأت نہیں کی۔ اس لئے کہ کوشلیا کا اگر موڈ خراب ہو جاتا تو وہ ایسے ہی پہلے خاموش ہو جاتی پھر رونے لگتی اور اچھی خاصی محفل یوں تہس نہس ہو جاتی۔ محفل کی اس طرح یکایک برخواستگی کے معنی یوں بھی تو ہوتے کہ کچھ اور مال جو کھسک سکتا تھا وہ کھسکنے سے رہ جاتا۔ چنانچہ وہ چپکے سے کاؤنٹر پر لوٹ آیا۔

بیرا کاغذ لے آیا تو کوشلیا کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

پیارے لال نے کاغذ پر دو نام لکھے۔۔۔ انھیں رابر بھاڑ کر جوڑنے لگا۔

کوشلیا اپنی انگلیاں شانو جے کے بالوں میں بڑے پیار سے کنگھی کی طرح کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شانو جے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کیبن میں بیٹھی ہوئی کیبن (Cabin) سے باہر کہیں دور چلی گئی تھی۔

ڈیربالڈ نے جس پر رم نے اب اچھی طرح اثر کر لیا تھا کوشلیا کی کمر میں گدگدا کر اسے مخاطب کیا۔

پیارے لال ہتھیلیاں ٹیبل پر ڈال کر شانو جے کو بیدار کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل مندھ گئی تھیں اور وہ آسانی سے بیدار نہ ہوتا تھا

"اس کو سو جانے دو۔۔" کوشلیا نے پیارے لال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔۔ "اس کو یوں کانٹوں میں گھسیٹا جائے یہی کیا کم ہے کہ اس نے مجھ جیسی ماں سے جنم لیا ہے۔"

"تم سوبر ہو رہی ڈارلنگ۔۔" ڈیربالڈ نے پھر اس کو گدگدایا

کوشلیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جا سکتی تھی بشرطیکہ ان کی آنکھوں سے

نظریں پھیر لی جائیں۔

اور دونوں ساغروں نے درد مسکراہٹ ہی دیکھی۔

"میں خوش ہوتی ہوں تم دونوں میں سے کسی کو۔" کوشلیا نے انگڑائی کے بھنور میں مسکراہٹ کی کرنیں پھینک کر سب کچھ بھلا دیا اور اس طرح پھر اس محفل میں لوٹ آئی جیسے فرض کی ادائیگی نے اس کی بانہہ پکڑ کر اس کو محفل میں ڈھکیل دیا ہو۔

ڈیر بالڈ اور پیارے لال اپنی اپنی نشستوں پر سیدھے ہو گئے۔

"جانم — رحم کی طلب گار ہوں —" ڈیر بالڈ نے کوشلیا کے جھک کر قدم چھوئے

"یوں نہ کرو —" اس نے اپنے پیر ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے حق میں ایک فیصلہ کئے دیتی ہوں۔"

"بیچ نخ یوں نہ کر دینا —" پیارے لال نے التجا کی۔ "ورنہ میں جھیل میں ڈوب مروں گا۔"

کوشلیا مسکرائی — "کون کسی کے لئے جھیل میں ڈوبتا ہے بابا —" بالکل یہی بات چھ سات سال پہلے مجھ سے کسی نے کی تھی — پھر وہ آج تک نہیں لوٹا —— اور میں اکیلی جھیل میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کے لئے رہ گئی ہوں —" یہ کہتے کہتے کوشلیا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں لیکن وہ برابر مسکرائے جا رہی تھی۔

پیارے لال نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے "تم جذباتی ہو گئی ہو — مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہئے — معاف کر دو ڈارلنگ"

کوشلیا نے مسکراہٹ کو قہقہے میں اس طرح بدل دیا جیسے یہ سب کچھ اس کے بس میں ہے۔

"تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو —" کوشلیا نے ایک ادائے دلبری سے کہا۔ "میرے آنسو اور میرے قہقہے توام بچوں کی طرح ہیں — دونوں اتنے ملتے ہیں کہ

انھیں پہچاننا مشکل ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں قہقہے مار کر ہنستی ہوں رو رہی ہوتی ہوں اور جب آنسو چھپانی ہوں تو گویا مسکراہٹ چھپاتی ہوں — اب بتاؤ ڈبرکیا تم میری ان اوٹ پٹانگ باتوں کو مان لوگے ؟ — تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔"

ڈیر بالڈ نے خالی گلاس خود ہی بھر دیے۔

کوشلیا اب چہکنے کے موڈ میں آگئی تھی — شانو جو آرام سے سو رہا تھا —

پیارے لال کوشلیا کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ بہت متاثر ہے — ڈیر بالڈ کی بس یہی خواہش تھی کہ کوشلیا جلد از جلد قرعہ فال اس کے نام اٹھا دے۔

چنانچہ بھرے ہوئے گلاس ہر ایک کے سامنے رکھتے ہوئے ڈیر بالڈ نے کہا۔

"جام اٹھاؤ — اس لمحے کے نام جو اب مقدر بننے والا ہے"

سب نے تھوڑی تھوڑی سب کی۔

پیارے لال نے یاد دلایا کہ کوشلیا کچھ کہہ رہی تھی۔

لیکن ڈیر بالڈ اب کچھ اور سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ صاف صاف کہہ رہا تھا کہ کوشلیا پہلے قسمت کا فیصلہ کر دے پھر اطمینان سے باتیں کرتی رہے۔

" تو تیار ہو جاؤ —" کوشلیا نے بھرپور انگڑائی لے کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

دونوں مسافر جو اب کوشلیا کے گہرے دوست ہو گئے تھے ایک دم اس طرح اپنی اپنی نشستوں پر سیدھے ہو گئے جیسے اپنے بوجھل ذہن سے نشہ کی کیفیت کو زائل کر چکے ہوں۔

کوشلیا نے ایک ادائے دلبری سے ہاتھ بڑھایا اور ایک چٹھی اٹھا کر پلک جھپکنے میں کھول دی۔

" ڈیر بالڈ — لو میں تمہاری ہو گئی ہوں "

ڈیرمالڈ اپنی کرسی پر سے اچھل پڑا — وہ کھڑا ہو گیا — پھر وہ کوشلیا پر جھکا — پھر کوشلیا نے اپنے ہونٹ ڈیر بالڈ کے ہونٹوں میں دے دئے۔

پیارے لال مسکراتا رہا — اس کی نظریں اس انتشار میں بار بار شانو جہ پر پڑتی رہیں اور شانو جہ بے خبر سوتا رہا۔

کوشلیا نے ایک ادائے دلبری سے ڈیر بالڈ کو دونوں ہاتھوں سے کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا — "چلو اب مٹھو بھی — بہت بے صبرے ہو۔"

پیارے لال سے کوشلیا اور ڈیر بالڈ نے سوری (Sorry) کہہ کر معافی مانگ لی۔

"کوئی بات نہیں —" پیارے لال نے اس طرح کہا جیسے اتفاقاً کہہ رہا ہو۔

کوشلیا نے چھیڑا — "تم تو جھیل میں ڈوبنے والے تھے نا ڈیر۔"

"لیکن ہم اب کچھ گھنٹوں کے بعد میری بھی تو ہو جاؤ گی — جھیل میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے تم سے محروم ہونا مجھے گوارا نہیں۔"

کوشلیا نے قہقہہ لگا کر ڈیر مالڈ سے مصافحہ کیا۔ اور تینوں ہنس پڑے۔

ہال میں اکثر نظریں اس پردے کی طرف اٹھیں جس کے پیچھے سے قہقہے کا چھناکا باہر تک آکر بکھر گیا تھا۔ لیکن سردارنی اپنی زلفوں میں گلاب کے پیلے پھول درست کرنے کے لئے اپنی نشست پر موجود نہ تھی اور نہ سردار جی تڑپ کر اس طرف دیکھنے کے لئے وہاں تھے۔

انگریز نژاد لوہرسٹ بھی اپنی افریقن محبوبہ کے ساتھ جا چکا تھا اور اس پارٹیشن کا پردہ سمٹ کر ایک گوشے میں اس طرح جھول رہا تھا جیسے ان کے رومانس کی کہانی اپنی سلوٹوں میں چھپائے ہوئے ہو۔

ہال میں لوگ کم رہ گئے تھے اور ان کے آخری جام ان کے ہونٹوں کے

منتظر تھے۔

ہینسن کو ذرا سی فرصت مل گئی تھی اور وہ کاؤنٹر سے لگی اونچی سی کرسی پر ایک ذرا ٹیک لگائے کمر سیدھی کر رہا تھا۔

پردے کے پیچھے ڈیر بالڈ سب سے زیادہ مضطرب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد فیونسے کو چھوڑ دے اور بردو لے گیسٹ ہاؤز کے کمرے نمبر ۳ میں اس کے بستر اور پیارے لال کے بستر کے درمیان وہ دبیز سا نیلا پردہ کھینچ کر تن جائے جو دیوار سے لگا کونے میں جھول رہا تھا۔

ڈیر بالڈ نے ایک تجویز رکھی — "تم چاہو تو آج رات بالکل دست بردار ہو سکتے ہو۔ کل صبح میں چلا جاؤں گا۔ تم رک سکو تو رک جاؤ — آج کے سارے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ فیونسے کے بل میں بھی میں تم سے کچھ نہیں لوں گا" اس نے پیارے لال کے کندھے پر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ رکھا جو اپنے لال بالوں کو اپنی سفید انگلیوں سے سلجھا رہا تھا — "کیا ہم دوست ہو کر ایک دوسرے کے لئے اتنا تحمل کر سکتے ہیں؟"

پیارے لال کچھ دیر سوچتا رہا — پھر اس نے بڑے وقار اور تمکنت سے کہا۔

"مجھے منظور ہے — ایک رات میں کسی عورت کا ایک سے زیادہ مردوں کے پاس رہنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا — ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بالکل جانور ہو گئے ہیں اور پھر تمہارا جھوٹا تمہاری ہی جھوٹی پلیٹ میں مجھے کچھ گوارا بھی نہیں ہے — جھوٹا تو ویسے تم بھی کھا رہے ہو، میں بھی کھاؤں گا لیکن یہ احساس تو رہے گا کہ پلیٹ بھی جھوٹی ہے — رات کی تاریکی کے بعد دن کا اجالا عورت کو اتنا ستھرا کر دیتا ہے کہ وہ آنے والی رات کی سیاہی کو پھر اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے بڑی پرکشش اور خوب صورت ہو جاتی ہے ورنہ یوں لگتا ہے جیسے ہم دلدل میں چل رہے ہیں۔"

ڈیر بالڈ اتنا لمبا چوڑا لکچر سننے کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی

سے پیارے لال کا ہاتھ دبایا ــ "شکریہ میرے فلسفی دوست میں خوش ہوں ــ" اور اس نے کھڑے ہوکر اپنے دوسرے ہاتھ سے بیئر کا گلاس اٹھایا اور جھک کر کوشلیا کے منہ سے لگا دیا ۔ ۔ یہ سب ہی کھڑے ہو گئے ۔

ڈیر بالڈ نے ستانوجہ کو اٹھاکر اپنے کاندھے پر سلا لیا ــ کوشلیا اس کے ساتھ ایسی لگی لگی چل رہی تھی کہ دیکھنے والوں کو تینوں باپ، ماں اور بچہ نظر آ رہے تھے ۔ کوشلیا کے چہرے پر اس وقت ایک ایسی خواہش اور تمنا کی پرچھائیں تھی جو حسرت بن گئی تھی لیکن پہچانی نہیں جاتی تھی ــ وہ ڈیر بالڈ سے کچھ اس ادا سے بات کر رہی تھی جیسے بیوی اپنے میاں سے اس وقت بات کرتی ہے جب وہ ان کا بچہ اٹھائے چل رہا ہو اور دل ہی دل میں ماں کے "ڈیپارپر برہم ہو جو اسے ساتھ سا تھ لئے پھرتی ہے گھر پر چھوڑ کر نہیں نکلتی ۔

کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو پیارے لال نے مسکرا کر کوشلیا کو چھیڑا ۔

"آپ شاید میرے دوست کی مسز ہیں ؟"

کوشلیا نے اس طنز کو بھانپ لیا ۔

"اگر ہوتی تو شاید تم کو بڑا دکھ ہوتا ۔"

"ہو تو سکتا تھا ــ اس لئے کہ کل تم میرے ساتھ بھی اسی طرح قدم سے قدم ملا کر چلنے والی ہو ۔"

"میں تو آج بھی چلنے کو تیار ہوں لیکن تم مجھے کتنی دور لے جا سکتے ہو ــــ یہی نا فیوزے سے بردولے تک اور اس کے بعد تم مردوں کے پیر ڈگمگا جاتے ہیں ۔"

پیارے لال چاہتا تو مسکرا بھی سکتا تھا، اس نے سنجیدگی کا لحاف اوڑھے رکھا ہینسن نے بل کی رقم لینے کے بعد جھک کر ڈیر بالڈ اور کوشلیا کا شکریہ ادا کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ کوشلیا کی رفاقت میں ڈیر بالڈ کی رات یادگار ہو جائے گی ۔

حس کا وہ متمنی ہے۔

"گڈ نائٹ۔۔۔ گڈ نائٹ"جب وہ لوگ جدا ہوئے تو پیارے لال پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔۔۔ وہ فیوزے کے احاطے سے گزر کر اس سڑک پر آگیا تھا جو بردوے کو جاتی تھی۔۔۔ رات نہ اتنی تاریک تھی نہ اتنی اُجلی۔۔۔ سڑک کی روشنیوں سے ہٹتے پر بھی صورتیں بہ آسانی پہچانی جاتی تھیں۔۔۔ ہواؤں میں خنکی تھی، تارے اس طرح آپس میں اشارے کر رہے تھے جیسے زمین کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں لیکن زمین اپنی جگہ مطمئن تھی گویا ستاروں کی بے بضاعتی کو جانتی ہو۔

پیارے لال سیدھی سڑک پر کھڑا وہاں تک دیکھ رہا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ میں سڑک بردوے کی طرف اس طرح مڑ گئی تھی جیسے چھپ کر جا رہی ہو۔

فیوزے کے احاطے میں پہنچ کر کوشلیا نے خنکی محسوس کی تو اس نے ڈیر بالڈ سے کہا۔۔۔"شانو کو کچھ اُڑھا لینا چاہئے لیکن یہاں کیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس کو مجھے دے دو۔۔۔ میں اپنا آنچل اڑھا لوں گی۔"

"میں اپنا کوٹ بھی تو اُڑھا سکتا ہوں۔۔۔"اس نے شانو جہ کو کوشلیا کی گود میں دے کر اپنے کوٹ کے اندرونی جیب سے کچھ نوٹ اور کاغذ نکالے اور اپنی شرٹ کی جیب میں محفوظ کر کے کوٹ اُتارنے لگا اور ساتھ ہی دوسری جیب کی زپ کو چھو کر اس نے دیکھا کہ زپ برابر ہے۔ کوشلیا نے شانو جہ کو پھر اس کی گود میں واپس دے کر کوٹ اڑھا دیا۔۔۔ پھر ایسی نظروں سے اس کو دیکھا جیسے پیار کر رہی ہو۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں پیارے۔۔۔"کوشلیا نے اس طرح پوچھا کہ اس ایک جملے سے جیسے شانو جہ پر ڈیر بالڈ کی مہربانی کا اعتراف کر رہی ہو۔

"تمہیں بتاؤ کتنے ہو سکتے ہیں۔۔۔" ڈیر بالڈ نے کوشلیا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کو اپنے سے قریب تر کرتے ہوئے پوچھا۔

" بھلا میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تم یقیناً ایک اچھے شوہر ہوگے اور ایک اچھے باپ بھی ۔۔۔"

" میں بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں لیکن میری بیوی اور میری بچی کوئی دو سال سے مجھ سے جدا ہیں۔ میری آمدنی سے ان کی گزر بسر کے لئے ایک حصہ کٹ جاتا ہے۔ میں اس کے علاوہ بھی انہیں بھیجتا ہوں۔۔ بچی ہائی اسکول میں پڑھتی ہے اور بیوی ایک خانگی کالج میں پڑھاتی ہے۔"

" اتنی پڑھی لکھی ہے تمہاری بیوی ؟"

" پڑھا لکھا تو اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔ سب جاہل ہیں اور سب ایک دوسرے پر فوقیت جتاتے ہیں۔"

" تمہیں وہ یاد نہیں آتے ؟"

" آتے ہیں۔۔ بیتے ہوئے دنوں سے چمٹا ہوا رہ کر آدمی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ سب کچھ بھول جانے میں عافیت ہے۔ ہم ہر یاد کا گلا گھونٹ کر تازہ دم ہو جاتے ہیں اور زندگی کی دلہن سے بار بار بیاہ کرتے ہیں۔"

" لیکن کیا ایسا کرکے تم مطمئن ہو جاتے ہو ؟"

" یقیناً ہو جاتا ہوں۔۔۔ تم نے دیکھا نہیں میں ابھی ابھی کچھ ہی دیر پہلے بالکل مطمئن تھا۔۔۔ فیوزے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ باہر کی خنکی اور تمہارا ساتھ میرے نشے کو اوپر اٹھائیں گے لیکن تم نے بے وقت کی بانسری چھیڑ دی۔ اس سے اتنا تو ہو ہی گیا کہ میں نے تمہاری باتوں کا سنجیدگی سے جواب دے دیا۔ اور یہ سنجیدگی میرے نہ چاہنے کے باوجود تم نے مجھ پر مسلط کر دی۔ حالانکہ میں نے فیوزے میں اس بات کو کئی بار محسوس کیا تھا کہ تم بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتی ہو۔۔۔ پھر کسی معمولی بات پر اس طرح قہقہہ لگاتی ہو جیسے کھل کر ہنسنا تمہاری فطرت ہے۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے ــــ اس کے باوجود میں نے تمہیں ماضی کے ریگستانوں میں بھٹکنے نہیں دیا ہے اور کھینچ کھینچ کر فیروزے میں لے آیا ہوں ۔ اگر میں تم سے پوچھ بیٹھتا کہ شانو جہ کا باپ کہاں ہے اور اس کے بعد تم سے پھر کچھ نہ پوچھتا تو بھی تمہیں رات بھر رُلانے کے لئے کافی تھا۔ میں نے تمہارے پیارے لال کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ شانو جہ سے متعلق کوئی سوال نہ کرے ــــ اس لئے کہ کسی عورت سے اس کے بچے سے متعلق جب کہ اس کے شوہر سے ہم متعارف نہیں ہوں کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔ یہ شرافت کا تقاضہ بھی ہے اور اس عہد کے سچے عشق کا تقاضہ بھی لیکن جب وہ جھیل پہ تم سے پہلی بار ملا تھا اس وقت سے وہ جاننا چاہتا تھا کہ شانو جہ کا باپ کہاں ہے۔ یہ کون ہے ــــ اس نے تمہارے متعلق بہت سن رکھا ہے۔ کہتا تھا تم انٹرنس پاس ہو۔ کالج کی زندگی سے ایک ہی جست میں تم نے فیروزے اور بربر دلے کے فاصلے کر لئے ہیں ــــ میں نے اس کو جھاڑ دیا تھا ــــ ڈر تھا کہ میری آج کی رات تمہارے جذبات کے ہاتھوں ماری نہ جائے۔ اس لئے کہ جب عورت روتی ہے تو اس کے آنسو مرد کی جنسی آگ پر پانی کا نہیں تیل کا کام کرتے ہیں اور وہ آگ جو تیل ڈالنے سے بھڑک جاتی ہے جلد بجھ جاتی ہے اور مجھے تو اپنے لگائے ہوئے پیسے کی قیمت زیادہ سے زیادہ اس ایک رات ہی میں تم سے وصول کر لینی تھی۔"

"اب بھی کیا گیا ہے، وہ تو تم وصول کر سکتے ہو ــــ" کوشلیا نے برا مانتے ہوئے وار کیا۔

"سگریٹ ہیں تمہارے پاس ــــ؟" پیارے لال نے ڈیرہ بالڈ سے پوچھا جو لوٹ کر فیروزے کے احاطے کی بیرونی دیوار سے لگا شاید پیشاب کر رہا تھا ــــ جب وہ ڈیرہ بالڈ کی طرف بڑھا تو اس کو ڈیرہ بالڈ نے اپنی پتلون کا آخری بٹن لگاتے دیکھا ــــ جب وہ قریب آگیا تو ڈیرہ بالڈ نے کوشلیا سے کہا کہ وہ اس کی

پتلون کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر پیارے لال کو پیش کرے۔
کوشلیا نے اپنا ہاتھ اس کی پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے لمحہ بھر کو کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے وہ یقیناً ڈیر بالڈ کی خوب صورت بیوی ہے جس کو وہ بہت چاہتا ہے اور شانو جہ ——— شانو جہ ——— کوشلیا کا جی چاہا کہ بھاگ کر کہیں چلا جائے ——— اور ڈیر بالڈ تو اتنے کہنے لگے تو پیچ پیچ کر ساری دنیا کو بتلائے کہ وہ ڈیر بالڈ کو جانتی ہے نہ شانو جہ کو ——— شانو جہ میرا بچہ نہیں ہے ——— میں تو وہ عورت ہوں ——— وہ عورت ہوں، جسے لوگ چھیل کی پری کہتے ہیں اور کوئی بھی ایک معقول معاوضے پر مجھے اپنے ساتھ ——— اپنے ساتھ۔

"کہاں پہنچ گئی ہو ——" ڈیر بالڈ نے اس کو گدگدیا ——— "دیکھتی نہیں ہو پیارے لال سگریٹ کیس لوٹا رہا ہے۔"

وہ چونکی، سگریٹ کیس لے کر اس نے ڈیر بالڈ کی جیب میں جلدی سے اس طرح رکھ دیا کہ دیر ہونے پر جیسے اس کا ہاتھ جھلس جائے گا۔

پیارے لال نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کے دائرے پھینکتے ہوئے ظاہر کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے۔ حالانکہ وہ ضرور کچھ سوچ رہا تھا ——— یکایک اس نے کہا ——— "میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ رات کو رات ٹھہر لوٹ جاؤں' ایک فرنٹ جانے والا ہے، ایک آدمی کی جگہ بھی ہے لیکن اس کو نکلنے میں ابھی دو گھنٹے ہیں۔ یہ دو گھنٹے جوں توں کر کے میں یہ دورے میں کہیں گزار لوں گا۔"

"تمہیں یکایک یہ سب کچھ کیا سوجھی ہے ———" ڈیر بالڈ نے پیارے لال کے کندھے پر اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھا ——— "کوشلیا کی رات بھر کی جدائی شاید تمہیں گوارہ نہیں یا پھر میری رفاقت کھل رہی ہے۔ گویا تم اچھے رقیب بننے کے اہل نہیں ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے —" پیارے لال نے بڑی رکھائی سے کہا اور سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر دھواں ہوا میں پھینک دیا۔

"اچھا چلو آج رات کوشلیا کو میں تمہیں دیئے دیتا ہوں — اب کو کیا کہتے ہو"

"نہیں جی، یہ تو سراسر ظلم ہوگا —" پیارے لال نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں یہ شرط مجھے قبول ہے۔

لیکن کوشلیا کے سینے میں ایک برچھی سی لگی — اس نے کلیجہ اس طرح تھام لیا جیسے سینے میں پیوست برچھی کو سنبھال رکھا ہو — کوندے [illegible] ذہن میں لپک گئے — تم نے ساویتری کو اٹھا کر کس چاؤ سے اپنے لیے رکھ لیا — تم نے اپنا کوٹ اتار کر کس پیار سے اس کو اڑھا لیا — تم نے اپنی جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور میں اپنے اطراف خوابوں کا ایک جال بُن کر اس میں جا الجھی — ایک رات صرف ایک رات میں اس جال میں رہنا چاہتی ہوں جو میں نے بُن لیا ہے — اور تم — تم مجھے پیارے لال کے پاس تحفے پیش کر رہے ہو — گویا تم مجھے خرید بھی سکتے ہو اور جب چاہو کسی اور کے ہاتھ میں پھینک بھی سکتے ہو — یہ حق تمہیں کس نے دے دیا ہے — کس نے دیا ہے۔ ذہن میں کوندوں کی لپک ختم ہوئی تو کوشلیا نے جیسے ہوش میں آ کر [illegible] کو دیکھا — اور بم کی طرح پھٹ پڑی

"تم کون ہوتے ہو مجھے دوسروں کے پاس پیش کرنے والے — میں کسی کا کھلونا نہیں ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں، جس کے ساتھ چاہے ہو سکتی ہوں جس کے ساتھ چاہے نہیں — تم کوئی پیشہ ور دلال معلوم ہوتے ہو"

کوشلیا بڑھی — اس نے شانو کو ڈر یا للہ کی گود سے چھین لینا چاہا لیکن ڈیڈی باندے نے شانو کو جھپٹ کر رکھا اور ایک لفظ کہے بغیر سڑک پر بڑھ [illegible] کی جانب

چل پڑا۔

تینوں نے راستے میں کوئی بات نہیں کی ــــ بر دوسے گیسٹ ہاؤز کے قریب پہنچے تو کوشلیا نے علانیہ محسوس کیا کہ ڈیربالڈ ہانپ رہا ہے ــــ شاید بچہ کو اٹھا کر اتنی چڑھائی چڑھنے میں وہ یقیناً تھک گیا ہوگا۔ کوشلیا نے اپنے اطراف پھر جال سا بُننا شروع کر دیا ــــ اس کا جی چاہا کہ ڈیربالڈ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کے گنجے سر کو سہلائے اور اس سے کہے کہ سو جاؤ تم تھک گئے ہو۔

فیوزے سے بر دوسے گیسٹ ہاؤز کا راستہ طے کرتے وقت وہ ڈیربالڈ اور پیارے لال سے ہٹ کر الگ الگ چلتی رہی ــــ یہاں تک کہ جب وہ درختوں کے اس جھنڈ کے قریب پہنچے تھے تو اسے رات زیادہ سیاہ اور مہیب نظر آ رہی تھی کیونکہ سڑک پر بجلی کے کھمبے کا بلب ٹوٹ گیا تھا اور اندھیرے بڑے گمبھیر ہو گئے تھے۔ گھنے درختوں کے نیچے سڑک بالکل چھپ گئی تھی اور اوپر نگاہ اٹھانے سے آسمان پر تاروں کی کھیتی بالکل نظر ہی نہ آتی تھی۔ رات کو جب کبھی کسی مسافر کے ساتھ کوشلیا اس راستے سے گزرتی تھی تو اپنے ساتھی کے بالکل قریب ہو جاتی خواہ راستے کا بلب جل رہا ہوتا اور وہ موٹر ہی میں کیوں نہ ہوتے ــــ ان درختوں میں اس کو کھائی کی اس دوشیزہ کی روح اپنے محبوب کے انتظار میں بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جس کی کہانیاں خوفناک کھائی سے وابستہ ہیں اور بر دوسے سے فیوزے تک جن کا چرچا ہے۔

ایک دولھا اپنی نئی نویلی دلہن کو سیول میرج کر کے ہنی مون کے لئے بر دوسے ہاؤز لے آیا تھا۔ لڑکی اپنے میکے سے جتنا بن پڑا روپیہ اور زیور لے کر بھاگ آئی تھی۔ دس دن ساتھ رہنے کے بعد لڑکا زیور اور نقدی لے کر فرار ہو گیا۔ لڑکی کے پاس ہاتھ میں صرف ایک انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی بیچ کر نمین روز تک وہ اپنے محبوب کے انتظار

میں گزر بسر کرتی رہی۔ کوئی کہتا ہے کہ پانچ دن اس نے انتظار کیا ۔۔۔ آنجہانی ٹھاکر بلرام سنگھ جو برد ولے کا صدر چوکیدار تھا کہتا تھا کہ وہ بڑی پوتر لڑکی تھی۔ لڑکے کے چلے جانے کے بعد ٹھاکر اس کو دن رات روتا ہوا دیکھ کر حیران رہتا تھا کہ آنکھیں اتنا جل، اتنا نیر کہاں سے لے آتی ہیں۔ اور جب یہ آنسو خشک ہوئے ہیں، جب یہ نرمل جل سوکھا ہے تو لڑکی نے جیون نبا ہنے کی شکتی کھو دی ۔۔۔ شام کو، بھری شام کو اس نے اس کو کھائی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا، اس کھائی میں جس میں جھانک کر دیکھنا بھی کسی کے بس کی بات نہ تھی ۔۔۔ اور پھر اس نے کوئی آواز تک نہیں سُنی۔ یہ سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے اس قدر چپ چاپ ہو گیا کہ نہ کوئی چیخ ابھری اور نہ شام کا جادو ٹوٹا۔ آنجہانی ٹھاکر بلرام سنگھ کہتا تھا کہ "بٹیا کوشش" میں تو آج بھی اس کی روح کو اُداس اُداس بردولے کے احاطے میں گھومتا ہوا دیکھتا ہوں۔ درختوں کے اس جھنڈ میں سر جھکائے کھڑا ہوا دیکھتا ہوں، کھائی میں جست لگاتا ہوا دیکھتا ہوں۔

اور کوشلیا کو محسوس ہوا تھا کہ درختوں کی جھنڈ سے کوئی اس کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس نے نہ تو ڈیربالڈ کا ہاتھ تھاما نہ اس کے قریب ہی گئی ۔۔۔ پیارے لال تو خود ہی آگے آگے جا چکا تھا اور پھر اس کی قربت کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا ۔۔۔ اس وقتی اداسی نے کوشلیا کو باہمت بنا دیا تھا، اتنا باہمت کہ وہ ڈیربالڈ سے کچھ اور زیادہ پیچھے رہ جاتی تب بھی شاید نہ ڈرتی۔

فیوندے سے باہر نکلتے وقت کوشلیا نے دیکھا تھا کہ جھیل کے پیلے گلاب ڈیربالڈ نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لئے تھے جو اب یقیناً لو لوٹ اور کاغذوں کے نیچے دب کر مرجھا گئے ہوں گے۔

آج کی رات کے لئے جب ڈیربالڈ نے پیارے لال سے اس کو جیتا تھا تو

اپنا گلاب بھی پیارے لال نے ڈیر مالڈ کو یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ اس کی پنکھڑیاں نوچ کر بستر پہ کوشلیا کے نیچے بچھا دینا ــــ اور کوشلیا سوچ رہی تھی کہ ٹھاکر بلرام سنگھ جب تک زندہ تھا بردوے کا یہ دستور بن گیا تھا کہ لوگ جھیل سے جو پھول لے آتے وہ بردوے پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں اس خوفناک کھائی کی نذر کر دیتے، گویا کھائی کی دوشیزہ کے لئے یہ پھول محبت کا تحفہ ہوتے اور اس کے بعد بلرام سنگھ مسافروں اور نوبیاہتا جوڑوں سے کہا کرتا تھا کہ آج رات ان کے لئے مسرتوں اور شادمانیوں کی رات ہوگی ــــ لیکن لوگ آہستہ آہستہ اب اس دستور کو بھولتے جا رہے تھے ــــ آنے والے مسافروں کو کھائی کی دوشیزہ کی آنکھوں دیکھی کہانی سنانے والا بلرام ٹھاکر جب سے سورگ باسی ہوا تھا کھائی کی داستان لوگوں کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کوشلیا جب بھی کسی کے ساتھ ہوتی وہ اس کو یہ کہانی ضرور سناتی اور اس کا ساتھی کھائی کی طرف پھول پھینک دیتا جو کبھی کھائی میں کبھی قریب ہی ادھر گر جاتے۔ صبح کو اب بھی باسی پیلے گلاب کھائی کے دہانے پر دیکھے جاتے ہیں کبھی ان کی تعداد بہت ہوتی تھی۔

کوشلیا کا جی چاہا کہ ڈیر مالڈ کو روک کر کہہ دے کہ جیب سے پھول نکال کر سیدھے ہاتھ سے کھائی کی طرف جتنی قوت سے پھینک سکتے ہو پھینک دو ــــ ورنہ آج کی رات ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکیں گے، کوئی شے ہمارے درمیان حائل ہو جائے گی ــ لیکن اس نے ڈیر مالڈ سے کچھ بھی نہ کہا حالانکہ آج تک جتنے مسافر آئے تھے ان کے تعلق سے کبھی بھی کوشلیا کے دل میں وہ جذبہ نہ ابھرا تھا جو آج ڈیر مالڈ نے اس کے اندر بیدار کر دیا تھا اور جس کا نہ وہ صحیح تجزیہ کر پاتی تھی نہ کوئی صحیح نام دے سکتی تھی۔

بردوے کے سب ہی کمرے بھرے ہوئے تھے۔ بعضوں نے دروازے

بد بیتے اور روشنیاں مدھم تھیں جو کھڑکیوں اور روشندانوں سے چھن رہی تھیں۔ ایک دو کمروں میں تیز روشنیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ ان میں لوگ یا تو تاش کھیل رہے ہیں یا پی رہے ہیں۔

پیارے لال پہلے ہی کمرہ نمبر ۳ پر پہنچ چکا تھا اور تالا کھول کر اندر بھی داخل ہو گیا تھا۔ باغ میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بجلی کے قمقموں کی روشنیاں چھوٹے بڑے درختوں کے گھنے اور کم گھنے سایوں سے مل کر گنگا جمنی کا سا دلکش سماں پیش کر رہی تھیں۔ فضائیں پُر اسرار تھیں۔ ڈھکی ڈھکی، چھپی چھپی۔

"شانو کو کمرے میں سُلا دو کوشی" ــــ ڈیر بالڈ نے پتھر کے لمبے اور ٹھنڈے صوفے کی پشت پر ہاتھ ٹیک کر کہا اور جب وہ شانو جہ کو اپنی گود میں لے چکی تو ڈیر بالڈ نے اپنا کوٹ پھر اس کو اُڑھا دیا۔

"اس کی اندرونی جیب میں جس پر زِپ لگی ہے بہت سے پیسے ہیں ذرا احتیاط کرنا۔" ڈیر بالڈ نے کوشلیا سے کہا تو وہ جاتی جاتی رُک گئی۔

"تم اپنے پیسے نکال کیوں نہیں لیتے ؟"

"تم پاگل ہو گئی ہو ــ زیادہ بکواس مجھے نہیں سننا ہے۔"

کوشلیا نے منٹ بھر ڈیر بالڈ کو گھور کر دیکھا ــ اور سر جھکا کر شانو جہ کو اٹھائے چیکی سی کمرے کی طرف چلی گئی۔

پیارے لال کمرے میں نہیں تھا ــــ وہ شاید لیوٹری میں ہو گا۔ کوشلیا کو اس کی غیر موجودگی اچھی لگی ــ وہ ہوتا تو یقیناً مجھے تنہا پاکر کچھ نہ کچھ بات کرتا ــ اور میں کسی سے بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں ــــ اس نے محبت سے شانو جہ کو پلنگ پر سُلا دیا۔ پائنتی پڑا ہوا لحاف کھول کر اُڑھا دیا اور کوٹ کندھے پر ڈالتے ہوئے اندرونی جیب کو احتیاط سے چھو کر اس نے دیکھ لیا کہ زِپ برابر

گی ہوئی ہے — وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

ڈیر بالڈ ٹھنڈی پتھریلی بنچ کی پشت پر دونوں بازو پھیلائے ٹیک لگاکر بیٹھا ایک طرف کو گھور رہا تھا — اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کوشلیا اس کے اس قدر پاس آ گئی ہے۔

"کوٹ پہن لو — ٹھنڈی بنچ پر کب تک بیٹھو گے۔ اندر چلتے کیوں نہیں؟"

ڈیر بالڈ چونک کر جیسے دور سے لوٹ آیا — "مجھے تو گرمی ہو رہی ہے۔ تم پہن لو کوٹ۔ آؤ میں تمہیں پہنا دوں۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے کوٹ کوشلیا سے لے کر کھول دیا — کوشلیا نے بغیر کچھ لیے اس کی جانب پشت کر کے ہاتھ آستینوں میں ڈال دیئے۔

"ایک کام کرو —" ڈیر بالڈ نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ چابیاں لے جاؤ میرا سوٹ کیس کھول کر رم کا پائنٹ اس میں سے نکال لاؤ — دو گلاس بھی لیتی آنا۔ تم نے میرا سارا نشہ ہرن کر دیا ہے — آخر تم مجھے اپنا کیا سمجھنے لگی ہو — اور ہاں سنو۔ بلونت کو بھی بلا لانا اگر وہ آنا چاہے۔"

"تو ان کا نام بلونت ہے۔"

"تم نے پیارے لال کی بجائے" ان" کہہ کر اشارہ کیا ہے — تم اس غریب سے بے وجہ خفا ہو۔"

"میں کسی سے خفا نہیں ہوں — میں کون ہوتی ہوں خفا ہونے والی۔"

"کچھ نہ ہو کر بھی خفا ہو جاتی ہو۔ یہی تو تمہارا کمال ہے۔"

"کچھ بھی ہو اب میں کمرے میں نہیں جاؤں گی — وہ یقیناً مجھے تنہا پاکر مجھ سے بات کرے گا اور میں کسی سے ہنسی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تو پھر وہ اس وقت کہاں تھا جب تم گئی تھیں۔"

"وہ نہیں تھا — غالباً لیوٹری میں ہوگا۔"

"مسافروں اور ٹورسٹوں کا دل بہلانا جب تمہارا پیشہ ہے تو تمہیں اس قدر رود رنج نہیں ہونا چاہیئے۔"

"یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔۔ ویسے میں اتنی زود رنج بھی نہیں ہوں لیکن میں کسی کی پاؤں کی جوتی بھی تو نہیں ہوں ۔۔۔ اور پھر تم کیا مجھے اس لئے لائے ہو کہ میں تمہارا سوٹ کیس کھولوں، تمہارے لئے رم اور گلاس لاؤں تمہیں پلاؤں تمہارے پیسوں کی حفاظت کروں۔'

یہ کام بہر حال نہ انشادت طلب ہے نہ ہی اس میں تمہاری کوئی توہین ہوتی ہے ۔۔۔ کیا برا ہے اگر تمہاری رات کا بڑا حصہ ایسے ہی کاموں میں گذر جائے۔'

"کیوں بھلا ۔۔۔ تم مجھ پہ کبھی اس قدر ترس کھاتے ہو کبھی مجھے سرے سے عورت ہی نہیں سمجھتے۔ تمہیں تو اس رقم کا حساب چکانا تھا نا جو تم نے بے دریغ لٹائی ہے۔"

"وہ تو میں چکا ہی لوں گا ۔۔۔ میرا اپنا طور طریق ہے' اپنا اپنا انداز ۔۔۔ تم سے تمہارا سرا پلئے بغیر تمہارا جسم حاصل کئے بغیر بھی تو میں کچھ پا سکتا ہوں۔"

"کیا خاک پا سکتے ہو' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ۔۔۔" کوشلیا نے بظاہر بیزارگی سے لمبی جماہی لی۔

"پیو گی نا ۔۔۔"

"ہاں پی لوں گی۔"

"تو پھر میں خود لے آتا ہوں ۔۔۔ اور ڈیرِ بالڈ اٹھکر کمرے کی طرف چلا گیا کوشلیا پتھر کی بنچ پہ اس طرح بیٹھ گئی جیسے اسی بنچ کا ایک حصہ ہو۔

ڈیربالڈ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رم کے پائنٹ کے ساتھ صرف

ایک گلاس تھا اور اس نے دوسرا کوٹ پہن رکھا تھا۔
دوسرا گلاس مجھے نہیں مل رہا ہے۔ تم اس کوٹ میں پیاری لگ رہی ہو۔
ہم دونوں اسی گلاس میں پی لیں گے۔ شالو جیسوا باہٹ اور بلونت نے بھی اپنے
سر ہلا دیئے۔"
ایک سانس میں اس نے یہ بے ربط جملے کہہ دیئے تو کوشلیا ہنس پڑی۔
"بہت اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہو۔"
"ایسی اوٹ پٹانگ بھی تو نہیں کیں ـــــ سارے جملوں میں بس وہی ایک
بنیادی نہیں ہوتا ہے جو تمہارے حسن کی تعریف میں کہا گیا ہے ـــــ تم شاید یہ چاہتی
تھیں کہ بس پانچوں بار یہی جملہ بولتا رہتا ـــــ تم اس کوٹ میں پیاری لگ رہی ہو
تم اس کوٹ میں پیاری لگ رہی ہو ـــــ تم اس کوٹ میں بہت پیاری لگ
رہی ہو ـــــ تم اس کوٹ میں یقیناً بہت پیاری لگ رہی ہو ـــــ تم اس کوٹ میں۔"
"تم کیا مجھ سے کوئی فیصلہ کن لڑائی لڑنے کی ٹھان چکے ہو۔" کوشلیا نے
جھلا کر کہا۔
ڈیربالڈ ہنس پڑا ـــــ کوشلیا کے ہونٹوں پر جھکتے ہوئے اس نے کہا۔
"غصے میں تمہارا حسن بہت تیکھا ہو جاتا ہے۔"
جب وہ سیدھا ہوا تو کوشلیا نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"
ڈیربالڈ اس سے بالکل لگ کر بیٹھ گیا ـــــ اور گلاس میں رم ڈالنے لگا۔
"سوڈا نہیں ملایا ـــــ؟" کوشلیا نے پوچھا۔
"سوڈا نہیں ہے جس قدر گنجائش تھی بوتل میں پانی بھر دیا ہے ـــــ تم ہلکا سا
گھونٹ لو، یہ ابھی تلخ ہوگی۔ مجھے معاف کر دو کہ یہاں اس وقت میں تمہاری چھتی پر
نہیں پیش کر سکتا۔"

"کوئی بات نہیں اس وقت تو میں تمہارے ہاتھ سے زہر بھی پی سکتی ہوں۔"

"تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو ——؟"

"اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"تم نے کسی مسافر سے ایسی بات نہیں کی ہو گی۔"

"وہ تنہائی نہیں کی ہے —— میرا جسم سب کا ہے۔ میرا دل سب کا نہیں ہو سکتا۔"

"تو دل اب میرا ہو گیا ہے۔"

"یہ میں نے کب کہا۔"

"کچھ تو زہر میرے ہی ہاتھ سے کیوں پیو —— [illegible] کے ہاتھ سے کیوں [illegible] تمہارے پیارے لال کے ہاتھ سے کیوں نہ پیو —— اس بیرا کے ہاتھ سے کیوں نہ پیو جو تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اس کی پہنچ سے باہر ہو۔"

"لاؤ —— مجھے پریشان مت کرو ——" کوشلیا نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا جس میں ڈیربالڈ گلاس تھامے ہوئے تھا —— ڈیربالڈ نے اس کے ہونٹوں [illegible] گلاس لگا دیا تو کوشلیا نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لے لئے اور ڈیربالڈ —— گلاس اس کے ہونٹوں سے ہٹا لیا ورنہ شاید وہ سارے کا سارا خالی کر دیتی۔

"تلخ ہے نا ——" ڈیربالڈ نے پوچھا

"ہاں بہت تلخ ہے —— لیکن تم سے کم —— اثر بہت اچھا ہے۔ تمہارے اثر کی طرح۔"

ڈیربالڈ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"بہت زیادہ گہری ہیں —— اس جھیل سے زیادہ جس میں تم بجرہ لے کر ڈولتی رہتی ہو۔"

"ابھی تو تم جھانک رہے ہو —— ڈوب کر دیکھو گے تب پتہ چلے گا تمہیں۔"

"ایک بار ڈوب جاؤں گا تو پھر ابھر سکوں گا ؟"

"یہ تم جانو —— میں صرف گہرائی سے آگاہ کئے دیتی ہوں۔"

"تو کیا تم ہر مسافر کو ان کی گہرائی سے آگاہ کیا کرتی ہو؟"

"بالکل نہیں۔ کوئی جھانک کر دیکھنے کی بھی تو زحمت نہیں کرتا۔ بھلا اس کو کیا خاک گہرائی سے ڈراؤں گی ——— وہ تو تم اپنی جان کی بازی لگا رہے ہو سو تمہیں واقف کرا دیا ———" اور وہ بھرپور انگڑائی لے کر ہنس پڑی۔

ڈیریا بالڈ نے گلاس خالی کر دیا تو وہ کہنے لگی ——— "لاؤ۔ مجھے اور دو ——— اس کا حلق سے اترنا ہی مشکل ہے اور جب اتر جاتی ہے تو آدمی کے پر لگ جاتے ہیں۔"

"اور جب عورت کے پر لگ جاتے ہیں تو؟"

"عورت بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا۔"

"وہ تم خود کہہ رہی ہو۔"

"اپنے دل کی بات دوسرے کی زبان سے سن کر تمہیں تسلی ہوئی ہوگی ——— ہے نا ——— لاؤ مجھے اور تھوڑی سی پلاؤ ——— تنگ نہ کرو۔"

ڈیریا بالڈ نے اس کو اپنے بہت قریب کھینچ کر کہا ——— "دھیرج سے ——— آہستہ آہستہ اس ظالم کے ساتھ چلو ——— اتنی بکھٹ جاؤ گی تو اس خوب صورت سے جسم کا کیا ہوگا ——— تم کل ہی سے بیر چھوڑ کر رم کی ہو رہی ہوگی ——— بہت جلد باز ہو ——— پتہ نہیں اسی جلد بازی میں تم نے کتنوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

کوشلیا قریب قریب ڈیریا بالڈ کے سینے پر سر رکھ چکی تھی ——— اس نے سر ہٹا لینا چاہا تو ڈیریا بالڈ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگا لیا۔

اس نے بالڈ کی گردن میں باہیں ڈال کر اپنی طرف جھکا لیا ——— "تم یقین کرو میں نے کسی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہر مسافر کے ساتھ قدم دو قدم ضرور چلتی ہوں ——— کوئی جی دار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ سو پچاس قدم چل لیتی ہوں لیکن آخر میں ہوتا وہی ہے جو میرا اور مجھ جیسی عورتوں کا مقدر ہے ——— گھنے سائے پل بھر میں سمٹ جاتے ہیں۔ چاند کی کرنیں دھوپ پھینکتی ہیں پھر آگ پھینکتی ہیں اور سب کچھ پل بھر میں جھلس جاتا ہے۔ دہکتی

وہی فادر آف دی لیک، وہی بحرہ، وہی میں اور وہی شالوز رہ جاتے ہیں۔ یہاں میں ہر آنے والے کو پیلا گلاب دیا کرتی ہوں۔"

"تمہارے خیال میں تم میرے ساتھ کتنی دور تک آئی ہو۔"

"میں نے تمہارے ساتھ ابھی تک قدم بھی نہیں اٹھایا ہے۔ دوری کا کیا سوال ــــ تم اپنے تعلق سے اس قدر رجائی ہوتے ہوئے بھی گنجے ہو۔"

"گنجا ہو کر صرف جی ہی نہیں رہا ہوں بلکہ تم سے عشق لڑا رہا ہوں ــــ اور یہ رجائیت ہی ہے جو بال جانے کے باوجود بھی آنکھ مارنے سے نہیں ٹوٹکتی ــــ ورنہ تم جیسی لڑکیاں جھنجھنا بنا کر بجاتیں اور ہوا میں پھینک کر بھول جاتیں۔"

کوشلیا ہنس پڑی ــــ اس نے اپنا چہرہ بالڈ کے کوٹ کے اندر چھپالیا اور اپنی ناک سے اس کے سینے اور پیٹ کے درمیان گدگدانے لگی۔

ڈیر بالڈ نے موقع کو غنیمت جان کر شراب گلاس میں انڈیلی ــــ لیکن آواز سن کر کوشلیا نے کوٹ کے اندر سے چہرہ نکالا۔

"چور کہیں کے ــــ مجھے ٹھل دیتے ہو؟"

"چور نہیں ہوں ــــ چاہنے والا ہوں ــــ تیز پی رہی ہو۔ چوپٹ ہو جاؤ گی میں کہاں لاش کی طرح اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔"

"پھینک جاؤ کہیں۔"

"یہی تو ممکن نہیں ہے ــــ ورنہ کیا بات تھی ــــ پھینک جاتا۔"

"اچھا تھوڑی سی پلا دو ــــ" اور دونوں ہاتھوں سے گلاس مضبوطی سے پکڑ کر کوشلیا نے ڈیر بالڈ کے ہاتھ اپنی طرف کھینچے جن کی گرفت گلاس پر پہلے ہی سے مضبوط تھی اور بہت کوشش کر کے اس نے دو تین گھونٹ لے لئے۔

"تم سچ کس وقت کہتی ہو ــــ" ڈیر بالڈ نے بچی ہوئی شراب پی کر اس سے پوچھا۔

"اس دن جب مرد جھوٹ بولتے ہیں۔"

"اور جب مرد سچ بولتے ہیں؟"

"میں جانتی نہیں رہی ہوں۔ سچائی کی تلاش میں دور دور تک بھٹکی ہوں اور مایوس لوٹ آئی ہوں۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں ۔۔۔ شانو جہ کے باپ کے ساتھ تم کبھی روٹھی سکی ہو؟"

"میں آج بھی اس کے ساتھ چل رہی ہوں ۔۔۔ سوتے ہوئے بھی کبھی کئی بار اس کے ساتھ سو جاتی ہوں۔ شاید جھوٹ پر خود کو پیدا کرتی ہوں اور بھاگ آتی ہوں اور تم مردوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہو ۔۔۔ تم تو جانتے ہو کہ مجھ میں جو عورت بھی ہوتی ہے وہ ابھی پوری طرح میسوا نہیں بن سکی ہے۔۔ میں خوابوں میں جاگتی ہوں تو مجھے سکون بھی ملتا ہے اور جب یہ خواب ٹوٹتے ہیں میں تلملا کر رہ کر بھی رہ جاتی ہوں اُف تک نہیں کہہ سکتی ۔ کسی کو کیا بتا سکوں گی کہ خواب ٹوٹ گیا ہے ۔۔۔ بھلا کون سمجھے گا اور کسی کو کیا پڑی ہے کہ سمجھے بھی۔"

"تمہارا کوئی خواب ابھی ابھی ٹوٹا ہے؟"

"ہاں ۔۔۔ وہی خواب جو تم نے دکھایا تھا ۔ شانو جہ کو گود میں لے کر ۔ اسے اپنا کوٹ اڑھا کر ۔۔۔ اپنی جیب سے سگریٹ کیس نکلوا کر ۔۔۔ پھر تم نے اس دنیا کو منٹوں میں سب برباد کر دیا جس کو میں نے عورت، بیوی اور ماں کے سارے جذبوں کا گارا دے کر سجایا تھا اور آپ ہی آپ بسانے لگی تھی ۔۔۔ لیکن تم یا تو مت پیارے ہو یا مجھے سمجھے ہوئے کھلاڑی ہو ۔۔۔ پردے کی چڑھائی چڑھتے ہوئے تم ہانپنے لگے ۔ شانو جہ کو اس کے باوجود احتیاط سے چمٹائے رکھا ۔۔۔ اپنا کوٹ اس کو برابر اڑھاتے رہے ۔ پھر تم نے مجھ سے کہا جیب میں بہت سے پیسے ہیں احتیاط کرنا ۔۔۔ مجھے اس طرح ڈانٹا جیسے چوم رہے ہو ۔۔۔ اس طرح اپنا کوٹ مجھے پہنایا جیسے اپنا آپا نچھاور کر رہے ہو ۔۔۔ اور میں نے پھر خوابوں کی دنیا

تعمیر کر لی ہے ___ خوابوں کی اس دنیا میں بھی محبت جھوٹ کے منہ پر تھوک دینے کی حسرت لئے بیٹھی ہے لیکن جھوٹ اتنا خوب صورت ہے، اتنا حسین کہ پہچانا نہیں جاتا۔"

"تم پہچان کر بھی کیا کرو گی ؟"

"مجھے کچھ کرنا نہیں ہے ___ لیکن شالوجہ کو زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں اس کی خاطر ___ میرے شالوجہ کی خاطر کوئی میرا ہاتھ پکڑ لے اور میں اس کے ساتھ شالو کو لے کر اس ماحول سے بہت دور نکل جاؤں ___ اس زندگی سے بہت دور نکل جاؤں، اتنا دور کہ شالو بڑا ہو جائے تو یہ بات بھی اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی ماں نے جو کچھ دولت اس کی تعلیم و تربیت کے لئے جمع کی ہے وہ اس طرح جمع کی گئی ہے جس طرح میں کر رہی ہوں۔"

"میرے ساتھ چل سکو گی ؟"

"مجھ سے نہیں اپنے آپ سے پوچھو ___ اپنے دل سے پوچھو کہ وہ مجھے کتنی دور لے جا سکے گا۔"

"اور اگر میں تم سے کہہ دوں کہ تم سچائی سے بچنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیتی رہی ہو۔"

"کہہ سکتے ہو ___ یقیناً اس راستے پر میں اپنی مرضی سے چل پڑی تھی ___ لیکن اب پاؤں شل ہو گئے ہیں ___"

"سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم نے یہ راستہ چنا ہی کیوں ؟"

"چنا نہیں ہے ___ شالوجہ کا باپ مجھے ان راستوں پر بھٹکتا ہوا چھوڑ گیا ہے۔ مجرے والا کاکا جانتا ہے، جھیل جانتی ہے، چاندنی راتیں جانتی ہیں، وہ مجرہ جانتا ہے جس مجرے میں شالوجہ کا دل ایک ماں کی کوکھ میں پہلی بار دھڑکا تھا۔"

"ہیسن بھی جانتا ہو گا۔"

"بسین کچھ نہیں جاتا' اس کا نیوز سے بھی نہیں' بر دو لے بھی نہیں ـــــ ہاں ایک اور چیز جو آج نہیں تو کل جان لے گی اور وہ ہے وہی خوفناک کھائی جس میں گلاب پھینک دینے کے لیے میں تم سے التجا بھی نہ کر سکی ـــــ لیکن اٹھو ڈیر اب چلو بھی میرے ساتھ۔ ہم اس بلندی ہی سے اپنے گلاب کھائی میں پھینک دیتے ہیں۔"

"کیا ہوگا اس سے؟"

"کچھ نہیں ہوگا ـــــ لیکن آدمی کو جھوٹی تسلی بھی کہاں ملتی ہے ـــــ یہ بھی کیا کم ہے کہ تم کھائی میں گلاب پھینکنے کے لئے راضی تو ہوگئے ـــــ تم نے میرے لئے اتنا تو کیا۔ تم سرابوں کے قائل نہیں ہو ـــــ زندگی لق و دق ہو تو سراب ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن بلونت کا پھول میں کھائی میں نہیں پھینکوں گا ـــــ اس نے کہا تھا کہ پنکھڑیاں نوچ کر تمہارے پیچھے بچھا دوں۔"

"وہ تم کر لینا ـــــ بیچارے پیارے لال کی حسرتیں بھی پوری ہو جائیں۔"

"لیکن میں اپنے اور بلونت کے پھول میں تمیز کیسے کر سکوں گا ـــــ ہو سکتا ہے کہ میں بلونت کا پھول کھائی میں پھینک دوں اور اپنا پھول نوچ کر تمہارے پیچھے بچھا دوں۔"

"پھینکتے وقت ہم دونوں جس پھول کو چھو لیں گے ہمارا پھول وہی ہوگا ـــــ اس کے بعد مجھ میں یہ احساس مکمل ہو جائے گا کہ میں رات بھر کے لئے تمہاری محبوبہ ہوں' بیوی ہوں۔"

ڈیر بالا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"پگلی کہیں کی ـــــ" اس نے پیار سے کوشی کے گال کو چوم کر کہا۔

"پگلی نہ ہوتی تو اس زندگی سے نباہ کرنا کوئی آسان کام تھا۔"

"تم عورتیں خود اس راستے پر چلتی ہو ـــــ اشاروں سے مردوں کو نچاتی ہو ـــــ ہر وہ چیز حاصل کرتی ہو جو تمہاری مرضی ہے' تمہاری خواہش ہے یا پھر تمہاری ضرورت

ہے اور پھر خود کو مظلوم بنا کر ہم مردوں کے سامنے پیش کرتی ہو کہ ہم اپنے ظلم کا تماشہ دیکھیں اور تہمت اُٹھائیں۔"

"تم اس طرح دل شکنی پر کیوں اُتر آئے ہو ـــ آخر تم چاہتے کیا ہو" کوشلیا نے بگڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈیر بالڈ نے اس کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا ـــ "تمہیں خفا کرنا چاہتا ہوں۔ غصے میں تمہارا بھرا ہوا حسن دیکھنا چاہتا ہوں اور اسی عالم میں تمہیں چومنا چاہتا ہوں ـــ جی چاہتا ہے کہ تم کوئی ایسی ناقابلِ تسخیر چیز بن جاؤ جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑے ـــ ہوشیاری اور مکاری دکھانی پڑے ـــ اس وقت جب تم غیض و غضب کے عالم میں اپنے نازک ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ کر اس کی دھجیاں کرنا چاہو، میں تمہارے کپڑے اتارنے کی کوشش کروں۔"

"یہ کیسی خواہش ہے؟"

"پتہ نہیں ـــ میں خود نہیں جانتا کہ یہ کیسی خواہش ہے۔ یہ شاید کسی ایسے مرد کی خواہش ہے جو پیسے کے بل بوتے پر تمہیں اور تمہاری بہنوں کو حاصل کرتا رہا ہے ـــ وہ چیز جو حاصل ہوتی رہے پھر اس میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔"

"تم بیک وقت کتنے نرم اور کتنے سخت ہو۔"

"میری بیوی بھی یہی کہتی ہے ـــ لیکن تمہارے قبیل کی عورتیں مجھے ظالم سمجھتی ہیں اور دوسروں کی بیویاں مجھے نیک اور نرم۔"

یکا یک وہ اچھل کر ڈیر بالڈ کی آغوش سے جدا ہوئی اور تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وحشیانہ آنکھوں سے اس نے ڈیر بالڈ کو دیکھا اور قریب چلا کر کہا۔ "سنو ـــ سنو، وہ شالو جہ کی آواز ہے۔ یقیناً یہ میرا شالو جہ ہے ـــ میں نے اس کی یہ آواز پہلے بھی سنی ہے۔" اور وہ ایک لمحہ انتظار کئے بغیر دیوانہ وار کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ اس کے پیر اس کے ڈھلکے ہوئے آنچل میں اُلجھ گئے ـــ

اس کی لمبی لمبی ناگنوں کی طرح لہراتی زلفیں بل کھا کھا کر کھیلتی رہیں۔ پھر کچھ سنبھل کر وہ اور بھی بیر دوڑنے لگی۔

ڈیہ بالڈ حیران تھا۔

لمحہ بھر کو اس نے سوچا کوشلیا کوئی نیم پاگل لڑکی تو نہیں ہے اور کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو رہا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بلکہ قریب قریب دوڑتا ہوا جب وہ کوشلیا کے قریب پہنچا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے پر جو اندر سے بند تھا ٹکرا رہی تھی۔

پہلے اس نے دروازہ خوب پیٹا پھر اس نے بائیں اور سیدھے بازو پر اپنا بوجھ لے کر خود کو دروازے سے ٹکرایا۔ چٹخنی کسی خرابی کی وجہ سے خود بخود کھل گئی ۔۔۔۔ دروازے کے پٹ اس وقت آواز دے کر کھلے جب وہ پوری قوت سے دروازے سے ٹکرائی تھی ۔۔۔۔ کوشلیا کمرے میں جا گری۔

بلونت کی پتلون اتری ہوئی تھی۔

ستالوجہ کی نکر بھی نیچے پڑی ہوئی تھی اور وہ پیارے لال کے بستر پر ننگا پڑا کراہ رہا تھا۔

کوشلیا کی آنکھوں میں زمانے بھر کی وحشت جیسے پناہ لینے کے لئے چلی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں گھائل ہرنی کی طرح وحشیانہ تھیں ۔۔۔۔ اس نے پھیلی پھیلی آنکھوں سے بلونت کو دیکھا جو جلدی جلدی پتلون پہن رہا تھا ۔۔۔۔ وہ جست لگا کر اٹھی اور بلونت پر جھپٹی۔ اس نے تابڑ توڑ دو چار مکے اور تھپڑ بھی اسے جڑ دئے۔

ڈیہ بالڈ نے بیچ بچاؤ کیا ۔۔۔۔ وہ کوشلیا کو اپنی باہوں میں کس لیتا اور وہ پھر پھر کر نکل جاتی ۔۔۔۔ آخرش ڈیہ بالڈ نے بلونت کو کمرے کے باہر ڈھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے کوشلیا کے کپڑے اتارنے کی کوشش کرنے لگا جس سے کوشلیا غصہ کے عالم میں بے خبر تھی۔

• • • •

افواہیں اُڑی ہوئی تھیں کہ شانوجہ برہمن بستی ہی کے کسی گھر میں چھپا ہوا ہے۔
مورک ہینس کے ملازم یعنی فیوزے کے اس سرے نے جو کوشلیا کو حسرت سے
آج بھی تکا کرتا ہے' یہ بتلایا کہ خالوں کی ٹولی کے اسّی سالہ صدر کے چالیس سالہ سب سے
چھوٹے بیٹے نے شانوجہ کو رکھ لیا ہے جس کا شہر میں گتہ داری کا دھندا ہے۔ کوشلیا کی
ہمدردی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فیوزے کا یہ بیرا ہینس سے دو روز کی
چھٹی لے کر برہمن بستی کو جا رہا تھا ـــ اس نے ہینس کو چھٹی لینے کی وجہ بھی نہیں بتلائی
تھی۔ لمبی مدت کے لئے چھٹی لے کر وہ بیوی بچوں میں کچھ ہی دن پہلے ہو آیا تھا' اس لئے
امید نہ تھی کہ ہینس بغیر تنخواہ وضع کئے مزید دو روز اس کو چھوڑ دے گا' اس نے
اچھی خاصی اداکاری کی ـــ اس نے شہر سے تار منگوانے کا انتظام کر لیا۔ تار آیا تو
وہ فیوزے ہی میں کاؤنٹر پر ہینس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہینس ہی نے تار وصول کیا اور
اس کی طرف بڑھایا تو بہت فکر مند ہو کر اس نے کہا کہ آپ ہی پڑھ دیجئے ـــ لکھا تھا۔
ماں مر گئی ہے ـــ فوراً چلے آؤ۔"
ہینس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "تمہاری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ بچنے
کی امید کم ہے' تمہیں بلایا ہے۔"
صمصام دین جو فیوزے کے گاہکوں کے لئے صرف بیرا تھا اور ہینس کے لئے
سَم سَن' کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑا رہا پھر دو آنسو اس کے گالوں تک آپہنچے
پھر ان کے پیچھے اور آنسو ڈھلک آنے میں کامیاب ہوئے اور پھر وہ باقاعدہ رونے
لگا۔ گاہکوں میں سے ایک نے جو قریب ہی کی میز پر بیٹھا "لوتھ بیک" سے دانتوں میں
پھنسا ہوا گوشت نکال رہا تھا ہاتھ کے اشارے سے ہینس سے بیرے کے رونے کی
وجہ پوچھی۔
" سم سَن کی ماں مر گئی ہے بیچارے کی۔" صمصام دین چونکا ـــ "مر گئی ہے ـــ سچ
بتاؤ۔ مر گئی ہے یا مر گئی۔ ابھی تو آپ نے بتایا تھا کہ اس کی حالت بہت خراب ہے۔

تار میں کیا لکھا ہے ــــ کیا لکھا ہے تار میں ــــ ؟" اور صمصام دین وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"صبر کرو سیمن، صبر کرو ــــ اور جاؤ فوری بس پکڑ لو۔"

ہینسن نے اس کے کندھے کو دبا کر کہا اور کاؤنٹر کی ڈراز کھول کر دس دس کے دو نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے ــــ کہنے لگا۔

"رکھ لو ــــ کام آئیں گے ــــ میں ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ کاٹ لیا کروں گا۔"

"شکریہ سر" صمصام دین نے اپنی آنکھوں کی چمک کو چھپاتے ہوئے کہا جو دو دو نوٹ دیکھ کر جھلکے ہوئے جگنو کی طرح اس کی آنکھوں میں چلی آئی تھی ــــ اس نے نے دلی سے نوٹ پتلون کی نچلی جیب میں رکھ لئے۔

جب وہ جھیل کے کنارے، پھوس کے جھونپڑے میں کوشلیا سے ملنے کو آیا تھا تو اس کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر ہی اس کی پذیرائی کے لئے کوشلیا باہر نکل آئی تھی۔

صمصام دین بہت ہمدرد آدمی ہے ــــ کوشلیا ادھر کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی اور وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے بلکہ دل ہی دل میں مجھے چاہتا ہے ــــ غریب ہے اور خالی جیب ہے کہ چونکہ مجھ تک پہنچ نہیں سکتا، میرے دکھ درد میں حصہ بٹاتا ہے تاکہ محبت اور ہمدردی دے کر مجھے اپنی طرف ملتفت کر سکے اور میں اس کی اس کمزوری اور ناداری سے پوری طرح لطف اٹھا رہی ہوں۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور جھونپڑے سے باہر نکل آئی۔ صمصام دین قریب پہنچ گیا تو وہ مسکرانے لگی اور یہ بھول گئی کہ اس نے ابھی ابھی ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"چھٹی مل گئی صمصام ؟" کوشلیا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ہاں مل گئی ہے" صمصام نے، جو کچھ دیر پہلے فیوزنے ہاورز کے کاؤنٹر پہ

کلا اسسکیاں لے رہا تھا' بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"بھلا ہینس کیسے راضی ہو گیا صم ؟"

صمصام دین کوشلیا کی چھاتیوں کو تک رہا تھا جو کرتے اور محرم میں چھپی ہوئی تھیں لیکن تن پر آنچل پڑا ہوا نہ تھا۔

اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کوشلیا نے شرر پر نظروں سے صمصام دین کو دیکھا ـــــ صمصام دین ہوش میں آیا اور شرما کر نظریں جھکالیں تو کوشلیا نے یہ پوچھا ـــــ

بھلا ہینس کیسے راضی ہو گیا صم ۔"

صم ۔صم ۔صم ـــــ اس مختصر نام میں کتنی دلکشی ہے۔ کوشلیا نے پہلے بھی صم ہی کہا تھا لیکن صمصام دین وہ چیزیں دیکھ رہا تھا جو اب کوشلیا کے دونوں ہاتھوں کی صلیب کے نیچے چھپی ہوئی تھیں اور اس چاہت سے پکارے جانے کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ اب اس کو کوشلیا کی زبان سے صم بہت پیارا لگا ـــــ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اس کو پکارے کوش ـــــ جیسے بہت سارے گاہک فیوزے میں اس کے ساتھ پی کر اس کو پکارتے رہے ہیں اور صمصام دین کھڑا اپلٹ پلٹ کر ہمیشہ دیکھتا رہا ہے کہ روسیہ کوشلیا کو منٹ بھر میں کس طرح کوش بنا کر رکھ دیتا ہے۔

"تم کہاں ہو ـــــ سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو ؟"

صمصام دین اس طرح چونکا جیسے بڑی رات کو فیوزے میں اونگھتے وقت گاہکوں کی گھنٹی کے تسلسل پر چونک پڑتا ہے ـــــ اور وہ بچوں کی طرح باچھیں کھول کر ہنسنے لگا۔

"تم بتا دو کبھی تم ؟"

"ریم ریم ـــــ اس نام نے صمصام دین کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ لیکن ایکی بار اس نے اپنے پر جو رکھا

"میں نے شہر کے ایک دوست کو چٹھی لکھی تھی کہ وہ تار کے ذریعہ میری ماں کے مرنے کی اطلاع دے، سو اس نے دے دی۔"

"ہائے اللہ ـــ ماں مرے گی تو کیسے کہہ گئی صم نے

بھیا صم ـــ

صمصام دین کو تلسا کو اس طرح تکنے لگا جیسے بچہ دوکان میں دھرے ہوئے کھلونے کو تکتا ہے۔

"ماں تو اس وقت مری ہے جب میں پیدا ہوا تھا ـــ" صمصام دین نے انکشاف کیا۔ "پھر میں ماں کو کئی بار جلا جلا کر مارتا رہا ہوں ـــ اسکول میں کبھی میں نے کئی بار اس کو مار دیا تھا۔ لیکن وہ میری مدد کرنے کو پھر زندہ ہو گئی تو آج مار دیا۔"

کوتلسا کو یوں لگا جیسے سب بچے ماں کو اسی طرح مارتے ہیں اور شانو جو تو اس کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے درپے ہے۔

"خرچ کے لئے یہ رکھو ـــ" بند مٹھی صمصام دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کوتلسا نے کہا تھا ـــ

"میرے شانو جو کو کسی طرح لے کر آؤ تم۔ میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔"

لیکن صمصام دین نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کوتلسا کا ہاتھ روک دیا اور کہا ـــ

"پیسے میرے پاس ہیں ـــ میں یہ سب پیسوں کے لئے نہیں کر رہا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں ـــ سب کچھ جانتی ہوں۔"

صمصام دین کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں ـــ تم جانتی ہو تم سب کچھ جانتی ہو ـــ کیا جانتی ہو تم ـــ اور وہ شانو جو کی تلاش میں بڑی بستی کے لئے روانہ ہو گیا تھا بھی ہر ہر قدم پر اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں صم نے۔"

اور دو روز کے بعد آج جب وہ واپس آیا تھا تو اس نے بڑے ہی والہانہ

طور پر کوشلیا کو بتلایا تھا کہ شالوجہ کو اسّی سالہ حاجن کے صدر کے چالیس سالہ بیٹے نے رکھ لیا ہے۔ اور شالوجہ اب رتناٹ کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ ساڑی باندھتی ہے اور چوڑیاں بھی اس نے پہن رکھی ہیں۔ وہ لپ اسٹک بھی لگاتا ہے ــــ یہاں تک کہ ــــ یہاں تک کہ ــــ سینے پر کچھ ابھار سا بھی آ گئے اس کے ــــ اس نے پستان بھی بنا لئے ہیں'

آخری جملہ جلدی سے کہہ کر شالوجہ کا غلام رتن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ایک تو کہ کوشلیا کا ڈر ــــ اشارے کر دوسرا ۔ دھیمی آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا اس آہستہ کہ سوائے کوشلیا کے کوئی بھی نہ سن سکتا تھا ــــ اور پھر باتیں بھی ایسی کہ ــــ لیکن صمصام دین نے جب کوشلیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اُس کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔

صمصام بھی خاموش ۔ بڑی دیر تک بیٹھا زمین پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔

کوشلیا نے جب خود کو کچھ سنبھالا تو اس نے صمصام سے دریافت کیا کہ آیا وہ شالوجہ سے مل سکتا ہے۔

صمصام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ شالوجہ سے ملنا بہت مشکل ہے ــــ گھر پر جو نوکر چاکر ہیں ان میں سے بہت سوں کو ابھی اس کا علم بھی نہیں ہے کہ شالوجہ کوئی لڑکا ہے۔ وہ تو صرف اس حد تک جانتے ہیں کہ حاجن ایک بڑھیا اٹھا لایا ہے جو اس کے ساتھ دو ایک روز کے لئے تفریحاً یہاں آئی ہے اور پھر شہر چلی جائے گی ــــ اور اس طرح خواہ آنے والی کوئی بھی ہو ان کی مالکن ہے اور سب کے سب اس نئی مالکن کے اشارے پر دوڑتے ہیں۔

کچھ رُک کر وہ پھر کہنے لگا ــــ "میں صرف ایک بار شالوجہ کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ اس نے مجھ کو دیکھا نہیں اور میں دیکھ کر بھی اس کو پہچان نہ سکا ــــ

پہرے دار نے مجھ کو چھپا لیا تھا کیونکہ رات ہوٹل میں بہت سا پیسہ میں نے اس پر خرچ کیا تھا ۔۔۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو آج کل مالک کی منظور نظر ہے ۔۔۔ ستاروں سے اٹھاتی اور بٹھاتی ہے اور مالک اس کو خوش کر کے بہت خوش ہوتا ہے ۔۔۔ چھوٹا خان سرخ و سفید تیم تحیم آدمی ہے ۔۔۔ شانوں تک بال ہیں جو بہت سلیقے سے کٹے ہوئے ہیں ۔۔۔ شانوجہ اس کے پہلو میں بہت قریب ہو کر موٹر میں بیٹھ گیا تھا اور وہ بڑی محبت سے اس سے کچھ پوچھ رہا تھا ۔۔۔ وہ بہت ہی خوب صورت نظر آ رہا تھا ۔۔۔ میں نے اس کو پھر دیکھنے کی کوشش کی کہ پہچان سکوں ۔ ایک جھلک پھر اس وقت دیکھی جب موٹر روانہ ہوا لیکن میں اسے پہچان نہ سکا ۔۔۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک نوجوان لڑکی کا امتیاز ہے ۔۔۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ شانوجہ ہے اس لئے کہ میرا دوست مجھے غلط اطلاع نہیں دے سکتا ۔

اس بصیرے کو پولیس کے حوالے کرنے میں کوشلیا کو پس و پیش تھا ۔ وہ جانتی تھی کہ پھر یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہے گی اور دنیا جان لے گی کہ شانوجہ اس حد تک خراب ہو چکا ہے ۔ ہمنین توطعنوں اور کچوکوں سے میرا کلیجہ چھلنی کر دے گا ۔ پہلے ہی شانوجہ نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے جواب دوسرے لوگ پوری کریں ۔۔۔ وہ سسک سسک کر رہ جاتی اور شام ہوتے ہوتے اس کی اداسیاں ہی اس کے چہرے کا غازہ بن جاتیں اور جھیل پر بجرے میں سیر کرنے والوں کی پذیرائی کے لئے تیار ہونے سے وہ گریز کرتی اس کے باوجود بھی کہ کاکا اصرار کرتا رہتا ۔

شانوجہ سے اس کو جدا ہوئے چھ دن ہو چکے تھے ۔۔۔ وہ اس کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھی ۔ تنہا بیٹھے بیٹھے بسا اوقات اس نے شانوجہ کے خلاف بھی سوچا تھا ۔ کئی بار اس نے ارادہ بھی کیا تھا کہ وہ شانوجہ سے اب بالکل بے تعلق ہو جائیگی ۔ ۔۔۔ ایسی اولاد کی زندگی اور موت میں کیا فرق ہے ۔۔۔ وہ خود چلا آئے بھی تو

وہ ملے گی بھی نہیں ___ اچھی اولاد نصیبوں سے ہوتی ہے۔ شانوجہ کیسی بھرپور جوانی نکال رہا تھا ___ مردوں کی طرح اس کے اطوار خراب بھی ہوتے تو وہ سہہ لیتی لیکن شانوجہ نے تو اس کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ ابھی نا امید نہیں ہوئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شانوجہ عمر کی ایک منزل میں پہنچ کر سنبھل جائے گا ___ جب وہ کھوٹ پھاٹ کر جوان ہوگا تو وہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر روئے گی ___ تم میرے بڑھاپے کا سہارا ہو شانو۔ تم میرے سفید بالوں کی آبرو ہو ___ لیکن شانوجہ تو ساری پہنتا ہے ___ لپ اسٹک لگاتا ہے۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں جھن جھناتی ہیں ___ اس کا سینہ جس پر سر رکھ کر رو لینے کی حسرت ہے اس پر شانوجہ نے مصنوعی گولائیاں سجا رکھی ہیں ___ اب میں یہ سر کہاں لے جاؤں جو میرے دوش پر بار ہو گیا ہے ___ بھگوان جو کچھ میں نے سُنا ہے سب جھوٹ ہو ___ یہ سب غلط ہو خدایا۔

اس نے مری ہوئی آواز میں کہا ___

"وہ شانوجہ ہوتا تو تم ضرور پہچان لیتے صمصام ___ وہ میرا شانوجہ نہیں ہوگا نہیں ہوگا وہ میرا شانوجہ۔"

"میں اس کا پتہ لگاؤں گا کوسی۔"

بجرے والے بوڑھے کاکا نے کوشلیا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی ___

"تم رو رو کر ہلکان نہ ہونا ___ تم نے شانوجہ کے لئے کیا کچھ نہیں کیا ___ وہ ابھی نادان ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو بھی غنیمت جانو اور وہ لوٹ آئے گا مجھے یقین ہے، مجھے وشواس ہے کوسی ___ جھیل پر ڈولتے ہوئے بجرے کی قسم میں اسے لے آؤں گا۔"

"صمصام بیٹا اس راز کو اپنے سینے میں چھپا رکھنا۔"

صمصام نے بیوقوفوں کی طرح کاکا کے چہرے کو تکتے ہوئے سر ہلایا

کوشلیا نے آنچل سے آنکھیں خشک کر کے نظریں اٹھائیں تو کمل کے سینے پر ڈولتے کنول اس کو اپنے ہی آنسو جیسے دمکتے ہوئے نظر آئے۔

آج شانو کے لئے روتے ہوئے جانے ایسے آنسوؤں کی نسبت اتنا پاکیزہ تصور اس کے ذہن میں کس طرح ابھر سکا ورنہ اس نے کبھی بھی اپنے آنسوؤں کو اہمیت نہیں دی تھی۔

ماں کے آنسو دلدل میں گرتے ہیں تو بھی کنول بن جاتے ہیں۔ اس نے خود ہی سوچا

کوشلیا جانتی ہے کہ وہ افواہیں جو شانوجہ کی نسبت محل، شہر اور پڑوسے گسٹ ہار کے مضافات میں پھیلی ہوئی ہیں وہ سب کی سب غلط ثابت ہوں۔ فیورک ہینس کو وہ ان افواہوں کے پھیلانے کا ذمہ دار گردانتی تھی ـــــ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شانوجہ کی تباہی اور بربادی کی داستانیں ہینس نمک مرچ لگا کر جلے بیچاروں لوگوں میں بیان کرتا ہے۔ وہ انھیں یقین دلاتا ہے کہ صرف کوشلیا کی وجہ سے شانوجہ ان راستوں پر چل پڑا ہے جو لڑکوں کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتے ـــــ وہ کہتا ہے کہ کل شانوجہ کوشلیا کی آمدنی میں اضافے کا باعث بن جائے گا اور آج جو باتیں ڈھکی چھپی ہو رہی ہیں کل کھلے بندوں ہوں گی۔ لونڈے کے کمانے کے یہی دن ہیں اور لونڈا ہے بھی ظالم ـــــ ہینس نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ شانوجہ کہاں ہے۔ کوشلیا سب کچھ جانتی ہے۔ کسی موٹے اسامی نے شانوجہ کو رکھ لیا ہے۔ کوشلیا نے یقیناً معقول معاوضہ لیا ہوگا ـــــ ماں ہو تو ایسی ہو۔ وہ بلا تکلف اور بلا کسی جھجک کے پورے یقین کے ساتھ کہتا ـــــ ماں ہو تو ایسی ہو کہ نو مہینے جس اولاد کو اپنے پیٹ میں رکھا اس کی نسبت دعائیں مانگتی رہی کہ خوب صورت سی بچی ہو تا کہ اس کے پیشے کو آگے بڑھا سکے۔ لیکن جب بچہ ہوا تو دھن کی پکی کوشلیا نے اس کو بھی اسی ڈگر پر ڈال دیا۔ ہینس کی باتیں سوچ سوچ کر کوشلیا کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ وہ چاہتی تھی کہ شانوجہ

پروان چڑھے۔ اچھا سا جوان نکلے جس پر وہ فخر کر سکے ـــــ کوشلیا کی اس تمنا کے پیچھے مامتا بھی تھی اور فیوزک ہینسن کو دنیا کے سامنے دروغ گو ٹھہرانے کا جذبہ بھی ـــــ فیوزک ہینسن کوشلیا کے لئے ایک مستقل آزار بن گیا تھا۔ وہ شانوجہ کا تصور کرتی تو فیوزک ہینسن کا چہرہ بھی ساتھ ہی اس کے ذہن میں اُبھرتا ـــــ وہ دل تھام کر رہ جاتی ـــــ شانوجہ تم اچھے بن جاؤ۔ تم ایسے بن جاؤ شانوجہ کہ میں سینہ تان کر فیوزک ہینسن سے کہہ سکوں کہ دیکھو یہ میرا بیٹا ہے ـــــ اس کی کڑیل جوانی دیکھو۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ دیکھو۔ اس کے بازوؤں کا بل دیکھو اور میرے خلاف دنیا بھر میں بک بک کرنا چھوڑ دو۔ لیکن شانوجہ سنا ہے کہ تم نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لی ہیں ـــــ سینے پر ایسی گولائیاں اُبھار لی ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی ماں رو بھی نہیں سکتی ـــــ کاش تو پیدا ہی نہ ہوتا شانو ـــــ یا پھر مر جاتا ـــــ مر جاتا ـــــ مر ہی جاتا۔ اور کوشلیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسرے دن کاکا روانہ ہونے لگا تو برہن بستی میں خان کے گھر کا پتہ صمصام دین نے اس کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ جاتے جاتے کاکا نے صمصام دین سے کہا کہ اس کے لوٹنے تک وہ کوشلیا کا ذرا خیال رکھے ـــــ ہفتے کو کسی طرح میں لوٹ آؤں گا ـــــ وہ کہنے لگا کیونکہ اتوار کی صبح ہی سے ہجرے کے شوقین ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھوس کے جھونپڑے کی چھت پر سے اس نے ٹین کا بورڈ نکالا جس پر لکھا تھا۔

"ہجرہ مرمّت طلب ہے۔"

اور نسبتاً باریک خط میں نیچے لکھا تھا۔

"ہم کل آپ کے منتظر رہیں گے۔"

جھاڑ پونچھ کر اس نے بورڈ کو لوہے کی اس صلیب پر اسکرو سے فٹ کیا جو تصیل کے چمن کی چھوٹے سے گیٹ کے برابر ٹنگی کھڑی تھی ـــــ پھر وہ تھکے تھکے

قدم اٹھاتا جھونپڑی میں چلا گیا۔

کھاٹ کے نیچے سے اس نے ایک اور تختی نکالی اور پاس پڑے ہوئے میلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اس کو صاف کیا ـــــ حروف واضح ہو گئے تھے لکھا تھا۔

"آج چمن میں داخلہ ممنوع ہے ـــــ" اس نے اس تختی کو صمصام دین کے حوالے کر کے کہا کہ چمن کے گیٹ پر کسی تیلی یا تار سے باندھ دے ـــــ

کاکا روانہ ہوا تو کوشلیا نے محسوس کیا جیسے جھیل کا پانی بجرے سے سر ٹکرا کر رو رہا ہے، حالانکہ ہر چیز بدستور جوں کی توں تھی ـــــ جھیل اپنی گہرائیوں کو سمیٹے بالکل خاموش تھی اور اس کے سینے پر ڈولنے والا بجرا یوں ٹھہرا ہوا تھا جیسے جھیل کا پانی یخ ہو کر برف بن گیا ہو ـــــ کوشلیا کی آنکھوں میں بھی آنسو کی ایک بوند نہیں تھی ـــــ واقعی کوئی چیز رو رہی تھی تو وہ شاید کوشلیا کا دل تھا جس کا پرتو وہ سارے ماحول میں دیکھ رہی تھی ـــــ پیلے گلاب اپنی شاخوں پر جھوم رہے تھے اور ان کی پنکھڑیوں پر چمکنے والے اوس کے موتی سورج کی کرنوں نے ایک ایک کر کے پی لئے تھے ـــــ دور دھوپ پھیل گئی تھی اور پہاڑی کے دامن سے چرواہے کی بانسری کی صدا ہوا کے دوش پر سوار ہو کر "داخلہ ممنوع ہے" کی تختی کی پرواہ کئے بغیر چمن میں آ رہی تھی۔ اور پُرسکون جھیل کے سینے پر تیر کر لہروں میں تبدیل ہو رہی تھی ـــــ روتے رہنے سے کوشلیا کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور پپوٹے سوج گئے تھے۔ لیکن اس کی صباحت اور ملاحت کچھ اور نکھر آئی تھی ـــــ تین روز سے اس نے شام کو نہ سنگھار کیا تھا نہ بجرے پر آنے والے مسافروں اور ٹورسٹوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے مسکراتے ہوئے گلاب کے تختوں تک گئی تھی ـــــ آنے والے مسافروں میں کسی جان پہچان والے نے کوشلیا کو پوچھا بھی تو کاکا نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ ان دنوں یہاں نہیں ہے، بس کل پرسوں میں آ جائے گی۔

آج جب کاکا خود جا رہا تھا تو وہ سوچ رہی تھی کہ آنے والے مسافروں

کی یورش سے بچنے کے لئے گیٹ پر تالا ڈال دینا چاہئے۔۔۔۔ تار پر پھیلی ہوئی لال لال پھولوں کی ہری ہری باڑھ کے احاطے کے بیچوں بیچ لوہے کی سلاخوں کے تین فٹ اونچے چھوٹے سے گیٹ پر کوشلیا نے اندر ہی کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر تالا ڈال لیا اور موڑ پر نظروں سے اوجھل ہونے تک کاکا اور صمصام دین کو دیکھتی رہی۔۔۔۔ صمصام دین کچھ اور دور چلیں کہ اس موڑ پر کاکا سے جدا ہو گیا جو فیوزیے لیک میس کی طرف جاتا تھا۔

تنہائی کا اتنا شدید احساس آج تک کوشلیا کو نہیں ہوا تھا۔ پیلے پیلے کھلے ہوئے گلاب اور کھلی ہوئی کلیاں جو اس کی روح کو فرحت بخشتی تھیں آج وہ بھی اس کی اُداسی کو ہوا دے رہی تھیں۔۔۔۔ پجرے کے قریب قازوں کا جوڑا چہل کرنے اور غوطے لگا لگا کر نہانے میں مگن تھا۔۔۔۔ اوپر منڈلاتی ہوئی چیل کو ترچھی نظروں سے دیکھ کر کاکا کے مرغ "شیر دل" نے عجیب سی آواز اپنے گلے سے نکالی تھی، جو اس خطرے کی گھنٹی تھی کہ چیل اوپر منڈلا رہی ہے۔۔۔۔ شیر دل کی آواز سُن کر جھٹ سفید "مکھنیا" بے تاب ہو اُٹھی تھی اور ننھے ننھے چوزے روئی کے گالوں کی طرح لڑھک کر اس کے پروں میں سمٹ آئے تھے اور "مکھنیا" سب کو سمیٹے زمین سے جیسے گوند لگا کر چپک گئی تھی۔۔۔۔ شیر دل گردن گھما گھما کر خطرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس بار کوشلیا کو شانوجہ اور اس کا باپ دونوں ہی بے اختیار یاد آئے۔ وہ سوچنے لگی کہ باپ کا سایہ بچوں کے لئے کس حد تک ضروری ہوتا ہے لیکن جیسے "مکھنیا" نے اس سے کہا کہ ماں کی آغوش اس سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔۔۔۔ دیکھو نا۔۔۔۔ دیکھو، میں نے کیسے سب کو پروں میں چھپا رکھا ہے۔

کوشلیا نے اس کے بعد سپر ڈال دی۔۔۔۔ وہ شانوجہ کے بے وفا باپ پر شانوجہ کی تباہی کی ساری ذمہ داری سونپ کر خود کو جھوٹی تسلی دینے کے درپے تھی کہ تو بے قصور ہے، کوشلیا تو مظلوم ہے، بے سہارا ہے۔۔۔۔ لیکن اس خود فریبی

کو جب وہ تادیر قائم رہ رکھ سکی تو فیوزک ہینسن جیسے آس پاس سے اس کے کانوں میں چلانے لگا ـــــ تم ہو ـــــ شانوجہ کی تباہی کا باعث تم ہو کوش۔

شانوجہ بھی بارس حادثے سے دوچار ہوا تھا وہ اسی کٹیا میں تو ہوا تھا ـــــ تم اور تمہارا کاکا بجرے میں مسافروں کو سیر کرانے میں مگن تھے۔ تم نے نہیں سوچا ہوگا کہ انسان درندہ ہو سکتا ہے لیکن تم نے یہ ہر حال یہ تو سوچا ہوتا کہ شانوجہ کٹیا میں اکیلا ہے۔ اس کا بچپن کٹیا میں اکیلا ہے، اس کی معصومیت کٹیا میں اکیلی ہے جس کو تمہاری ماتا کی ضرورت ہے لیکن تمہاری مامتا تو اسی مرد کے قدموں میں پڑی بلک رہی ہے جس نے تمہیں کنواری لڑکی سے عورت بنایا ـــــ تمہاری گود شانوجہ سے بھری اور پھر ایسے ہی کسی مرد نے شانوجہ کے معصوم بچپن کو اپنی جنسی ہوسناک درندگی سے شکار کر کے ایسے ہی کنویں میں پھینک دیا کہ تم آج اس کی آواز کے لئے ترس رہی ہو۔

شانوجہ کا باپ مجرم ہے کوشلیا۔

لیکن تم اس سے بڑی مجرم ہو ـــــ تم راستے کے کانٹوں کو بھول کر اپنے ڈیر بالڈ کے لئے بردوے گیسٹ ہاؤز کی پتھریلی بنچ پر پھولوں کی جو سیج بچھا رہی تھیں اس سیج نے تم سے تمہاری مامتا چھین لی تھی ـــــ تم شانوجہ کو پیارے لال کے ساتھ کمرے میں اکیلا چھوڑ کر بھول گئی تھیں ـــــ طرفہ یہ کہ تمہیں شانوجہ پر گذرا ہوا کٹیا کا وہ اولین حادثہ بھی یاد نہ آیا جس نے تمہارے ذہن کو اتنے جھٹکے دئے تھے کہ تم پاگل ہو سکتی تھیں۔ شانوجہ کے پیار نے ہی تمہیں متوازن بنایا اور تم نے بڑی ہمت سے اس کی دیکھ بھال کا بیڑا اٹھایا ـــــ لیکن اس وقت جب تم ڈیر بالڈ کے سہارے اپنی گمشدہ زندگی کی تمناؤں کا تعاقب کر رہی تھیں، اتنا دور نکل گئی تھیں کہ شانوجہ کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی بھی تم نے زحمت نہیں کی حالانکہ ان خواہشوں اور ان تمناؤں کے پیچھے تم ہی نے بتایا تھا کہ شانوجہ کا مستقبل چھپا ہے، لیکن ـــــ

لیکن شاید ایسا نہیں تھا ــــ تم اس وقت ایک ایسی لٹی ہوئی عورت تھیں جو بازار میں لائے جانے کے بعد بھی یہ سوچتی ہے کہ کوئی خریدار اسے گھر کی زینت بنالے گا ــــ لیکن تم ایک ایسے خریدار کے ہاتھ بکیں جس نے تمہیں پھر بازار ہی میں سجا دیا اور ماں بننے کے باوجود تم اپنے اس وجود کی تکمیل نہ کر سکیں جسے ایک چھوٹا سا گھر چاہیے تھا' بچوں کی ایک قطار چاہیے تھی اور تھکا ہارا شام کو گھر لوٹنے والا شوہر۔

سوچو کو شلیا' جمیل' نیوزے' اور بردوے گیسٹ ہاؤز کے اس مثلث میں تم اپنے کتنے ہی چاہنے والوں کے ساتھ ان کی ہمدردیوں کے سہارے قدم ملا کر چل پڑی ہو۔ اس عورت کو اپنے وجود میں چھپائے ہوئے جو کسی چاہنے والے مرد کے بچوں کی ماں ہو کر رہنا چاہتی ہے۔

تم نے یہ تک نہ سوچا کہ تمہاری زندگی میں داخل ہونے والے کتنے ایسے لوگ بھی ہوں گے جنھوں نے اپنے مہینے بھر کی کمائی ایک ہی رات میں تم پر صرف کر دی ہو گی اور تمہارے آگے اس طرح سینہ تانا ہو گا کہ ان کا روزآنہ کا خرچ یہی ہے ــــ کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے باپ کی جائداد بیچ لی ہو گی یا بھائی کا حصّہ غصب کر لیا ہو گا یا بیوی کے زیور رہن کر دیئے ہوں گے یا چوری کی ہو گی۔ لیکن تم آنکھیں بند کئے ہر ظاہری چمک کے پیچھے بھاگتی رہیں ــــ جمیل' نیوزے اور بردوے گیسٹ ہاؤز کے اسی مثلث میں کہیں صمصام دین بھی تو تمہارا منتظر رہا ہے ــــ کتنی ہی مدّت تک اس نے شادی نہیں کی کہ شاید تم اس کا ہاتھ تھام لو۔ لیکن تم نے ان اندھیروں کے باوجود جن میں شانوجہ کے باپ نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر کے ڈھکیل دیا تھا کسی جگنو کی چمک نہیں دیکھی ــــ تم جگنو کی چمک سے راستہ متعین کرنے کا کام لینے کی اہل ہی نہیں رہی تھیں' تم تو پھر ان روشنیوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں جو آنکھوں کو چندھیا کر اندھیرے میں پھینک دیتی ہیں۔

تمہاری نظروں میں صمصام دین ایک اداکی ہیرا تھا ــــ جب تمہیں اس کا علم

ہوا کہ صمصام دین تمہیں بیاہنا چاہتا ہے تو کسی مذہب کی دیوار تمہارے سامنے کھڑی ہوئی نہ تھی بلکہ تم نے سب کچھ لٹا کر بھی خود کو اتنا اونچا اٹھا لیا تھا کہ صمصام دین اپنے پنجوں پر کھڑا ہو کر بھی تمہارے پیروں کو نہ چھو سکا اور تم نے ایسے قہقہے لگائے کہ ان کی گونج سارے میں سنائی دینے لگی۔ صمصام دین تضحیک کے اس زہر کو پی کر کچھ اس طرح سکڑا اور سمٹ گیا کہ اس کی کڑیل اور تنومند جوانی صرف فیروزے کا ایک بیرا ہو کر رہ گئی تو تمہیں ہر آنے والے کی بانہوں میں جھولتا ہوا دیکھ کر بھی تمہارے احکام کی تعمیل میں بھاگا بھاگا پھرتا رہا اس لئے کہ یہ اس کا فرض تھا، وہ فیروزے کا بیرا تھا ــــ ہینسن کا ملازم جسے میز پر ٹپ دے کر بھی تم اسے ذلیل کرنے کے لئے اس طرح ہنسا کرتی تھیں جیسے اس کے ذہنی دیوالیہ پن پر ترس کھا رہی ہو کہ اس نے کبھی تمہاری تمنا کی تھی۔

کوتی ہٹ دھرمی چھوڑ دو ــــ مان لو ــــ مان بھی لو کہ آج شانو جہ کا مستقبل مختلف ہوتا اگر تم صمصام دین کی ہو کر رہ سکتیں۔ تمہاری زندگی میں یکے بعد دیگرے آنے والے مردوں کے انبوہ میں صمصام دین اسی لئے تو سب سے مختلف تھا کہ وہ بھی قوتِ خرید رکھنے کے باوجود تمہیں رات بھر کے لئے خرید نہ سکتا تھا۔ اس مجبوری کے لئے اس کے دل میں تمہاری محبت کا کوئی ایسا جذبہ پنہاں تھا کہ وہ تمہیں بازار میں بکتا ہوا دیکھ کر بھی یہ سوچتا تھا کہ تم اس کے گھر کا حسن ہو، اس کے گھر کی زندگی ہو اور وہ رات جب تمہارا اس کا ساتھ ہوگا تو پھر اس رات کی کوئی ایسی سحر نہ ہوگی جو تمہیں اس سے جدا کرے۔

صمصام دین نے اپنے اسی تصوراتی پاکبازی کے نتیجے میں تمہیں کھو دیا ہے۔ شراب خانے میں مصلّے بچھا کر نماز پڑھنا تمہیں بتاؤ کوئی دانشمندی ہے ــــ ؟ تم تو وہ تھیں کہ رام مندر کو صرف اس لئے پوجا کو جایا کرتی تھیں کہ مہنت کا نوجوان لڑکا تم پر اس درجہ فریفتہ ہو گیا تھا کہ تمہارے اس کے میل کو روکنا بھگوان کے بس کا بھی روگ نہیں رہا تھا ــــ وہ تو مہنت کے دنش پر جنم جنم کی عبادتوں کی گٹھڑی تھی جو اس کے بوجھ

کے نیچے تم دب گئیں ـــــ یا پھر بھگوان اور منش کی آنکھوں کے بھید بھاؤ کا فرق جاننے والی اس کی نظریں تھیں کہ اس نے فوری بھانپ لیا اور پھر تم کبھی رام مندر کا رخ نہ کر سکیں اس لئے کہ تمہیں قتل کر دئے جانے کی دھمکی دی گئی تھی ـــــ تم نے مگر تو کچھ کیا تھا بہت ہی سمجھ داری سے کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جھیل کے یہ پیلے پھول تو تم بھگوان کے چرنوں میں چڑھا سکیں لیکن جھک کر وہ پھول اٹھا بھی نہ سکیں جو محنت کے نوجوان لڑکے نے تمہاری چرنوں میں چڑھائے تھے۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کوشلیا کہ تمہاری بنی نہیں ـــــ لیکن صمصام دین بجائے اس کے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر رات بھر کے لئے تم سے سودا کر لیتا، تمہاری پوجا کرنے لگا ـــــ جس راستے سے وہ تم تک پہنچ رہا تھا وہ اتنا طویل تھا کہ تم اس کی پہنچ سے باہر ہو گئیں ـــــ ہاتھ بڑھا کر جس شے کو حاصل کیا جا سکتا ہے اس پر للچائی ہوئی نظریں ڈال کر رہ جانا دانش مندی نہ سہی، بزدلی بھی نہیں ہے ـــــ صمصام دین بیچارا تو مصلیٰ اوڑھ کر چلا تھا اور جس وقت اس نے یہ مصلیٰ بچھایا ہے اس وقت تک قبلہ اپنا رُخ بدل چکا تھا۔

گیٹ کے لوہے کی سلاخوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹھن ٹھنا رہے تھے۔ یقیناً کوئی گیٹ پر تھا جو اسے اس لئے پیٹ رہا تھا کہ کوئی اندر ہو تو توجہ کر سکے۔

"اندھے ہیں ـــــ" کوشلیا نے دل ہی دل میں کہا ـــــ گیٹ پر پڑا ہوا تالا بھی نظر نہیں آیا ـــــ اپنے اطراف بُنے ہوئے خیالوں کے جال سے نکل کر وہ پلنگ سے نیچے اُتری اور جھانک کر دیکھا تو کوئی نوجوان جوڑا جو نیا نیا بیاہتا معلوم ہوتا تھا گیٹ کو پیٹ رہا تھا ـــــ واقعی ایک دوسرے کے نشے میں بدمست ہیں بیچارے کہ اتنا بڑا قفل نظر نہیں آتا ـــــ لیکن اس نے دیکھا کہ نوجوان عورت نے مرد کو جھنجھوڑ کر کچھ کہا تھا ا ـــــ پھر دونوں لوٹنے لگے تو مرد نے عورت کو قریب کر لیا۔

اس منظر نے کوشلیا کے ذہن پر کوئی خاص نقش نہیں چھوڑا ــــ وہ سوچ سوچ کر شاید اب تھک گئی تھی ــــ اس کو بھوک محسوس ہو رہی تھی ــــ سر درد کر رہا تھا ــــ اپنے ہی دل کی دھڑکن کنپٹی کے راستے کانوں کے پردوں پر دستک دے رہی تھیں ــــ وہ سوچنے لگی کہ صمصام دین کے متعلق اتنی دیر تک سوچ کر اس نے وقت ضایع کیا ہے ــــ سانوجہ کی جدائی میں اب وہ اس حد تک گر گئی ہے کہ صمصام دین کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچنے لگی ہے ــــ اب اس کو ایک عجیب سی جھلاہٹ ہونے لگی ــــ اسے یوں محسوس ہوا جیسے فضاؤں میں بلندی پر اُڑتا ہوا پرندہ یکایک زخمی ہو کر زمین پر آرہا اور جھاڑیوں میں پھنسا چیخ رہا ہے ــــ مرنا ہو تو انھیں بلندیوں پر مر جاؤ کوشش کہ فضا کی وسعتوں میں لے جان ہونے کے بعد پتہ بھی نہ چلے کہ جسم کہاں گرا ہے ــــ اب تم صمصام دین کے بارے میں سوچوگی ــــ؟ وہ عورت جس نے سدھے منہ ہنسن سے بات نہیں کی وہ بھلا اس کے سمیس کے لئے سوچے گی ــــ گراوٹ پر اس قدر تاسف ہوا تو وہ خود کو کمزور سی نظر آنے لگی اور بھوک نے آخرش اس کے ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

چھینکے پر دھری ہوئی ہانڈی کو اس نے اُتار کر دیکھا تو اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ کٹوری میں تھوڑا سا سالن بھی رکھا تھا ــــ اسے یاد آیا کہ صبح کو اس نے کچھ کھایا ہی نہیں ــــ کاکا ہی نے ناشتہ بنا لیا تھا ــــ اور یہاں سے جانے تک کئی بار وہ اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ کچھ کھا پی لے ــــ وہ کھانے پر جُٹ گئی ــــ ٹھنڈے چاولوں اور سرد سالن میں جس پر گھی جم گیا تھا اسے بہت مزا آیا ــــ دانہ دانہ پونچھ کر اس نے کھا لیا۔ کھانے سے پہلے اس کے دل میں شراب کی خواہش پیدا ہوئی تھی ــــ ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کے لئے اس کا جی للچایا تھا لیکن جب وہ گلاس بھر کر پانی پی چکی تو بیئر کی خواہش اس کے ذہن سے بالکل محو ہو گئی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر تولئے سے چہرہ خشک کرنے کے بعد جب وہ اپنے ہاتھ

پہنچ رہی تھی تو اس کی آنکھیں ٹکٹکی لگائے خالی خالی نظروں سے جھیل کی شفاف سطح کو گھور رہی تھیں۔ پانی کی سطح جس طرح پرسکون تھی، اس کی آنکھیں بھی کم و بیش ایسی ہی تھیں ـــــ اپنے اطراف سے بے نیاز وہ بلا کچھ سوچے پھوس کے جھونپڑے میں چلنے لگی ـــــ کھاٹ پر لگے ہوئے بستر نے ایک ذرا شسنا نے کو اُکسایا تو وہ بستر پر لیٹ گئی۔

میں شانوجہ کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں ـــــ اس نے چار دنوں میں پہلی بار سوچا ـــــ شانوجہ کے لئے اس دل میں جگہ تو زندگی بھر رہے گی۔ دل میں جگہ تو کتنوں ہی کے لئے ہے لیکن ساتھ کسی نے نہیں دیا ـــــ اس نے محسوس کیا کہ آنکھیں خشک ہوگئی ہیں تو ماتا بھی تھک ہار گئی ہے ـــــ میں جنم جنم کو کس کس کے لئے روتی رہوں گی۔ اور اس کی آنکھیں مُندھ ہونے لگیں اور پھر زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ وہ نیند کی آغوش میں بے سُدھ ہو چکی تھی۔

سوتے جاگتے اس نے ایک آدھ بار شانوجہ کو کبھی خواب اور کبھی تصور میں دیکھا بھی لیکن بیداری اور خواب کی سرحدیں اب ایک دوسرے سے مل چکی تھیں ـــــ گہری نیند سو جاتی پھر نیم خوابی کے عالم میں کروٹ بدل لیتی اور پھر دنیا سے بے ہو جاتی ـــــ اس کی نیند پوری طرح اس وقت ٹوٹی جب اس نے خواب میں دیکھا کہ شانوجہ خوب صورت سی دلہن بنا اپنے دولہا کے گھر جا رہا ہے ـــــ پھر بارات کے لوگوں نے چلاّنا شروع کیا ـــــ دُلہن لڑکی نہیں ہے لڑکا ہے ـــــ یہ تو مرد ہے ـــــ مرد ہے یہ' اور جب اس کی آنکھیں اس کے ذہن کے ساتھ بیدار ہو رہی تھیں تو اس نے دیکھا کہ شانوجہ کا باپ کھائی کے مُنہ پر کھڑا پیلے گلاب کھائی میں پھینک رہا ہے۔ پھر وہ آنکھیں مل کر پلکیں جھپکانے لگی ـــــ پھوس کی چھت سے اس کی نظریں ٹکرائیں ـــــ اس نے کروٹ لی' اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور کاکا اس کی طرف پشت کئے ہوئے اسٹوو کو پمپ کر رہا تھا جس کی آواز وہ سُن رہی تھی۔ پھر اسٹوو پر نیلے اور ہرے رنگ کا شعلہ تھرک رہا تھا اور کاکا نے اُٹھ کر

کیتلی اسٹوو پر رکھ دی تھی۔

"کب آئے ہو ؟" کوشلیا نے بڑی نرمی سے پوچھا

"دیر ہوئی۔" کاکا نے اس کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"کس طرح آسکے ہو ؟"

"گیٹ پھلانگ کر۔"

"کیا کر سکے کاکا ؟"

"کچھ نہ کر سکا۔۔۔۔" وہ نظریں جھکائے ہوئے کہتا گیا جیسے قصور وار ہو۔ وہ اب برہمن بستی چھوڑ چکا ہے لیکن آج ہی رات کے کسی حصے میں یہاں آجائیگا۔ بر دوسے گیسٹ ہاؤز کا کوئی کمرہ پٹھانوں کے سردار نے اپنے لئے محفوظ کروا رکھا ہے۔۔۔۔ وہ رات اسی کے ساتھ ٹھہرے گا۔۔۔۔ صمصام دین نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔۔۔۔ میں نے شانوبہ کو دیکھا ہے۔۔۔۔ تم بھی دیکھوگی تو پہچان نہ سکوگی۔ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن خانوں کے سردار نے مجھے اجازت نہیں دی اور نہ شانوبہ ہی اس پر راضی ہوا۔۔۔۔ زنانے لباس میں وہ بالکل تمہاری طرح لگتا ہے۔۔۔۔ مجھے تو اس حد تک دھوکا ہوا کہ میں سمجھا تم آگئی ہو لیکن منٹ بھر میں میری غلط فہمی دور ہو چکی تھی۔

کیتلی میں چائے کی پتی ڈال کر کاکا نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور کوشلیا کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیا کہ جس وقت وہ لوٹا ہے یہ خط اسے گیٹ کے اندر احاطے میں پڑا ہوا ملا۔۔۔۔ ساتھ ہی کاکا نے کوشلیا کے آگے تجویز پیش کی کہ گیٹ کے پاس ایک لیٹر بکس لگا دینا چاہئے ورنہ ڈاکیہ کتنے ہی خطوط اس طرح ضائع کر دے گا۔۔۔۔ کاکا نے کچھ اس بھولپن سے یہ بات کی کہ کوشلیا زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ لے دے کر اس کے پاس دو ہی آدمیوں کے خطوط آتے ہیں۔ ایک ڈیر بالڈ کے دوسرے پنڈت پرشاد کے جو اس کے بچپن میں

اس کا اتالیق تھا اور جو آج بھی اپنا دکھ درد لکھ کر اس سے پیسے منگواتا رہتا ہے کبھی کبھی کوشلیا کے نام اُلٹے سیدھے ناموں سے ایسے خطوط بھی آتے جن میں اُس سے عشق جتایا جاتا یا پھر فحش مذاق کیا جاتا ۔

کوشلیا نے خط کی تحریر پر نظر ڈالی اور پہچان گئی کہ یہ ڈیر بالڈ کا خط ہے —— لکھا تھا ۔

دشمنِ ہوش، مری کوش —— پیار

چوتھے دن تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں —— اس چکر میں بھی تمہارے لیے ٹرانسسٹر نہ لا سکوں گا —— وہ دوست ہی غائب ہے جو اسمگل کرتا تھا لیکن ایک ایسی چیز لا رہا ہوں کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔ اس دن تم بلا شرکتِ غیرے میری رہو گی —— کسی سے کوئی انگیج منٹ نہ کر بیٹھنا —— شانو جبہ سے متعلق تمہارا خط پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ تم بہر حال ماں ہو —— صبر کرو —— تمہارے اس دکھ کے ساتھ میرے ذہن میں تمہارے پیارے لال کا چہرہ اُبھر آیا ہے جسے تم "رڈش ڈیر" بھی کہتی تھیں —— ایک بار راستے پر ملا تھا —— پھول کر بنگلی بھینسا ہو گیا ہے —— کہہ رہا تھا کہ شہر کے کسی بڑے گنہ دار کے ساتھ مل کر کاروبار کر رہا ہے —— اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ کوئی چار بار بردوے گیسٹ ہاؤز جا چکا ہے —— فیوزے میں پی ہے، بردوے میں ٹھہرا ہے اور تمہیں یہ جان کر دکھ ہوگا کوش کہ وہ شانو جبہ سے ملتا رہا ہے —— حیرت ہے کہ تم نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا —— کہنے لگا کہ ایک دن خسر اور داماد مل کر ملیں گے۔ —— یعنی وہ اور میں۔ میں پہلے تو اس کی یہ بات سمجھ نہ سکا اور مجھے اس کا مذاق چونکہ کھل گیا تھا اس لئے ذرا ترشی سے وضاحت چاہی —— بڑے ہی اطمینان سے اس نے کہا کہ —— تم شانو جبہ کے باپ ہوتے ہو نا اس لئے کہ شانو جبہ کی ماں سے تمہارا یارانہ ہے اور جب شانو جبہ سے میرے تعلقات ہیں تو کیا میں تمہارا داماد نہیں ہوا —— ؟ عجیب
[illegible] کہتا تھا ساس صاحبہ کو سلام لکھو۔

شانوجہ کے حسن کی تعریف میں اس طرح کرتا ہے کہ تم سنو گی تو شرما جاؤ گی۔ خیر چھوڑو بھی
تم اپنی صحت کا خیال رکھو ——— کڑھنے، جلنے اور برباد ہونے سے کیا ملے گا بھلا ———
یہی نا کہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاؤ گی ——— زندگی کے ایک ایک سانس کو چھوٹی چھوٹی
مسرتیں بٹورنے کے لئے وقف کر دو ——— شانوجہ اب اتنا آگے جا چکا ہے کہ تم اس کو
اب واپس نہیں لا سکتیں ——— ہاں شہر میں ایک بار تمہارا فیوزک ہینس بھی ملا تھا ——— ویسے
جب سے اس نے VAN خریدی ہے کبھی کبھی ہفتے کے روز علیک سلیک ہو ہی جاتی
ہے ——— پرسوں ملا تو بطور خاص وین روک لی۔ فیوزے کے لئے بہت سا سامان
لے جا رہا تھا ——— کہنے لگا یہ سب آپ ہی لوگوں کے لئے ہے۔ بہت دنوں سے آپ نے
اُدھر کا رُخ نہیں کیا ——— کہنے لگا کب آئیے گا ——— میں نے اسے بتایا کہ بہت جلد آ رہا
ہوں ——— پیارے لال کے بیانات کی تصدیق بھی فیوزک ہینس سے میں نے باتوں
باتوں میں کر لی ہے ——— تمہارے متعلق اس نے ایک رکیک ریمارک کیا ——— کہنے لگا
اب تو تم خود بھی کماتی ہو اور بیٹے کو بھی کمائی کے لئے تیار کر دیا ہے ——— میں نے تردید
کی ہے اور منہ دیکھی بات نہیں، تمہاری جتنی تعریف کی جا سکتی تھی میں نے کی ہے۔ اس لئے
کہ تم ہو تعریف کے قابل ——— شانوجہ کے معاملہ میں، میں نے بتایا کہ تم بالکل بے قصور
ہو ——— لیکن وہ کہتا ہے کہ میں تمہاری شاطرانہ چالوں کو نہیں سمجھتا ——— یہ دنیا
ہے۔ جتنی منہ اتنی باتیں ——— تم کس کس کا بُرا مانو گی ——— تم نے کتنے ہی بار اپنے دل
کے نازک شیشے کو پتھروں سے ٹکرایا ہے ——— اب کچھ یوں کرو کہ اس شیشے ہی کو پتھر بنا لو۔
اسی میں تمہاری سلامتی ہے، بہتری ہے ——— میں نے دیکھا ہے کہ دنیا حساس لوگوں کا
جہنم ہے ——— جتنی سفاک بن سکتی ہو بن جاؤ، خوش خوش جی سکو گی۔

اچھا ——— اچھا میں تم سے مل رہا ہوں ——— بہت جلد ——— انتظار کرو گی نا۔

تمہارا

پیارا اگنجا، ڈیئر ڈاکٹر سعید الزمان

کوشلیانے خط ختم کیا تو آنچل سے اس کو آنسو خشک کرنے پڑے۔

"کس کا ہے ——؟" کاکا نے بھانپ کر پوچھا اور چائے کی پیالی کوشلیا کی طرف بڑھا دی۔

پیالی لیتے ہوئے کوشلیا نے کہا —— "ڈیر بالڈ کا۔"

"سعید زماں کا ——؟"

"ہاں کاکا ——"

"اس نے اپنا کیا دُکھ درد لکھا ہے کہ تم رونے بیٹھ گئیں —— تم کس کس کو روؤ گی؟"

کوشلیا نے کاکا کو کوئی جواب نہیں دیا —— نظر بھر کر کاکا کو پیار سے دیکھا —— کاکا کی باتوں سے ڈیر بالڈ کے خط کی طرح چاہت کی بو آتی تھی —— اس نے آنسو پونچھ کر ایسی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلائی جو نہ اتنی جاندار تھی نہ بالکل بے جان۔

صحن کے گیٹ پر آہٹ پا کر کاکا باہر نکل گیا تو کوشلیا نے کھاٹ کے نیچے سے اپنی پیٹی کھینچ کر باہر نکالی اور ڈیر بالڈ کا خط اس میں محفوظ کر دیا۔ لیکن اس کا جی چاہا کہ خط کو پھر ایک بار پڑھے —— اس نے خط نکال کر چولی میں اڑس لیا اور پیٹی کو کھاٹ کے نیچے ڈھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی ——

باہر صحن کی طرف کوشلیا نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ کاکا اس جوڑے کو گیٹ کے اندر لا چکا ہے جو پہلے گیٹ پیٹ پیٹ کر اور پھر قفل دیکھ کر لوٹ گیا تھا۔

لڑکی کا چہرہ، چال اور قد و قامت بے انتہا پُر کشش تھے، اتنے کہ کوشلیا نے دیر تک اپنی نظریں اسی پر جمائے رکھیں۔ پھر اسے لڑکا بھی اچھا لگا۔ بجلی اور بادل —— اس کے ذہن میں کسی بھولی بسری یاد کی ایک لہر سی اٹھی اور ماضی کے سمندر میں گم ہو گئی —— وہ جب شانو بہو کے باپ کے ساتھ شہر بھاگ آئی تھی تو ایک ریلوے اسٹیشن پر کسی بڑھیا مسافر نے بڑے چاؤ سے انھیں دیکھ کر کہا تھا —— "کیسی پیاری جوڑی ہے ——

میں نے بال سفید کر لئے لیکن آج تک ایسی جوڑی نہیں دیکھی۔ بیوی بہت حسین ہوتی ہے تو شوہر اس کے برابر میں نہیں جچتا۔ بعض اچھے وجیہہ اور شاندار شوہروں کی بیویاں گول مول اور بے ہنگم سی ہوتی ہیں لیکن جوڑی ہو تو ایسی ہو کہ جیسے بھگوان نے ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا ہو۔

اور کوشلیا نے ایک روپیہ کا کرارا نوٹ اس بڑھیا کو ٹرین سے اترتے وقت دیا تھا۔

جب وہ لوگ پھوس کے جھونپڑے کے قریب آ گئے تو کوشلیا دروازے کی اوٹ سے ہٹ آئی تاکہ وہ اسے دیکھ نہ سکیں۔ اس کے ذہن میں اپنی وجاہت اور حسن کا احساس بیدار ہو چکا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس ہیئت گدائی سے ان کے سامنے جائے جب کہ نہ اس کے بال درست تھے نہ چہرے پہ پھبن تھی۔

وہ اندر کھسک آئی لیکن اس نے دیکھا کہ یہ جوڑا دروازے کے پاس آ کر رک گیا تھا اور دونوں ہی کاکا کے سلیقے کو سراہ رہے تھے۔ اس نے لڑکی کی آواز سنی۔

"ایسی جھونپڑی ملے تو بس خوشی خوشی رہ جاؤں"

یہ اس کا ساتھی نوجوان کہنے لگا۔ "یہ جھونپڑا کہاں ہے یہ تو اچھا خاصہ چھوٹا سا گھر ہے۔ بےحد خوبصورت سا۔ پھوس کے چھت پر پھیلی ہوئی یہ لال لال گچھے دار پھولوں کی بیلیں یہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں۔ یہ قطار باندھ کر گھیرے ہوئے پیلے گلاب۔ یہ کیاریاں یہ پھل۔ یہ منظر تو ایک جیتا جاگتا رومانس ہے۔ لولی" (Lovely)

"آپ ہمیں اپنے پاس رکھ لیجئے نا۔" بانکی لڑکی نے بڑی ادا سے کاکا کو مخاطب کر کے کہا۔

کوشلیا نے جب یہ باتیں سنیں تو اس کا جی چاہا کہ چیخ پڑے۔ تم خدا کے لئے یہاں مت رہنا۔ بھگوان کی سوگند اس خیال ہی کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ مذاق میں بھی ایسا نہ سوچو۔ وہیں واپس جاؤ جہاں سے آئے ہو۔ یہاں میں نے بھی ایسی

ہی باتیں کی تھیں ــــ کا کا نے مجھے اور شالوجہ کے باپ کو اس خوب صورت سی کٹیا میں اس طرح جگہ دی تھی جیسے اپنے دل میں جگہ دے رہا ہو ــــ لیکن آج جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو کھل کر رو بھی نہیں سکتا ــــ تمہیں معلوم نہیں پھر یہی گچھے دار پھول کی بیلیں سانپ بن کر تمہیں ڈسیں گی۔ یہی پیلے گلاب خار بن کر تمہیں چبھیں گے۔ یہ مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچائیں گے بلکہ آنسوؤں کے کنکر بہتے کے لئے تمہاری آنکھوں میں کھٹکنے کے لئے چھوڑ دیں گے۔ یہاں جب لڑکی ماں بننے کو ہوتی ہے تو کھائی میں چھلانگ لگا کر وہ خود کو چھپا لیتی ہے اور۔ اگر ماں بن چکی ہے تو وہ بچہ نہیں پیدا کر لی شالوجہ پیدا کرتی ہے ــــ تم شالوجہ پیدا کر سکو گی ــــ ؟ تم میں اتنی ہمت ہے کہ تم شالوجہ پیدا کر سکو اور اس کی ماں کہلاؤ۔

اور کوشلیا سسک سسک کر رونے لگی ــــ اس نے چاہا کہ اپنی سسکیوں کو اس طرح دبائے کہ نوجوان جوڑا سن نہ سکے کہ کوئی جھونپڑی کے اندر سسک رہا ہے۔ اس جھونپڑی کے اندر جس کی چھت پر گچھے دار لال پھولوں کی بیلیں ہیں ــــ جو قطار در قطار پیلے گلابوں سے گھری ہوئی ہے جس کے آس پاس رنگ برنگی پھولوں کی کیاریاں پھیلی ہوئی ہیں ــــ جس کے سامنے جھیل ہے اور جھیل میں ڈولتا ہوا بجرہ ہے۔

وہ کامیاب تھی ــــ نوجوان جوڑا جھیل کی طرف بڑھ چکا تھا ــــ اس نے کوشلیا کی سسکیاں نہیں سنی تھیں۔

بجرے میں جھیل کی سیر کر کے جب یہ جوڑا جا چکا تو کا کا نے کوشلیا سے کہا۔

"منہ ہاتھ دھو کر تازہ ہو جاؤ کوش۔ لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ویسے تیرا جی نہ چاہے تو لوگوں سے نہ ملنا ــــ لیکن باہر نکلنے اور جھیل کی سیر کرنے سے شاید تیرا من بہل جائے۔"

کا کا نے ابھی بات بھی ختم نہیں کی تھی کہ کوشلیا نے چولی میں اپنی دو انگلیاں ٹھونس کر ڈیہ بالڈ کا خط نکالا اور پھر پڑھنے لگی۔

دشمن ہوش میری کوشی — پیار
چوتھے دن تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں — اس چکر میں بھی
تمہارے لئے ٹرانسسٹر۔ . . .

معاً کوشلیا کو خیال آیا، وہ چوتھا دن آج ہی تو نہیں ہے اور اس نے خط پر تاریخ دیکھی۔

امید کی ایک کرن سی اس کے نہاں خانۂ دل کے تاریک تر گوشہ میں بھی جا پہنچی جب اس نے انگوٹھے اور چھنگلی کو جوڑ کر حساب لگایا کہ آج کا دن ہی چوتھا دن ہے۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اسے ڈیربالڈ پر غصہ بھی آیا کہ وہ ہمیشہ ہی اپنی آمد کی صحیح اور قطعی تاریخ نہیں لکھتا۔ دوسرا دن، چوتھا دن، پانچواں دن، بھلا یہ بھی مارچ کے تعین کا کوئی انداز ہوا — لیکن ایک بھولی بھٹکی مسکراہٹ بھی جانے کہاں سے اس کے ہونٹوں پر آ گئی — ایسی حرکتیں ڈیربالڈ دانستہ کرتا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر مسکرا پڑی۔ جس روز آنا ہوتا ہے اگر وہ نہیں آتا ہے تو دوسرے دن ضرور دھمک جاتا ہے اور پھر حساب جوڑ جوڑ کر کوشلیا کو قائل کرتا ہے کہ وہ وقت پر پہنچ گیا ہے اور بالکل بے قصور ہے اور کوشلیا کا سچا بہی خواہ، چاہنے والا اور وفادار ہے۔

ڈیربالڈ کی شرارتوں نے دن بھر میں پہلی مسکراہٹ تو دے ہی دی۔ کوشلیا نے ڈیربالڈ کی حمایت میں کچھ اسی طرح سوچا اور آج اس کی آمد کی جو امید سی بندھی تو وہ دل ہی دل میں بڑی حد تک مطمئن اور مسرور ہو گئی۔

اپنے چہرے پر ٹھنڈا پانی اچھالتے ہوئے وہ تصورات کے تانے بانے میں مقید ہو چکی تھی۔ اس کے لئے یہ بات بڑی حد تک اطمینان قلب کا باعث تھی کہ آج ہی رات کوشا لوجہ بھی آ رہا ہے — کاکا نے بتایا ہے کہ وہ بھی بردوسے میں ٹھہرے گا ایسے میں ڈیربالڈ کی آمد اس کے لئے تقویت اور ہمت کا باعث تھی — ڈیربالڈ سے کہہ کر میں بھی بردوسے میں ہی ٹھہر جاؤں گی — اس نے سوچا، اس لئے کہ

ڈیر بالڈ کچھ دن سے جب بھی ادھر آتا کوشلیا کے پاس جھونپڑے ہی میں ٹھہرنے لگا تھا۔
لیکن یہ بات صرف ڈیر بالڈ ہی کے لئے مخصوص تھی۔

مُنہ ہاتھ دھو کر جب کوشلیا اُٹھی تو اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی پھر اس کا جی چاہا کہ گنگنائے ـــ لیکن وہ گنگنا نہ سکی۔

پھر کچھ سوچ کر بجائے اس کے کہ آئینے کے مقابل ہو کر وہ سنگھار کرنے لگتی اس نے غسل خانے کا رُخ کیا ـــ وہ دیر تک نہاتی رہی۔ نہا دھو کر جب وہ آئینے کے سامنے آئی تو اپنے لمبے لمبے بالوں کو تولئے میں لپیٹ کر وہ گنگنا رہی تھی۔

ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

پہلا مصرعہ ذہن پر بار بار ڈالنے کے باوجود اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

ڈیر بالڈ کا پسندیدہ یہ شعر جب بھی وہ ترنگ میں ہوتا اپنی بے سُری آواز میں لہک لہک کر گاتا تھا اور کوشلیا ہنس ہنس کر داد دیتی تھی۔

کپڑے پہن کر بال سنوارتے ہوئے اپنا عکس آئینے میں اس نے دیکھا ـــ وہ آج بھی کتنی بجلی ہے۔ دیکھے جانے اور چاہے جانے کے لائق۔ لیکن اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی ـــ جب کاکا کی کہی بات اسے یاد آئی ـــ

زنانے لباس میں شانو جو بالکل تمہاری طرح لگ رہا تھا ـــ "مجھے تو اس حد تک دھوکہ ہوا کہ میں سمجھا تم آ گئی ہو۔"

شانو تو نے جب دنیا میں آنکھیں کھولیں تو میری زندگی میں کیسے اُجالے بکھر گئے تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ تیرا باپ جس نے جنم جنم تک میرا رہ کر زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی تھیں مجھے یوں تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلا جائے گا کہ مجھے اپنے وجود میں چھپائے ہیں اپنے گھر بھی نہ لوٹ سکوں گی جہاں میری ماں مجھے رو رہی تھی۔ جہاں شہتوت کا وہ درخت مجھے رو رہا تھا جس پر میں کالج سے لوٹ کر چڑھ جاتی تھی اور لال لال کالی کالی شہتوتیں توڑ توڑ کر مزے سے کھاتی تھی ـــ میرے چھوٹے سے

کھڑکی وہ کھڑکی مجھے رو رہی تھی جس کی ٹھنڈی سلاخوں کو اپنی ہتھیلیوں سے چھو کر میں ایک گدگدی سی محسوس کرتی تھی اور پھر اس کھڑکی میں بیٹھ کر سامنے شنٹنگ کرتے ہوئے انجنوں اور دندناتی گزرتی ہوئی ٹرینوں کو دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی کہ لوگ اس تیزی سے زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ انھیں اپنی ذات سے متعلق سوچنے کی فرصت بھی نہیں ملتی — اور ہاں وہ تیلی راجہ جو اک تارے پر رام لیلا گاتا تھا — عمر کے تفاوت کے باوجود بھی وہ میرا کیسا دوست تھا۔ میں چپکے سے ماں کے صندوق سے پیسے اڑا لاتی اور اس کی بند مٹھی میں رکھ دیتی — وہ بھی تو کبھی مٹھی کھول کر دیکھنے کی زحمت نہ کرتا اور اک تارا چھیڑ کر بھجن گانے کے لئے بیٹھ جاتا — اس کی آواز باریک سی تھی لیکن کیسی رسیلی تھی — کبھی کبھی تو پیسے نہ ہوتے تو میں اس کی مٹھی کھول کر اس طرح اس کی ہتھیلی میں چٹکی بھرتی جیسے پیسے جما رہی ہوں اور پھر خود ہی مٹھی بند کر دیتی تھی — وہ مسکراتا خالی ہاتھ اس طرح اپنی لمبی کرتی کے جیب میں ٹھونس کر خالی کر دیتا جیسے وہ ریزگاری سے بھرا ہوا تھا — اور پھر اک تارا چھیڑتا — ماں بھی پلو سر پہ ڈال کر میرے پیچھے کھسک آتی۔ اور ہاں وہ شریر لونڈا جس کی ماں میری ماتا جی کے پاس آتی جاتی تھی کیسے دیدے مٹکا مٹکا کر مجھ سے کہا کرتا تھا — مجھے بالکل اپنی جیسی تتلی لا دو یا یا پھر تم ہی اتنی چھوٹی ہو جاؤ کہ میں تمھیں بیاہ سکوں — یہ باتیں اس کی ماں نے ہی سکھائی تھیں — سنتی ہوں کہ ماں مر گئی ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ماں کی اس سہیلی نے آخری وقت تک اس کی نگرانی کی ہے — میری ماں کو میرے غم نے ہی تو مارا ہے شانو جو لیکن میرا دل نہ پسیجا۔ کیسی شرم دامن گیر تھی — تجھے پیٹ میں چھپا کر بھی تو میں اپنی ماں کے سینے سے لگ کر رو سکتی تھی۔ سارے پاپ ڈھل جاتے — اور نہ بھی ڈھلتے تو کیا ہو جاتا — غم کے وہ بادل تو دل پر سے چھٹ ہی جاتے آج جن کے سائے میں کتنے ہی انجان راستوں پر میں بھٹک گئی ہوں۔

اوران راستوں پر مجھے صرف تمہارا ہی تو سہارا تو تھا شانوجہ لیکن تم نے بھی اچھا کیا۔
۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کرم ہے ۔جو جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے ۔ماں نے تڑپ
تڑپ کر پتہ نہیں مجھے کیسی بد دعا دی تھی کہ تو آج مجھے رُلا رہا ہے۔ چلو یوں ہی سہی
۔۔ اس جنم کی ساری محرومیاں بٹور کر میں اگلے جنم کی تیاریاں کر لوں گی لیکن اس طرح
جی لینا بھی تو سہل نہیں ہے۔

رنج و غم کے وہ بادل جو تین روز سے کوشلیا کے سر پر سایہ فگن تھے ذرا کی
ذرا چھٹے تھے ۔۔۔ خوشی کی تازہ اور نرم دھوپ اس کے وجود میں پھیلی تھی اور
نہانے کے بعد مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر چھا گئی تھی، پھر یہی نرم دھوپ
آدار کا جادو بن کر پھوس کے جھونپڑے میں تیرتی پھر رہی تھی کہ شانوجہ نے
کوشلیا کو پھر اُداس کر دیا ۔۔۔ اپنے اندر چھپی ہوئی اس دھوپ چھاؤں کی
کیفیت کو ابھی وہ جھٹلا بھی نہ سکی تھی۔

کاکا نے جھیل کی سیر کرا کے اس نوجوان خوب صورت جوڑے کو گیٹ تک
چھوڑ دیا تو خود ہی دو پیلے گلاب جاتے وقت اس نے ان کی نذر کر دیئے کیونکہ
اپنے اس فرض کو ادا کرنے کے لئے کوشلیا ابھی تک چمن میں نہیں آئی تھی ۔۔۔
نوجوان جوڑا چلا گیا تو کاکا کٹیا میں چلا آیا ۔۔۔ کوشلیا سج دھج کر باہر ہی آ رہی تھی
کاکا نے اس کو اس عالم میں دیکھا تو اس کو کوشلیا سے اپنی خوشیاں چھپانی
پڑیں ۔۔۔ دعائیں دے کر کاکا نے صرف اتنا کہا کہ دکھ درد کا ہنس ہنس کر
مقابلہ کرنا چاہئے کوشی ۔۔۔ کوشلیا نے کاکا کی بانہہ پکڑ کر اس کو چمن سے
واپس لاتے ہوئے کہا۔

"آج ڈیر بالڑ آ رہا ہے ۔۔۔ آج اس کے ساتھ میں نے سوچا ہے کہ
میں بھی بر دوسے چلی جاؤں تا کہ شانوجہ کا وہیں انتظار کر سکوں۔ اپنی آنکھوں سے

دیکھوں بھی کہ وہ کس کے ساتھ آتا ہے۔"

"تم کیا کرو گی دیکھ کر ـــــ اسے دیکھ کر تمہیں زیادہ ہی دکھ ہوگا ـــــ وہ کسی کے ساتھ آئے تمہیں کسی سے الجھنا نہیں چاہئے۔ خاموشی سے اس کا انتظار کرو تاکہ وہ یہاں واپس آجائے۔"

"میں کچھ نہیں کروں گی کاکا۔ دیکھوں گی کہ وہ مجھ سے آنکھیں چار کر سکتا ہے یا اتنا سفاک ہو گیا ہے کہ اپنے کئے پر اس کو کوئی پچھتاوا نہیں ـــــ آج مجھے اپنی ممتا کا امتحان لینا ہے کاکا۔ آج مجھے دیکھنا ہے کہ شانوجہ کے لئے میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں یا خود اپنے بارے میں مجھے کوئی فیصلہ . . . . شانوجہ میری زندگی ہے ـــــ میں نہیں جانتی کہ اپنی اس زندگی سے مجھے کیا سلوک کرنا ہے ـــــ تم ٹھیک ہی کہتے ہو کہ اس سے بردوسلے میں مل کر مجھے زیادہ ہی دکھ ہوگا ـــــ لیکن اب دکھ درد کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے کاکا۔"

کوشلیا ہارے ہوئے جواری کی طرح مسکرائی، اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب توڑ لینا چاہا تو کانٹا اس کی انگلی میں چبھ گیا۔ انگلی کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا کر اس نے سرخ خون کی ایک بوند نکالی اور آنچل سے خون پونچھ کر اپنا لب زبان سے انگلی کے ننھے سے زخم کو لگا دیا جس میں سوزش ہو رہی تھی ـــــ پھر گلاب توڑ کر سونگھتے ہوئے اس نے کاکا سے پوچھا "تم نے شانوجہ کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں بتلایا۔"

"میں بتلا بھی کیا سکتا ہوں ـــــ صمصام دین کے بتلائے ہوئے پتہ پر پہنچ کر میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی۔ کہلا بھیجا کہ شانوجہ سے ملنے اس کا کاکا آیا ہے۔ مجھے ٹکا سا جواب دے دیا گیا کہ یہاں کوئی شانوجہ نہیں ہے اور یہ خانوں کے سردار کا گھر ہے۔ میں نے پہرہ کے ایک جوان سے میتر تا بڑھائی۔ اس کو ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھلایا، چائے، پان اور سگریٹ سے اس کی تواضع کی۔

اس نے بتایا کہ سردار آج شہر واپس جا رہا ہے اور وہ خوب صورت سی لڑکی جو اس کے ساتھ ہے وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ سردار دل کا لاکھا آدمی ہے ــــ پہرہ دار نے مجھے بتایا ــــ "کاکا کہہ رہا تھا اور کوشلیا بہ تن گوش تھی ــــ "لونڈیا کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی پٹاخہ ہے، بڑی پیاری۔ خان نے بہت کچھ دیا ہوگا۔ خان ہی کے موٹر پر سنا ہے کہ آج وہ اس کے گھر بھیجی جائے گی۔ خان کا کوئی منہ چڑھا اسسٹنٹ ہے وہ اسے پہنچانے کے لئے آئے گا ــــ خان بڑا گتہ دار ہے۔ بڑی بڑی سرکاری عمارتیں خان ہی نے بنوائی ہیں۔ برہمن بستی میں جذامیوں کا جو دواخانہ بن رہا ہے وہ بھی خان ہی بنوا رہا ہے۔ یہ دواخانہ برہمن بستی سے چار ساڑھے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ خان کی نئی معشوقہ کچھ ہی دیر ہوئی خان کے ساتھ اسی نئی عمارت کو دیکھنے گئی ہے۔

"میں نے چپ رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اس پہرہ والے کو جس کا نام شاید کلیم خان تھا میں نے اتنا بتلایا کہ میرا اپنا نواسہ یہاں کسی خان کے گھر میں ملازم ہے۔ میں اسی سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اس پر کلیم خاں نے مجھے خانوں کے دوسرے گھروں کے پتے دیئے ساتھ ہی یہ بھی بتلایا کہ اب اس بستی میں کوئی خان ایسا خوش حال نہیں ہے جو بھاجی ترکاری کے لئے کسی چھوکرے کو ملازم رکھے۔ ویسے سود کا پیسہ ان گھرانوں میں بھی کم نہیں لیکن دل ہر ایک کے پاس کہاں ہوتا ہے۔

"ہوٹل سے نکل کر میں پھر پہرے والے کلیم خاں کے ساتھ باتیں کرتا سردار کے گھر تک پہنچا۔ راستے میں باتوں باتوں میں اتنا تو معلوم ہو سکا کہ سردار کی نئی معشوقہ یہیں چار چھ میل دور کسی پُرفضا مقام پر رہتی ہے۔ کلیم خاں کو اس مقام کا نام یاد نہیں تھا ــــ اس نے بتایا کہ اس مقام کی بہت سی باتیں سنی ہیں۔ سنا ہے کہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ ہر اتوار کو بہت سے لوگ دور دور سے سیر کو آتے ہیں۔ مسافروں کے ٹھہرنے کو جھیل کے کنارے اچھا سا بنگلہ ہے۔ میں ادھر جانے کی سوچتا ہوں۔ اس بستی میں

زیادہ پرانا آدمی نہیں ہوں۔ شہر میں رہتا ہوں۔ سردار کے بنگلے پر ملازم ہوں۔ وہ میرے کام سے خوش ہے۔ مجھے ترقی دے کر یہاں لے آیا ہے۔ میں یہاں کے پہرہ داروں کا حوالدار ہوں۔ سردار مہینے میں چار چھ بار یہاں ضرور آتا ہے۔ جذام کے دواخانے کے کام کا معائنہ کرتا ہے اور مزدوروں میں اپنے مواجبہ میں مزدوری تقسیم کرواتا ہے۔ دل کا اچھا ہے' نظر کا اچھا نہیں۔ مزدوروں کو ان کی ضروریات پر بخشش رقومات دے دیتا ہے لیکن کسی کی بہو بیٹی پر بری نظر ڈالنا بھی تو شرافت نہیں ہے ــــ اپنے ہی ماتحتین میں کسی کی بہو بیٹی پر بری نظر ڈالنے میں بھی اس کو عار نہیں ــــ یہی ایک بات بری ہے ــــ مہینہ بھر پہلے وہ کسی برہمن لڑکی کو لے آیا تھا ــــ مگر اس عشق میں خان کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی ــــ پولس کے پیچھے بہت سا پیسہ گل گیا تب کہیں جاکر بات دبی۔ لڑکی کے ماں باپ بھی شہر کے کھاتے پیتے لوگ تھے ــــ لیکن لڑکی جتنے دن یہاں رہی میں تمہیں ایمان کی بات بتلا دوں' خوش رہی۔ میں نے اس کو کبھی اداس نہیں دیکھا ــــ بس یہ اس لئے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی بھی راضی خوشی تھی ــــ مگر اس کے والدین نے اغوا کا کیس بنا کر خان کو پریشان کیا لیکن خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس نے پولیس ہی کو خرید لیا۔

"ہم یہی باتیں کرتے سردار کے گھر تک پہنچے تھے کہ بڑا سا موٹر آتا ہوا نظر آیا۔ کلیم خاں نے مجھے ادب سے کونے میں ہٹ کر ٹھہر جانے کو کہا اور خود پہرہ داروں کی طرح اٹن شن ہو گیا۔"

موٹر جب گیٹ میں داخل ہونے لگا تو وہ بہت آہستہ سے گھوم رہا تھا۔ میں نے شافوجہ کو اچھی طرح دیکھا ــــ وہ لال ساری میں پیاری سی دلہن نظر آتا تھا۔ بالوں کا جوڑا باندھ کر اس نے جوڑے میں پھول لگا رکھے تھے ــــ موٹر تیزی میں ہوتا اور اگر میں اس کی صرف جھپک دیکھ سکتا تو میرے لئے پہچاننا مشکل

تھا ــــ مشکل تو مجھے اس وقت بھی ہوئی لیکن خود شانوجہ نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کی نظروں نے مجھے اس کو پہچان لینے میں مدد دی"

کاکا اس کے بعد خاموش ہو گیا۔

کوشلیا کہنے لگی ــــ

"اور وہ آج رات یہاں پہنچ رہا ہے ــــ خان کا اسسٹنٹ اس کو چھوڑنے کے لئے یہاں موٹر پر لائے گا۔"

کوشلیا نے شانوجہ کی کہانی کو ان دو جملوں پر ختم کر دیا جسے اب تک کاکا سُنا رہا تھا لیکن یہ دو جملے کوشلیا نے اس طرح ادا کئے جیسے کراہ رہی ہو۔

لمبی سیاہ زلفیں جو کہ اب خوب صورت جوڑے میں تبدیل ہو کر پھولوں کی منتظر تھیں اس لئے کوشلیا نے جوڑے میں اس گلاب کو ٹانک لیا جسے شانوجہ کی روداد سننے کے درمیان وہ سونگھتی رہی تھی ــــ اسے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ یہ پھول کاغذی ہو گئے ہیں۔ ان میں کوئی خوشبو نہیں ہے۔ اس لئے دو اور خوب صورت سے گلاب اس نے توڑ لئے اور بغیر سونگھے جوڑے میں سجا کر چمن میں اس طرح اِدھر اُدھر دیکھا جیسے ہرنی اپنی ٹکڑی سے بچھڑ کر دیکھتی ہے۔

گچھے دار لال پھولوں کی ہری بیل کے پیچھے جو چمن کے حصار کی طرح اطراف میں پھیلی ہوئی تھی صمصام دین اسے گیٹ کی طرف آتا ہوا نظر آیا ــــ وہ بہت تیز تیز اس طرف کو آ رہا تھا ــــ گیٹ میں داخل ہوا تو کوشلیا مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

صمصام دین اس التفات پر جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا ــــ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا کوشلیا نے اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"سم تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہاری ہمدردیوں کے جواب میں کچھ کہہ سکوں۔"

"خاموشی سے کسی بات کا اعتراف کر لینا زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔"

صمصام دین نے اس طرح کہا جیسے کوشلیا کے آگے بات کرنے کا سلیقہ اس میں آگیا ہو۔

"تمہارا یہ وقت تو بڑی مصروفیت کا ہے۔ پھر تم کیسے آگئے؟"

صمصام دین کی نظریں کوشلیا کے سراپے پر نثار ہو رہی تھیں ـــــ اور وہ پہلی بار کوشلیا کو ان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کوشلیا نے صمصام دین کی حالت دیکھی تو اس کو اس پر ترس آیا۔ وہ بالکل بھول چکی تھی کہ اس نے آج ہی بڑی سنجیدگی سے صمصام دین کے بارے میں کچھ سوچا بھی تھا۔

کیسی کیسی مہمل باتیں میں نے سوچی تھیں ـــــ کوشلیا پھر اس موڈ میں آگئی تھی کہ بڑی صفائی سے اپنے ہی جذبات کا جس کے بارے میں کچھ ہی دیر پہلے وہ سنجیدہ تھی مضحکہ اڑا سکے۔

صمصام دین نے خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہینسن نے سعید صاحب سے پچھوایا ہے کہ آیا فیوزے میں کوئی پارٹیشن آپ لوگوں کے لئے رکھا جائے؟ اس لئے کہ آج لوگ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ شاید آپ لوگوں کے آنے تک کیبن خالی نہ رہیں۔ اس لئے اگر وہ کہتے ہیں تو ریزرویشن کارڈ لگا دیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن وہ ہیں کہاں! وہ تو یہاں آئے نہیں۔"

"اچھا ـــــ تو پھر آتے ہی ہوں گے ـــــ وہ آچکے ہیں۔ فیوزے بھی آئے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"

"خیر وہ آجائیں گے ـــــ لیکن صم تم مسٹر ہینسن سے کہہ دو کہ کیبن کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ہم فیوزے نہیں آئیں گے۔"

"آبھی جائیے نا ـــــ دل لگ جائے گا۔"

"تو گویا تم ہینین کی وکالت بھی کرنے لگے ہو؟"

"نہیں نہیں ــــ ایسی کوئی بات بالکل نہیں ہے۔ میں نے تو صرف آپ کے لئے سوچا تھا۔"

"کوشلیا صمصام دین کی معصوم لوکھلاہٹ پر ہنس پڑی۔

وہ بھی ہنسنے لگا ــــ

"تو پھر کہہ دوں کہ ــــ"

"ہاں بالکل قطعی ــــ"

صمصام دین لوٹ رہا تھا کہ کوشلیا نے ڈیربالڈ کو گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ــــ

"لو وہ آ گئے سعید صاحب۔"

ڈیربالڈ کی شخصیت گہرے رنگ کے فل سوٹ میں نکھر رہی تھی۔ اس نے قریب آکر بڑی بے تکلفی سے کوشلیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور صمصام دین کی پروا کئے بغیر دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اس کو اپنے بالکل قریب کر لیا۔

کوشلیا کے لئے یہ بات کسی طرح کوئی نئی نہیں تھی لیکن آج اس نے صمصام دین کی موجودگی کو جانے کیوں بری طرح محسوس کیا اور غیر شعوری طور پر کچھ کھسک کر ڈیربالڈ سے الگ ہو گئی۔

"کہو ڈارلنگ، کدھر آ گئے ہیں یہ صمصام دین بہادر۔ یہ ہینین کے سیمسن ۔"

صمصام دین بہادر کے خطاب پر اپنی جھکی جھکی نظروں کو اٹھا کر وہ مسکرایا۔

"ہینین نے پچھوایا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو کوئی کیبن انگیج کئے دیتے ہیں اس لئے کہ فیوزنے میں آج کچھ زیادہ ہی لوگ آ رہے ہیں ــــ لیکن میں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"بھلا اس میں ضرورت کا کیا سوال ہے ــــ صرف محسوسات کی بات

ہے۔" ڈیر بالڈ نے کوشلیا کے جوڑے کے گلاب کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آج میں فیوز سے چلنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں ـــــ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"باتوں کے لئے فیوز سے سے اچھی جگہ کون سی ہو سکتی ہے جان۔"

"میں نے کہہ دیا ناکہ نہیں۔"

تو پھر تعمیل حکم ہو ـــــ" ڈیر بالڈ نے صمصام دین سے مخاطب ہو کر کہا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور پھر ہنسنے لگے۔

صمصام دین جا چکا تو ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر ڈیر بالڈ نے کوشلیا کی گردن چوم لی جو پھولوں سے سجے ہوئے جوڑے کے نیچے واقعی پیاری لگ رہی تھی۔

"کاکا یہیں کہیں ہوگا۔" کوشلیا نے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"چلو پہلے کاکا سے مل لیتے ہیں ـــــ اور ستالو کہاں ہے جو مجھے تنگ کرنے کے لئے نہیں آیا؟"

"ستالو جو کوئی چھ سات روز سے نہیں ہے ـــــ تم فیوز سے سے ہو کر آئے ہو نا۔ میں سمجھی تھی کہ ہیلن نے تمہیں یہ بات ضرور بتلائی ہوگی ـــ خیر چھوڑو بھی، پہلے کاکا سے مل لو۔"

ڈیر بالڈ نے پیچھے ہی سے پکار کر کاکا کو سلام کیا جو جوہی کے پودوں کی جڑوں میں صفائی کر رہا تھا۔

"اچھا ہوا جو تم آگئے ہو سعید میاں۔" کاکا نے ڈیر بالڈ کو مخاطب کرکے کہا ـــ "تین چار روز سے یہ رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی ہے ـــــ وہ تو تمہارا خط آنے پر اس نے آدمیوں جیسی صورت بنائی ہے ورنہ ہر کونے کھدرے میں، میں نے اس کے آنسو دیکھے ہیں ـــ تم آگئے ہو تو جیسے اسے ہمت سی آگئی۔ دیکھو کس طرح ٹھاٹ سے مسکراتی ہے جیسے ان چھ دنوں میں اس پر کچھ بیتی ہی نہیں۔"

"بات کیا ہے کاکا ؟"

"بات کیا ہوگی ــــ بس وہی اس کی قسمت کا چکر ہے۔ لونڈا اب بالکل آوارہ ہوگیا ہے۔ یہیں فیوزے اور بردوے کے اطراف گھوم پھر کر بڑی رات کو سہی آ تو جاتا تھا ــــ اب تو کوئی چار چھ دن سے بن پتہ تھا اور بیرا دھر اُدھر کی باتیں سُن کر رو رہی تھی ــــ آج صمصام دین نے اس کا پتہ اٹھایا ہے ــــ میں بھی یہیں بسی ہو آیا ہوں۔ شالو جہ کو دیکھ آیا ہوں۔ اپنی انہیں آنکھوں سے جنہوں نے خوشیاں کم غم زیادہ دیکھے ہیں ــــ لیکن یہ شاید مجھ پر بھی یقین نہیں کرتی۔ شالو کی ساری روداد سنتی ہے ــــ برہم ہوتی ہے۔ روتی ہے۔ کہتی ہے کہ اس کی صورت ہیں دیکھونگی لیکن پھر تھوڑی تھوڑی دیر سے کسی نہ کسی حیلے مجھ سے پوچھتی ہے۔"

"تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہو نا کاکا ؟"

"پگلی کہیں کی ــــ ان دنوں تمہاری اس کو ضرورت تھی سعید میاں۔ اچھا ہوا جو تم آ گئے۔"

کاکا نے بغیر رُکے ساری باتیں ڈیر بالڈ کو بتلا دیں اور پھر جو ہی کے پودوں میں جھک گیا جیسے کو تلیا کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہو۔

ڈیر بالڈ نے کنبا کا رُخ کرتے ہوئے کہا ــــ "چلو کوشش مجھے اچھی سی چائے پلاؤ ــــ بلکہ میری رائے میں فیوزے چلی چلو۔"

"نہیں ــــ تم ایک کام کرو ــــ میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں تم اس وقت تک بردوے میں کوئی کمرہ انگیج کراؤ ــــ میں نے طے کیا ہے کہ آج ہم بردوے میں ٹھہریں گے۔ تم جلدی سے ہو آؤ تو پھر میں تم سے جی بھر کر باتیں کروں ــــ ڈرتی ہوں کہ سارے کمرے انگیج نہ ہو جائیں۔"

"گڈ ــــ Good بہت اچھی بات ہے ــــ تو پھر میں ابھی آتا ہوں ــــ ارے ہاں لو میں بھول ہی گیا ــــ وہ دیکھو ــــ وہیں دھرا ہے۔"

کوشلیا نے ڈیر بالڈ کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ پتھر کی بیچ پر اس کا خوبصورت سا سوٹ کیس دھرا تھا۔

"تو چلو میں کٹیا تک پہنچا دوں ـــــ" دونوں اس بیچ کی طرف بڑھے۔

کوشلیا نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھایا ـــــ "ہلکا ہے میں لے جا سکتی ہوں۔"

"نہیں جان ـــــ میں ان نازک ہاتھوں کو زحمت نہیں دوں گا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا ـــــ میں کوئی چھوئی موئی ہوں۔"

"تو پھر یہ چابیاں بھی لے جاؤ ـــــ اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں رکھ لو ـــــ میں نے تمہاری پسندیدہ بیر کے لئے ایک بہت عمدہ مگ لیا ہے۔ بلجیم کا کٹ گلاس ہے۔ ـــــ تمہارے ہونٹوں تک پہنچے گا تو اور حسین ہو جائے گا۔"

"اچھا اب شاعری چھوڑ بھی۔" کوشلیا نے مسکرا کر چابیاں ڈیر بالڈ سے لیتے ہوئے کہا ـــــ اور سوٹ کیس اُٹھائے تھوڑا سا ایک طرف کو جھک کر وہ کٹیا کی طرف جانے لگی تو ڈیر بالڈ کھڑا اس کو کن کھائے ہوئے پتنگ کی طرح بجائے فضاؤں کے زمین پر ڈولتا ہوا دیکھتا رہا۔

کوشلیا نے پلٹ کر دیکھا تو اس کو ڈیر بالڈ کا اس طرح اپنی طرف دیکھتے رہنا وچھا سا لگا ـــــ اس نے ادائے دلبری سے پکار کر کہا ـــــ "چلو جلدی سے ہو آؤ۔ ابھی تک یہیں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو" ـــــ اور ڈیر بالڈ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

مٹی کے تیل کا اسٹوو جلا کر پہلے کوشلیا نے چائے کی کیتلی اس پر رکھ دی۔ وہ گنگنا رہی تھی ـــــ

ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دوسرا مصرعہ تو درامل پہلا مصرعہ تھا اسے اب بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

اس نے اپنا ایک معمولی سا کپڑوں کا جوڑا نکال کر ڈیر بالڈ کے سوٹ کیس

میں رکھنے کے لئے سوٹ کیس کھولا۔ سوٹ کیس میں ڈیر بالڈ کا صرف ایک نائٹ سوٹ، ایک شرٹ اور ایک پتلون تھا اور تولئے میں کوئی شے بڑی احتیاط سے لپٹی ہوئی تھی — اس نے کھول کر دیکھا۔ ایک بہت ہی خوب صورت سا مگ تھا جو یقیناً بدیسی تھا۔ سوٹ کیس کی وہ پرس جس پر زپ لگی ہوئی تھی کچھ پھولی ہوئی سی تھی۔ کوشلیا نے زپ کھینچ کر وہ لفافہ نکالا جو اس میں محفوظ تھا۔ اس میں کوشلیا کے اپنے لکھے ہوئے خطوط تھے اور خطوط کے بیچ میں سو سو روپے کے کئی نوٹ تھے —— کوشلیا نے انھیں گنا — پورے اکتالیس تھے —— چار ہزار ایک سو روپے۔

اتنا بہت سارا روپیہ اس نے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہوگا۔ یہ بات ایک سوالیہ علامت بن کر اس کے ذہن میں اُبھری —— اور ڈیر بالڈ نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔ جاتے ہوئے دے کر اس نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ انہیں حفاظت سے رکھنا —— وہ مجھ پر کتنا بھروسہ کرتا ہے۔

ڈیر بالڈ کی یہی باتیں کوشلیا کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی تھیں — مجھ پر تمہیں اتنا اعتماد ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا —— اُسے اس لمحہ وہ سب لوگ یاد آئے جو اس سے محبت کی باتیں تو کرتے تھے لیکن سونے سے قبل اپنی جیب سے ایک ایک پیسہ نکال کر گن لیتے تھے۔ زندگی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈیر بالڈ ہی میرے لئے بہت کچھ ہے، ایسی قندیل کے مانند جو اپنی کسی خرابی کی وجہ سے بھڑک تو اٹھتی ہے۔ لیکن احتیاط سے بتی کو نیچے اوپر کر کے کوشلیا اس کو راستہ دکھلانے کے قابل بنا لینے کا گُر جان گئی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اطراف اندھیروں اُجالوں کا ایک جال سا بن گیا ہے —— ستانوجہ اسے مایوس کن اندھیروں میں ڈھکیل رہا ہے اور ڈیر بالڈ اس کو امید کی روشنی دکھلا کر زندگی کی طرف کھینچ رہا ہے۔

چائے کا پانی کھولنے لگا تو اس نے اسٹوو کے شعلے کو کم کرنے کے لئے ہیٹر سے تھوڑی سی ہوا خارج کی تاکہ ڈیر بالڈ کی واپسی پر پتی ڈال کر چائے تیار کر سکے

پھر اس نے نکالے ہوئے سارے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ دیئے اور اپنے خطوط اور نوٹس کے پلندے کو اسی جگہ پر رکھ کر سوٹ کیس کو مقفل کر دیا۔

کھڑکی سے جھانک کر اس نے کاکا سے پوچھنا چاہا کہ کیا وہ بھی چائے پیئے گا لیکن کاکا تو ہی کے پودے کے پاس نہ تھا ——— کوشلیا اس کھڑکی سے ہٹ آئی اور مشرق کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکی سے دیکھا تو کاکا تین مسافروں کو بجرے میں بٹھائے جھیل کی سیر کرا رہا تھا۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک عورت تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ بچے کی موجودگی نے شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ اس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ ڈیر بالڈ اور پیارے لال کو پہلے پہل جب اس نے جھیل کی سیر کرائی تھی تو اسی طرح دو مرد تھے ایک عورت اور ایک بچہ ——— کاکا اسی طرح بے نیازانہ اپنی ہی دھن میں چپو چلا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس دن کا اپنی زندگی کے اچھے دنوں میں شمار کرنا چاہیئے یا برے دنوں میں ——— اس دن جہاں ڈیر بالڈ کی ہمدردیاں نصیب ہوئیں پیارے لال نے شانوجہ کو اس سے چھین لیا۔

پیارے لال نہ آتا اور وہ دل ہلانے والا حادثہ اگر نہ ہوتا تو شاید پیارے لال شانوجہ کو تباہی کے اس راستے پر نہ لے جا سکتا جس کا ذکر ڈیر بالڈ نے اپنے حالیہ خط میں کیا ہے کہ پیارے لال برابر شانوجہ سے ملتا رہا ہے ——— کچھ سوچ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دن اس کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر وہ پہچان گئی کہ ڈیر بالڈ آ رہا ہے ——— اس پر کبھی بھی اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ اس سے ملاقات کے پہلے دن کو اپنی زندگی کا منحوس ترین دن سمجھتی ہے۔ دل میں اس نے ارادہ کر لیا کہ کسی کمزور لمحے میں بھی وہ ڈیر بالڈ سے ایسی کوئی بات نہیں کرے گی جس سے یقیناً اس کا دل دکھے گا۔

قریب ہو کر قدموں کی چاپ بجائے اس کے کہ زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتی کچھ اور مدھم پڑ گئی ——— کوشلیا جان گئی کہ ڈیر بالڈ پیر دبا کر اس کے قریب آ رہا ہے

تاکہ اس کو ان خیالوں سے چونکا کر نکال سکے جن میں وہ اسیر ہو گئی ہے۔

کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں میچ لیں اور آنکھیں میچنے والے نے جٹا جٹ اس کے گال چوم لئے ـــــ وہ باوجودیکہ ان ساری باتوں کی عادی تھی لیکن پھر بھی سُرخ ہو اُٹھی ـــــ یہ سرخی ڈیر بالڈے سے جذباتی لگاؤ کا صاف اظہار تھی۔

"چھوڑو بھی، پہلے مجھے یہ بتاؤ تمہیں کمرہ مل گیا ہے یا نہیں ؟"

"مل گیا ہے، ہم دونوں ہی کو ایک کمرہ مل گیا ہے ـــــ" کوشلیا چونک سی گئی ـــــ پلک جھپکنے میں اس کی آنکھوں پر سے ہاتھوں کی گرفت ہٹ گئی تھی اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ شانوجہ سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے ـــــ وہ مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اس غیر متوقع حادثے کے لئے وہ بالکل تیار نہیں تھی ـــــ ہر جذبے سے عاری خالی خالی نظروں سے وہ اسے تکتی رہی پھر اس کا سر چکرا گیا آنکھوں کے نیچے اندھیری چھا گئی ـــــ آنکھیں بند کر کے وہ ہوا میں جھومتے ہوئے سرو کی طرح دیکھتے کے دیکھتے جھوم کر رہ گئی ـــــ شانوجہ نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ سہارا دے کر کھاٹ کی پٹی پر بٹھایا اور اس کی بانہہ پکڑ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے ماں ـــــ دیکھ میں آگیا ہوں ـــــ"

کوشلیا نے سنبھل کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ شانوجہ کو پلکیں جھپکا کر غور سے دیکھا۔ پھر یکایک چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی ـــــ شانوجہ کھاٹ کی پٹی پر اس کے قریب ہو آیا ـــــ "ماں ـــــ"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کے مانند اُٹھی ـــــ "ماں ـــــ مجھے ماں مت کہ، میں تیری ماں نہیں ہوں ـــــ اچھا ہوتا اگر تو مر جاتا اور میں ماں پکارے جانے کے لئے ترس ترس کر رہ جاتی ـــــ میں سوچتی تھی ـــــ میں تو سوچتی تھی کہ جب تو بڑا ہو گا تو مجھ سے کہے گا کہ کاش تم میری ماں نہ ہوتیں۔ اور میں فخر سے سینہ تان کر چلوں گی کہ میں بہر حال تیری ماں ہوں، تیرے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے ـــــ لیکن

آج مجھ جیسی ماں تجھ سے کہہ رہی ہے کہ کاش تو میرا بیٹا نہ ہوتا ——— تو نے کبھی آئینے میں اپنا قد دیکھا ہے۔ اپنے ہاتھ پیر دیکھے ہیں۔ اپنا سینہ دیکھا ہے ——— تجھے معلوم بھی ہے کہ ماں جب اپنے بیٹے کو عمر کی اس منزل میں دیکھتی ہے تو رعونت کی حد تک خود اعتمادی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کو عام عورتوں سے بلند و برتر سمجھنے لگتی ہے لیکن تو نے میری زندگی کو اٹھا کر کھائی کے اندھیروں میں پھینک دیا ہے۔ اس سے اچھا تو یہ ہوتا کہ خود مجھے پھینک دیا ہوتا تاکہ میں تجھے پھر دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہتی۔

"شانو جب میں نے کیا کیا سوچ رکھا تھا ——— میں سوچتی تھی کہ تو شرم سے میرے سامنے بھی آ نہ سکے گا۔ تیرا کا کا تجھے پکڑ کر مجھ تک لائے گا۔ لیکن تو کس قدر سفاک ہے تجھے اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا بھی تو نہیں ——— لجا اور شرم کے لفظ تو نے شاید کبھی سنے ہی نہیں ——— تجھے آخر یہ کیا ہو گیا ہے شانو جب ——— تجھے آخر یہ سب کیا ہو گیا ہے۔" اور کوشلیا نے پھر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"ماں تو یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ لجا اور شرم کے لفظ میں نے سنے ہیں ——— تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے ——— بردوں کے گیسٹ ہاؤز میں آج تیرا اور میرا کمرہ اتفاق سے ایک دوسرے کے برابر برابر ہیں۔ ایک دیوار بیچ میں حائل ہے ماں۔ ایک کمرے میں پیارے لال کے ساتھ میں ٹھہرا ہوں، دوسرے میں سید زماں کے ساتھ تو رہے گی ——— میں اپنی شرم کی گٹھری اٹھا لاؤں گا تو اپنی لجا سمیٹ لا ——— رات گذر جائے تو صبح کو ہم ایک دوسرے کا چہرہ اُجالے میں دیکھیں گے، پھر تو مجھے صرف ایک بار بیٹا پکار لینا اور مجھے بھی اتنی اجازت دینا کہ میں بھی تجھے صرف ایک بار ماں پکار لوں۔"

اور شانو جب لوٹ گیا ——— آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر کوشلیا نے اس کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا ——— پھر کسی غیر ارادی قوت نے اس کو سہارا دے کر اٹھایا۔

سحر زدہ عورت کی طرح وہ جیسے سوتے میں اس کے پیچھے چلتی ہوئی کُٹیا کے دروازے تک آئی ——— شانوجہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا احاطے کی ہری بھری باڑھ کے قریب پہنچ گیا تھا جس پر لال لال گُچھے دار پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں ——— کاکا بجرہ لے کر تینوں مسافروں کے ساتھ جنگل میں نکل گیا تھا اور کوشلیا باڑھ کے پرے شانوجہ کو نمودار ہوتا ہوا دیکھنے کے لئے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شانوجہ بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھے لیکن شانوجہ نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

کوشلیا کے کانوں میں شانوجہ کا یہ سوال گونج رہا تھا۔

"تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے؟"

"تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے؟ تو جانتی ہے کہ ———

وہ دل ہی دل میں شانوجہ سے باتیں کرنے لگی ——— شانوجہ تم کتنے سفاک ہو ——— کتنے دلیر اور کتنے سیانے ہو گئے ہو ——— میں تو سمجھتی تھی کہ تم تباہی کے راستوں پر چل پڑنے کے باوجود وہی شانوجہ ہو جو رات گئے گھر لوٹتے ہو تو پیر دبا کر چوروں کی طرح اپنے بستر تک آتے ہوا اور چپکے سے پڑ رہتے ہو ——— میں جاگتی بھی ہوں تو یوں ظاہر کرتی ہوں جیسے جاگ نہیں رہی ہوں ——— اور جب یہاں کٹیا میں موجود ہی نہیں رہتی ہوں تو تمہیں کتنا اطمینان ہوتا ہے ——— ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ڈرتے رہے ہیں شانو ——— اور میں آج کے اسی لمحے سے خوف کھاتی رہی ہوں جو اب بظاہر گزر گیا ہے لیکن سچ پوچھو تو ایک نشتر بن کر میرے دل میں اُتر گیا ہے ———

تم نے اتنی تلخ باتیں کہاں سے سیکھ لیں ——— اپنی اس ناپختہ عمر میں کیا تم نے زندگی کا اتنا شعور حاصل کر لیا ہے جو تمہاری زبان سے ایسے جملے بھی کہلوا سکتا ہے کہ ——— رات گزر جائے تو صبح کو ہم ایک دوسرے کا چہرہ آجانے میں دیکھیں گے پھر تو مجھے ایک بار بیٹا پکار لینا اور مجھے بھی اجازت دینا کہ میں تجھے ماں پکار لوں۔"

ڈیر بالڈ اس تک نہیں آیا ــــــ وہ اس کے لئے بے چین ہو گئی کہ وہ آئے تو اس سے مزید تفصیلات کا علم ہو سکے ــــــ اُداس، مضمحل اور تھکی ہاری جب وہ کٹیا میں واپس ہونے لگی تو اس عارضی تازگی کو جو ڈیر بالڈ کا خط پا کر اس نے حاصل کی تھی، شانو جہ نے جیسے نوچ پھینکا تھا۔

کٹیا میں پہنچ کر اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ عارضے اور کاجل کے ملے جلے سفید اور سیاہ دھبے اس کے چہرے پر نمایاں تھے جو ان آنسوؤں کی چغلی کھا رہے تھے جو وہ بہا چکی تھی۔

چائے کا پانی کھول کھول کر سوکھ گیا تھا ــــــ اس نے کپڑے سے پکڑ کر ڈھکن نکالا اور گلاس بھر پانی کیتلی میں ڈال دیا ــــــ پانی کے جلنے کی سرسری آواز آئی اور تھوڑا سا دھواں کیتلی سے اٹھا کہ کوشلیا نے ڈھکن ڈھک دیا۔

میرا حال اس خالی کیتلی سے ملتا جلتا ہے جو اسٹوو پر دھری بغیر پانی کے جل رہی تھی اور جو پانی میں نے دوسری بار ڈالا ہے وہ گویا ڈیر بالڈ کا خط تھا جس نے مجھے تسکین دی تھی ــــــ لیکن اب شانو جہ نے مجھے جس آگ میں پھینک دیا ہے وہ آگ تو شاید دوزخ کی آگ ہے جسے شاید ڈیر بالڈ بھی نہیں بجھا سکے گا۔

آج تحصیل سے جتنے مسافر لوٹے تھے ان کی اکثریت زرد گلابوں سے محروم رہ گئی تھی۔ جو نئے تھے انھوں نے محسوس بھی نہیں کیا ــــــ جو پہلے آ چکے تھے انھوں نے کوشلیا کو پوچھا اس کے باوجود بھی کہ کوشلیا کے ہاتھ سے گلاب لینے کے سوا ان کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ بعضوں نے خاموشی اختیار کی اور اپنی بیویوں پر اس طرح اثر چھوڑنے کی کوشش کی کہ انھوں نے کوشلیا کے نہ ہونے پر کوئی کمی ہی محسوس نہیں کی۔

کوشلیا نے منہ پانی سے بھگو کر صابن چہرے پر ملا ہی تھا کہ ڈیر بالڈ آ دھمکا۔ اس نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پکارا ــــــ کوش ــــــ کوشلیا نے

آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا اور پھر جھک کر نل سے گرتے ہوئے پانی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں بھر بھر کر چہرے پر اچھالنے لگی۔

"میں جس وقت آیا ہوں تم بالکل تیار ہو چکی تھیں ـــــ میں شاید آج ہی تم سے ملا ہوں ـــــ کیوں، ٹھیک ہے نا؟"

اس مذاق کے باوجود کوشلیا مسکرا نہ سکی۔ اس نے تولئے سے چہرے کو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"شانوجہ آیا تھا ـــــ وہ ابھی ابھی گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں ـــــ" ڈیریالڈ کہنے لگا ـــــ "وہ لوٹتے ہوئے مجھ سے راستے میں ملا تھا۔ میں نے پوچھا بھی۔۔ کہنے لگا تم سے مل آیا ہوں ـــــ اس کے چہرے پر میں نے کوئی علامت نہیں دیکھی ـــــ وہ بالکل مطمئن تھا ـــــ تمہاری طرح نہیں کہ شانوجہ نے تمہارے چہرے پر اتنے نقوش چھوڑے ہیں کہ پھر مجھ سے ملنے کے لئے تمہیں اپنا چہرہ دھونا پڑا ـــــ شانوجہ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ عورتوں میں کے لباس میں تو وہ شانوجہ ہر رات کچھ بدل جاتا ہوگا لیکن اب اس کی وہ معصومیت بچی ہے جو سال ڈیڑھ سال پہلے گناہ کی چادر اوڑھے تمہارا سامنا کرنے سے اسے روکتی تھی اور وہ پنجوں پر چل کر اپنے بستر تک پہنچتا تھا۔ آج جب وہ شانوجہ مجھ سے نہیں ملا کوشلیا تو میں نے جان لیا کہ تم زیادہ دنوں تک اس کا پیچھا نہیں کر سکو گی۔ وہ بہت دور نکل گیا ہے اور تمہارا اس تک پہنچنا اب مشکل ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو ـــــ"

"چلو چلیں باہر ـــــ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤ گی ـــــ میں تو اس طرح سوچتا ہوں کوشلیا کہ ہر خوشی کو خواہ وہ چھوٹی ہو کہ بڑی جہاں سے ملے جس وقت ملے حاصل کر لینا چاہئے ـــــ ذاتی غم کوئی غم ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ ہر غم کے ساتھ کسی دوسرے کی ذات بھی وابستہ ہوتی ہے جسے تم اپنے دل میں بسا کر اپنا لیتی ہو۔

اور پھر اسی کا غم تمہارا ذاتی غم بنتا ہے کسی کو اس کی اجازت ہی نہ دو کہ وہ تمہارے دل کے اس حد تک قریب آ سکے ـــــ شانو جہ تمہیں بہیں ـ دو رہا ہے، تم شانو جہ کو رو رہی ہو ـــــ تم جب کبھی کسی گھنے سائے کے نیچے سستائی ہو تو تم نے اس پیڑ ہی سے اپنے جذباتی رشتے قائم کر لئے ہیں جس نے تمہیں یہ سائے دئے تھے اور جب وہ پیڑ خزاں کے ہاتھوں جھلس گیا ہے تو تم اس کی بے سروسامانی پر آنسو بہانے کے لئے چلتے چلتے ٹھہر گئی ہو اور جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوا ـــــ مسرتوں کا وہ کارواں جو تمہارے ساتھ تھا تمہیں پیچھے چھوڑ کر نکل گیا ہے اور پھر بھولی بھٹکی تم کبھی اس کارواں سے ملی ہو تو اس نے تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیا ـــــ خیر چھوڑو بھی ـ چلو تیار ہو جاؤ ـ"

"آج میں بہت پیوں گی ـ" کوشلیا نے بہت دھیمی آواز میں آئینے کے سامنے سنورتے ہوئے کہا ـ

"ضرور پیو ـــــ لیکن آنسو سمجھ کر نہیں ـــــ پی کر اداس ہو جانا حماقت ہے ـ پیسہ ضائع کر کے ہم اپنی زندگی کا دکھ درد کم نہیں کر سکتے اور زیادہ کر لیتے ہیں ـ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تم نے شراب سے بے وفائی کی ہے ـــــ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ـــــ اور یہ بدسلوکی تم نے اکثر روا رکھی ہے ـــــ پی کر عورت کو ایک شگفتہ پھول بن جانا چاہیئے ـ ایک خوشبو، ایک نغمہ، ایک تبسم ـــــ لیکن پینے کے بعد اگر تم کسی پھول پر بھی غصہ کرتی ہو تو اس کی پنکھڑیوں کو نوچ کر پھینک نہیں دیتیں بلکہ اس کو ہاتھ میں مسل کر رو پڑتی ہو ـ"

"بس کرو ورنہ ابھی رو پڑوں گی ـــــ اور سن لو آج میں بردولے نہیں چلنے کی ـ"

"کیوں نہیں چلو گی ـــــ میں آج جہاں جاؤں گا وہاں چلو گی ـــــ مجھے شانو جہ کے کمرے کے برابر ہی کمرہ ملا ہے جس میں وہ بلونت کے یعنی تمہارے پیارے لال کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے ـ"

"جاتی ہوں۔"

"یہ بھی جانتی ہو؟"

"ہاں۔"

"تو یہ بات بھی تمہیں شانوجہ نے بتلائی!!"

"ہاں۔"

"تو پھر اب اور کیا باقی رہ گیا ہے جو تم شانوجہ سے چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں چاہتی ــــ کچھ بھی نہیں چاہتی ــــ لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اپنی رسوائیوں کو دیکھ چکنے کے بعد اب اپنی آنکھوں پہ یہ ظلم بھی کروں کہ وہ شانوجہ کی بربادیاں دیکھیں۔ اپنے دل پر یہ ظلم کیوں کروں کہ اس کو اپنی دھڑکن کا پتہ ہی نہ ہو، اپنے احساسات کی بھٹی پر اس قدر تیل بھی کیوں ڈالوں کہ وہ منٹ بھر میں میری ہستی کو جلا کر خاکستر کر دے ــــ تم لوگ آخر مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو ــــ بتاؤ، بولو۔"

"جذباتی ہو رہی ہو کوشش ــــ میں تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں جہاں تم بہر حال جاؤ گی۔ کیا تم کبھی بھی بردوے کا رُخ نہیں کرو گی۔ جب تمہیں معلوم ہوگا کہ شانوجہ بھی وہاں ہے۔ تم یوں سمجھو کہ شانو بھی بازار میں وہی دوکان لگا کر بیٹھ رہا ہے جو تم نے سجا رکھی ہے ــــ آنے والے خوش حال مسافروں کی اکثریت ابھی تمہاری دوکان ہی پر مطمئن ہوتی ہے۔ جو بچ رہتے ہیں انھیں شانوجہ نہیں چھوڑتا چند ایک ایسے بھی ہوں گے جو شانوجہ ہی کے خواہاں ہوں گے۔ بہر حال یہ سب کچھ چلتا رہے گا اور شانوجوان ساری باتوں کے لئے تیار ہو چکا ہے۔ پیارے لال کہہ رہا تھا، لونڈا بہت تیز ہے۔ بلا ہے بلا۔ اچھی رقمیں گھسیٹ لیتا ہے ــــ خاتون کے سردار تک میں نے ہی اس کو پہنچایا۔ سردار اس کا اس قدر گرویدہ ہوا ہے کہ پوچھو نہیں ــــ اس نے بہت کچھ اسے دیا ہے، تحفے تحائف الگ دیئے ہیں۔ لونڈے نے کہیں چھپا دیا ہے۔ مجھ سے بھی اس نے پوشیدہ رکھا۔ اب یہ ہر ماہ

اس کے پاس جایا کرے گا ـــــــ ماما نہ دو سو روپے ہر صورت میں شالوجہ کو ملتے رہیں گے خواہ کسی ماہ جان سے اس کی ملاقات نہ بھی ہو۔ ویسے جان اب یہاں بروحے سے بھی آیا کرے گا ـــــــ ہاں شالوجہ نے مجھ تک کو نہیں چھوڑا ـــــــ پیسے بٹورلئے اور میری وہ دستی گھڑی ہتیالی جو اسمگل گئی تھی۔

"اس نے اور بہت سی باتیں بتلائیں کوش۔ وہ کہنے لگا کہ لونڈا آج ہی سے اپنے مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری اس عمر کے چاندنی کے دن مختصر ہیں اور یہ چھٹکی ہوئی چاندنی ماند پڑ جائے گی تو پھر کوئی چکور میری طرف نہیں اڑے گا ـــــــ تم لوگ جو محبت، ہمدردی اور جذبات کی بات کرتے ہو، میری اس عمر میں جو تمہارے کام کی ہیں ہوں گی اپنی محبت، ہمدردی اور جذباتیت کو میرے پیٹ کا ایندھن بنا سکو گے ؟

"وہ کہتا ہے دوکان پر دھرے ہوئے ایک تنکے کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ خود دوکان کے مالک کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو یہ تنکا اٹھا کر مفت دیدے۔ یہ حرکت تجارت کے اصول کے خلاف ہوگی ـــــــ

"پیارے لال کہہ رہا تھا کوش کہ شالو نے آج تک ایک بوسہ بھی کسی کو مفت نہیں دیا ـــــــ وہ ہر لمحہ کا حساب چکا لیتا ہے۔ سفّاک اس قدر ہے کہ کسی دوسرے کے ساتھ ہوگا تو ایک نگاہ غلط انداز بھی ہم پہ نہ ڈالے گا ـــــــ جو اس کے ہو گئے ہیں وہ اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ جس وقت وہ آپ کی ملکیت ہوتا ہے اس وقت آپ سے والہانہ عشق کرتا ہے کچھ اس طرح آپ کی تسکین کا باعث ہوتا ہے کہ آپ اس کو بھول نہیں سکتے۔ آپ کے ایک ایک پل کو خوشی اور مسرت عطا کر دیتا ہے۔ ـــــــ" اس کی رفاقت میں بیتا ہوا ایک ایک لمحہ یاد کا جگنو بن کر اپنی تنہا اندھیری راتوں میں ساتھ ہو جاتا ہے۔"

"بس کرو ـــــــ پھر تم بھی اسی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔"

ڈیر بالڈ ہنس پڑا ——— "اوہ! تم ایک ہی جست میں ماں سے عورت بن گئیں —۔
ماں لو ——— میں نہیں جاؤں گا کوشش ——— لیکن تمہاری زندگی میں داخل ہونے والے کتنے ہی ایسے نکل آئیں گے جو تمہیں نہ پاکر رشانوجہ کی طرف جائیں گے اور شانوجہ کو نہ پاکر تمہاری طرف آئیں گے۔ اور تمہیں اس زندگی کو گوارہ کرنا ہوگا ——— اگر بردولے فیوزے اور تصیل کے اس مثلث میں تمہیں ایسی دوکان چلانی ہے ——— تم اس مشترک گاہک کو جو تمہاری اور رشانوجہ دونوں کی سیڑھیاں چڑھے گا کیا کہہ کر ردکو گی ——— تمہارے اور اس کے درمیان کون سے جائز رشتے کی دیوار رہے گی۔ تم جو کام کر رہی ہو اس کام کی بنیاد ہی اس تصور کے مٹ جانے سے شروع ہوتی ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات کی گٹھڑی کسی گدھے پر لاد کر تم مندر کی داسی تو بن سکتی ہو اس لئے کہ دیوتا گناہ چھپا لیتے ہیں اور پھر انہیں دھوکہ دیتے ہیں ——— لیکن بازار میں بیٹھ کر تم سر سے وہ بوڑھی نکال پھینکنا چاہو جو ہر مسافر کو تم تک پہنچنے کا حق دیتا ہے تو تمہارا کاروبار چل چکا۔"

"میں کب چاہتی ہوں کہ یہ دوکان چلتی رہے۔"

"یقیناً چاہتی ہو ——— مجھ سے ملنے کے بعد تمہاری امیدوں کے ٹمٹماتے ہوئے دئے جس کی روشنی میں تم دور تک میرے ساتھ چلی آئی تھیں سب کے سب بجھ گئے ہیں ——— تم سمجھتی رہیں کہ میں تمہیں اس طرح اپنا لوں گا کہ تم امید کے ان دیوں کو میرے گھر کے گوشے گوشے میں سو سو جتن سے جلاتی رہو گی کہ سارے گھر میں تمہاری محبت کے اجالے بکھر سکیں لیکن آہستہ آہستہ جب تم مایوس ہوتی گئیں تو تم نے مجھ سے اس ضمن میں استفسار کرنا بھی چھوڑ دیا ——— کبھی مجھے اپنے وعدے بھی یاد نہیں دلائے کہ میں نے تمہیں تمہاری اپنی دانست میں کتنا اونچا اٹھا لینے کی قسمیں کھائی تھیں ——— آخر ش تم اس جال سے نکل آئیں جس کو تم نے میری خاطر اپنے اطراف بن رکھا تھا اور پھر ہر آنے جانے والے مسافروں سے یہ نگیں"

——— اور اس کے بعد تمہیں اپنی دوکان کو پھر سے چلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

""سو تو میں چلا رہی ہوں۔"

"لیکن پٹ بھیڑ کر —— چوروں کی طرح۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"ستالوحہ بن جاؤ۔"

"یعنی ...؟"

"یعنی گناہ اس طرح کرو جیسے تمہارا حق ہے۔"

کوشلیا نے اپنے جوڑے سے گلاب کا ایک پھول نکال لیا اور خیالوں میں گم اس کی پنکھڑیاں نوچنے لگی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"سوچ رہی ہوں اگر اپنی زندگی کے ساتھ یہی سلوک کروں جو اس پھول سے کر رہی ہوں تو بھی کیا برا ہے۔"

"کر سکو گی؟"

"کیا معلوم۔"

"اور اگر کر سکو بھی تو کسی کا کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں۔"

"پھر اس سے حاصل۔"

"مجھے یہ دیکھنا نہیں ہے۔"

"تو پھر اٹھو برودے چلتے ہیں —— آج رات وہیں گزار کر تم صحیح فیصلہ لے سکتی ہو۔ جس زندگی سے تم بھاگ رہی ہو وہی زندگی تمہارا پیچھا کر رہی ہے —— لیکن تم بہت جلد تھک جاؤ گی اس لئے کہ تم میں بھاگنے کا یارا ابھی تو نہیں ہے۔"

خشبو لگا کر اس نے جوڑے میں پھول برابر کئے اور بڑی بے دلی سے خود کو

آئینے میں دیکھا۔ جب وہ تیار ہو کر ڈیر بالڈ کی طرف ساتھ چلنے کے لئے پلٹی تو وہ ہنس رہا تھا۔

"اب کیا کوئی نئی بات کرنے والے ہو؟"

"ہاں۔"

"پھر کہو بھی۔"

"خوش ہوں کہ تمہیں اپنے حسن کا، اپنی کشش کا، اپنی موہنی کا شدید احساس ہے۔"

"وہ کس طرح تمہارے دماغ میں آیا۔"

"اس لئے کہ جب تم زندگی سے انکار کرتی ہو تو آئینے میں اپنا عکس تک نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتیں۔"

"کیوں نہیں دیکھ سکتی؟"

"اس لئے کہ تم زندگی سے پیار کرنے لگو گی۔"

کوشلیا ہنس پڑی —— ڈیر بالڈ نے اُٹھ کر اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، پھر ہاتھ، ہاتھ میں لے کر دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"تمہارا سوٹ کیس ساتھ رکھ لوں ——" کوشلیا نے جیسے چونک کر کہا۔

"کیوں، کیا یہاں محفوظ نہیں رہے گا؟"

"پھر بھی احتیاط مناسب ہے —— اتنی ساری رقم ساتھ رکھتے ہو، چابیاں میرے حوالے کر دیتے ہو اور مجھے بتلاتے تک نہیں کہ سوٹ کیس میں اتنی بڑی رقم ہے۔ اگر میں چابیاں اِدھر اُدھر ڈال دوں۔ سوٹ کیس ہی کھلا چھوڑ کر بھول جاؤں بلکہ —— کوشلیا یہ کہتے کہتے پھر ڈیر بالڈ کی بیوی بن گئی تھی —— اب ڈیر بالڈ کی معیت میں اس نے پھر اپنا گھر تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک چاہنے والی بیوی، ایک مشفق ماں اس کے اندر انگڑائی لے رہی تھی۔

ڈیر بالڈ نے اس کو بغور دیکھا —— وہ جانتا تھا کہ کوشلیا اب کیا بن گئی ہے۔

"رقم یہیں محفوظ کر سکو تو بہتر ہے —" ڈیریا بالڈ نے کہا۔

"تو پھر چلو یہیں رکھے دیتی ہوں —" ڈیریا بالڈ نے نوٹوں کا دستی میں بندھا ہوا پلندہ نکال کر کوشلیا کے حوالے کیا۔

"میرے ساتھ آؤ —" کوشلیا نے ڈیریا بالڈ کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے سونے کے کمرے میں گھسیٹا — جس کی آدھی سے زیادہ دیواریں اینٹ اور گارے کی تھیں اور جس کا چھپر زیادہ دبیز معلوم ہوتا تھا — اپنے پلنگ کے نیچے سے ایک بھاری بھرکم صندوق کو گھسیٹ کر اس نے باہر نکالا — پھونک مار کر گرد جھاڑی اور ڈیریا بالڈ سے مخاطب ہو کر کہا — "دیکھو یہ ہے میری تجوری۔ بس یہاں اس سے زیادہ محفوظ مقام کوئی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے رکھ دو۔" ڈیریا بالڈ نے اطمینان سے کہا۔

کوشلیا نے صندوق کھولا اور نوٹوں کا پلندہ احتیاط سے ایک کونے میں رکھ کر صندوق کو مقفل کرتے ہوئے کہا۔ "نوٹوں کے ساتھ کچھ اور کاغذات بھی تو ہیں۔"

در اصل کوشلیا اپنے خطوط کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھی — ڈیریا بالڈ سمجھ گیا۔ وہ کہنے لگا — "وہ بھی نوٹ ہیں اور وہی نوٹ میری محبت کی دنیا میں چلتے ہیں جب کہ مارکٹ میں ان کا چلن نہیں۔ اور وہی نوٹ مجھ کو بہت پیارے ہیں۔"

"سچ کہتے ہو کہ وہ نوٹ تمہیں اتنے پیارے ہیں۔"

ڈیریا بالڈ کوشلیا کی کمزوری جانتا تھا — "تم چاہو تو اسے جھوٹ بھی سمجھ سکتی ہو — یہ تمہارا معاملہ ہے۔"

کوشلیا نے بڑے پیار سے ڈیریا بالڈ کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اس کو یقین دلایا کہ وہ اس کی محبت پر کوئی شک نہیں کرتی ہے۔

کمرہ مقفل کر کے جب دونوں باہر نکلے تو کالجرے کو کنارے سے لگا چکا تھا۔ شام کا دھندلا ماحول جھیل میں دور تک پھیلی ہوئی سیال چاندی پر کاجل

ن کر گر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں اس کا جل کی تھیں جھیل کے پانی پر
م جائیں گی لیکن آسمان پر ٹمٹماتے دو چار تارے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ
ہ ان کالی راتیں جب جوان ہو کر فیو زسے 'بر د د لے اور جھیل کے مثلث پر چھا جائیں گی تو وہ
بھی اپنی چھپی ہوئی بے شمار فوج لے کر دیکھتے دیکھتے جھیل میں اتر جائیں گے۔
کا کا قریب آیا تو کوشلیا نے اس کو گرم کوٹ پہننے کی تاکید کی جو کبھی ڈیر بالڈ
نے اسے بطور تحفہ دیا تھا اور ڈیر بالڈ نے سگریٹ اپنے ہاتھوں سے کا کا کی باچھوں
میں دے کر لائٹر سے جلایا اور دونوں ہاتھ ہلا کر روانہ ہو گئے ــــ کا کا نے
جواب میں مسکراہٹ بکھیر دی اور کوشلیا کو مطمئن دیکھ کر اس نے خوشی محسوس کی۔
"تم بتا سکتی ہو کہ یہ برد دلے کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے؟"
ڈیر بالڈ نے کوشلیا سے پوچھا۔ وہ احاطے کے گیٹ سے نکل کر سڑک پہ چل رہے تھے۔
کوشلیا نے بڑی سادگی سے جواب دیا ــــ "بس میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ
گیسٹ ہاؤز کا نام ہے ــــ اس سے زیادہ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس
نہیں کی۔"
"لیکن میں تمہیں بتلاؤں تو یقیناً تم ہنس پڑو گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ عام
بول چال میں بعض الفاظ مختصر ہو کر کتنے خوب صورت بھی ہو جاتے ہیں ــــ لیکن
پہلے میں تمہاری ذہانت کا امتحان لے لوں ــــ میں تمہیں سوچنے کے لئے دو منٹ دیتا
ہوں، اگر تم بتلا دو تو برد دلے پہنچتے ہی تمہیں انعام دوں گا اور وہ ایسی چیز ہو گی
کہ تم یقیناً خوش ہو جاؤ گی اور جو نہ بتلا سکو تو تمہیں کڑی سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔
"اور جو میں بغیر کچھ سوچے سزا ہی بھگتنے کو تیار ہو جاؤں تو ؟"
"تو پھر میں تمہیں پہلے سزا دوں گا پھر انعام دوں گا۔"
"چلو میں ہار مانتی ہوں، اس طرح مجھے دونوں ہی ملیں گے سزا بھی اور
انعام بھی۔"

"تو ہار مان لی؟"

"ہاں ——— زندگی میں ایک اور ہار سہی۔"

"بردوے انگریزی کے Broad Lane (براڈ لین) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ بول چال میں یہ بردوے ہو کر مختصر بھی ہو گیا ہے اور خوب صورت بھی، جیسے تم کوشلیا سے کوشی ہو کر زیادہ خوب صورت ہو جاتی ہو۔"

کوشلیا نے تعجب کا اظہار کیا لیکن یہ معلوم کر کے کہ بردوے کی اصلیت کیا ہے اسے خوشی ہوئی۔ ڈیر بالڈ نے اس کے اشتیاق کو بڑھانے کے لئے کہا کہ جب وہ کوشلیا کو سزا دے گا تو اسی کو بردوے کی نسبت مزید معلومات بہم پہنچائے گا۔

ڈیر بالڈ اور کوشلیا چلتے ہوئے اب جس سہ راہے پر پہنچے تھے وہاں سے فیوزے صاف دکھائی دیتا تھا ——— اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ فیوزے کی جگمگاتی روشنیوں میں کتنے غم آتش سیال سے ڈھل کر نکھر رہے ہیں کتنی چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ودا ع بھی ہو رہی ہیں، مستقبل کے لئے وعدے وعید بھی کر رہی ہیں۔

فیوزے میں دیس دیس کے مسافر جمع ہوتے تھے۔ دیس دیس کا غم اور دیس دیس کی خوشی سینوں میں بند ہو کر یہاں آتی تھی۔ یہاں فیوزے میں ہم نے جہاں سسکیاں سنی ہیں، قہقہے بھی ساتھ ساتھ سنے ہیں ——— غموں اور خوشیوں کے ان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے انسانی جذبوں کا نہ کوئی رنگ ہے نہ کوئی نسل اور نہ کوئی دیس۔

"فیوزے اپنی طرف کھینچتا تو ہے ———" ڈیر بالڈ نے کہا۔

"لیکن اس میں فیوزک ہیٹن کی کسی اچھائی کو دخل نہیں ہے ———" کوشلیا نے کہا۔

——— "ایسا بھی نہیں ہے۔ تم زیادتی کر رہی ہو ——— فیوزے کا تصور ہیٹن کو

چھوکر کے اسی طرح نہیں کیا جا سکتا جیسے شالوجہ کو علیحدہ کر کے آج بھی تمہارا تصور ممکن نہیں۔
اور فیروزے تو شالوجہ سے زیادہ وفادار ہے۔"

برودے کی جانب گھومتے ہوئے ڈیر بالڈ اور کوشلیا نے فیروزے کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے چھنتی ہوئی جگمگاہٹ پر آخری نظر ڈالی۔ پھر ان کی پشت فیروزے کی طرف ہو گئی اور درختوں کا وہ جھنڈ راستے کے آخری بجلی کے کھمبے کے پاس ہی نظر آنے لگا، یہاں سے چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اور جہاں راستہ بل کھا کر ذرا ڈرا ڈراسہما سا گھنے درختوں کے ان تاریک سایوں میں داخل ہو جاتا تھا اور کھائی کے قریب پہنچتے پہنچتے دم سادھے اس طرح لیٹ رہتا تھا کہ کسی بھی مسافر کے تلوے کو گدگدانے کی بھی ہوا بس میں ہمت نہ رہتی تھی

واقعی ڈیر ایسا لگتا ہے کہ کھائی کے قریب ان گھنے سایوں میں سے گزرنے کے لئے راستے پر جبر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آخری بجلی کے کھمبے تک پہنچ کر دیکھو راستہ کتنا اداس ہو گیا ہے —— گویا اس کے بس میں ہوتا تو کیمرے کے فلم کی طرح ایک سرا چھوڑتے ہی بل کھا کر فیروزے تک سمٹ آتا۔"

"سچ کہتی ہو، لیکن راستہ بہر حال راستہ ہے اور تمہیں اپنی بقیہ زندگی میں اس راستے ہی کا تحمل سیکھنا چاہیئے۔"

یکایک سڑک کے اسی آخری بجلی کے کھمبے کے پاس جہاں اجالا بھی مجبور محض معلوم ہوتا تھا تیز روشنیاں رقص کرنے لگیں —— یہ یقیناً کوئی فراٹے بھرتا ہوا موٹر تھا جس کی روشنیاں قطار اندر قطار گھنے سایہ دار درختوں کے درمیان سے لپک کر راستہ ناپ رہی تھیں۔

بجلی کے کھمبے تک پہنچتے پہنچتے جب موٹر سڑک پر گھوم کر کوشلیا اور ڈیر بالڈ کی جانب پلٹ گیا تو ساری سڑک ان کی آنکھوں کے آگے منور ہو گئی —— جھکا جھک ایک پودے کے پاس ہی ڈھیرے چمک اٹھے پھر جگمگاتے ہیرے

چار ہو گئے اور کوشلیا اور ڈیر بالڈ نے دو خرگوشوں کو روشنی میں گم دیکھا ـــــ پھر ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ سڑک پر ایک کونے میں ہٹ آئے۔

"شاید یہ شالوجہ کا موٹر ہو ـــــ خانوں کے سردار کا یہ موٹر صرف سردار ہی کی سواری میں رہتا ہے لیکن شالوجہ سے کہہ کر بلونت نے اسے ران کی رات حاصل کیا ہوگا"

"بلوت کون ـــــ ؟"

"معاف کرنا ـــــ وہی تمہارا پیارے لال۔"

"اوہ ہاں ـــــ میں بھول گئی تھی۔"

موٹر قریب آیا اور بریک لگنے کی آواز ہوئی ـــــ پھر جیسے ہوائی جہاز فضاؤں سے اُتر کر زمین پر جھول رہا تھا۔

جھک سے موٹر کا اندرونی حصہ منور ہو گیا ـــــ کوشلیا نے دیکھا۔ پیارے لال اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا اور پائپ اس کے دانتوں میں دبا خوشبودار دھواں پھینک رہا تھا۔

"میں تمہارے موٹر کو دور ہی سے پہچان گیا تھا" ـــــ ڈیر بالڈ نے پیارے لال سے کہا جو دونوں ہاتھ جوڑ کر کوشلیا کو پرنام کر رہا تھا۔

لیکن کوشلیا نے منہ پھیر لیا۔

پیارے لال کوشلیا کی خفگی پر مسکرایا۔

"شالوجہ کہاں ہے ـــــ ؟" ڈیر بالڈ نے سوال کیا۔

"وہ بردولے پر میرے انتظار میں آئینے کے آگے بیٹھا سنور رہا ہوگا ـــــ"

یہ کہہ کر پیارے لال نے کن انکھیوں سے کوشلیا کو دیکھا جو نظریں جھکائے سڑک کو تک رہی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو ـــــ ؟" پیارے لال نے ڈیر بالڈ سے پوچھا۔

"بردولے"

"تو پھر آجاؤ ــــ میں بھی فیوزے سے کھانے کی کچھ چیزیں لے کر بردے لوٹوں گا ــــ ساتھ ہی چلتے ہیں ــ منزل ایک ہی ہو تو ساتھ چلنے میں پس و پیش کیوں کریں" ــــ اور اس نے پے کی طرف جھک کر کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"چلو کوش ــــ" ڈیر بالڈ نے کوشلیا کی بانہہ پکڑ کر اس سے کہا۔

"نہیں ــــ" کوشلیا نے بانہہ چھڑا کر اپنی ناراضگی کا کھلا اظہار کیا۔

"چلو بھی ــــ" ڈیر بالڈ نے پچکارا۔

"نہیں نہیں ــــ میں کہہ چکی ہوں ــــ" کوشلیا پرے ہٹ گئی۔

"دیکھئے بھئی۔ ــــ آپ بے سبب مجھ سے خفا ہیں" ــــ پیارے لال بڑی نرمی سے کوشلیا سے مخاطب ہوا لیکن کوشلیا نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔

"اچھا بلونت تم چلو بھئی ــــ ٹاٹا" ــــ اور ڈیر بالڈ ہاتھ ہلا کر بڑھ گیا۔ کوشلیا دو چار قدم آگے ہی نکل چکی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم پھر دلیلوں سے کام لوگے لیکن میں اب کسی حجت کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں چاہوں گی کہ تم اتنی دیر خاموش رہو جب تک کہ میں خود کچھ نہ کہوں۔"

ڈیر بالڈ خاموش ہو رہا ــــ اس نے جواب بھی نہیں دیا اور دونوں اس طرح راستے پر چلتے رہے جیسے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں لیکن چاہتے ہوں کہ بات کریں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی موت پر بہت دیر تک خاموش رہ کر اظہارِ تعزیت کر چکے ہیں" ــــ ڈیر بالڈ نے یہ بات اس وقت کی جب کہ سڑک بل کھا کر درختوں کے تاریک سایوں میں داخل ہو رہی تھی اور کچھ ہی دور پر وہ اس کھائی کے پاس سے گزرنے والے تھے جس میں کئی دن سے کوشلیا نے کوئی گلاب نہیں پھینکا تھا۔

لیکن کوشلیا اب بھی خاموش رہی۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس بار کھائی میں گلاب ضرور پھینکتا چلوں۔"

کوشلیا نے اب بھی کچھ نہ کہا۔

ڈیربالڈ بھی کچھ دیر کے لئے چُپ ہو رہا —— لیکن جب وہ کھائی کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اس نے بانہہ پکڑ کر کوشلیا کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم آخر مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو۔"

کوشلیا نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا تو ڈیربالڈ نے اپنی قمیص پر آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔

"میں جانتا ہوں کوش تم بہت دُکھی ہو —— میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھاری اس زندگی میں اگر میں بھی شامل نہ ہوتا تو شاید تم خودکشی کر لیتیں —— لیکن تمہارے بس میں اب کچھ بھی نہیں ہے —— نہ موت، نہ زندگی —— صرف آنسو تو زندگی کی کوئی پونجی ہی نہ ہوئے اور اگر ان کو بھی تم بے دریغ لٹا دو تو پھر تم ہی بتاؤ رہ ہی کیا جائے گا —— کچھ تو رکھو کوش —— اپنے لئے کچھ تو اٹھا کر رکھ لو جان۔"

ڈیربالڈ نے یہ بات کچھ اس درد سے کی کہ کوشلیا نے مسکرا مسکرا کر آنسو پونچھ لئے —— اور اپنے جوڑے میں ٹنکے ہوئے گلابوں میں سے دو گلاب نکال کر اس نے ڈیربالڈ کے ہاتھ میں اس طرح رکھ دئے جیسے زندگی بھر کی پونجی سونپ رہی ہو۔

ڈیربالڈ نے ان پھولوں کو چوما اور ہاتھ بڑھا کر کھائی میں پھینک دیا۔

بردولے گیسٹ ہاؤز کی چڑھائی شروع ہو چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے آگے چل پڑے تھے۔ کوشلیا بہت تھک گئی تھی۔

ڈیربالڈ نے کہا "کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں ہی تھک گئے ہیں —— میں نے کبھی کبھی یوں بھی سوچا ہے کوش —— لیکن آج تمہارے سامنے اعتراف کر لینے سے دل کا بوجھ اتر گیا ہے۔ سوچتا ہوں تمہاری محبت نہ ملتی تو کس بھروسے پہ جی سکتا۔"

پیچھے سے آتی ہوئی کار نے راستہ کو منور کر دیا تھا ـــــ اس روشنی سے فائدہ اُٹھا کر کوشلیا نے ڈیر بالڈ کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کو ان آنکھوں میں پیار کے گھنے سائے نظر آئے جو کڑی دھوپ میں پناہ بھی دے سکتے تھے اور گھپ اندھیروں میں روشنی بن کر راستہ بھی سجھا سکتے تھے۔

پیارے لال کا موٹر فراٹے بھرتا ہوا قریب آ کر رُک گیا۔

"کوئی خدمت ـــــ؟ پیارے لال نے بظاہر ڈیر بالڈ سے پوچھا لیکن وہ کوشلیا کو تاک رہا تھا۔

"یہی کہ تم جا سکتے ہو ـــــ" ڈیر بالڈ نے رُکھائی سے کہا۔

موٹر کھڑ کھڑ کرتے جھول گیا ـــــ پھر فراٹے بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اس طرح بھی کوئی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے؟" ڈیر بالڈ نے اپنی ہی سوچ میں گم اس طرح اپنے آپ سے کہا جیسے کوشلیا سے کہہ رہا ہے۔

"واقعی موٹر بڑی سفاک سواری ہے۔ جانے والے کو منٹ بھر میں جدا کر دیتی ہے۔"

"میں بھی کبھی تمہاری زندگی سے اسی طرح گزر جاؤں تو ـــــ؟"

"گزر سکو گے؟"

"مشکل ضرور ہے لیکن شاید ناممکن نہیں۔"

کوشلیا ہنس پڑی ـــــ "جھوٹ کہہ کر دھولس جماتے ہو ـــــ میں تو کہتی ہوں کہ بہت آسان ہوتے ہوئے بھی تمہارے لئے اب ممکن نہیں۔"

ڈیر بالڈ نے کوشلیا کے ہنستے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔

چڑھائی ختم کر کے جب وہ بر دسلے کے احاطے میں پہنچے تو ڈیر بالڈ نے کوشلیا کا ہاتھ تھام لیا ـــــ میرے ساتھ بائیں اُدھر چلو۔ اب کی ہمیں کرہ بہت

اچھا ملا ہے ـــــ بردوے کے احاطے میں شامل ہو کر بھی جیسے بردوے سے الگ ہو۔"

چلتے چلتے کوشلیا نے بردوے کے احاطے پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی ـــــ بیولوں کے درختوں میں چھوٹے چھوٹے بجلی کے قمقمے پیارے سے لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بید اور پلاسٹک سے بنی ہوئی رنگا رنگ گول گول کرسیاں بکھری ہوئی بھلی لگ رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ شاید اپنے کمروں ہی میں تھے۔ کیوں کہ کمروں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور قہقہے روشنیوں کو لے کر اُڑ رہے تھے۔ اس خوب صورت سے احاطے میں کچھ لوگ اِدھر اُدھر چھتریوں کے نیچے بکھرے ہوئے تھے ـــــ رات خنک اور سرد تھی اس لئے بردوے کا احاطہ پُر اسرار خاموشیوں میں گھرا ہوا تھا۔

جو لوگ احاطے میں بیٹھے تھے وہ بڑی سنجیدگی سے جانے کن کن مسائل پر باتیں کر رہے تھے۔

بردوے کی عمارت روشنیوں اور قہقہوں سے جگمگا اور گونج رہی تھی۔ احاطہ خاموش تھا۔ اس تضاد کی جو پہلو بہ پہلو دیکھے جا سکتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ـــــ جنھوں نے بردوے کی عمارت کی تیز روشنیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے فرار چاہا تھا ـــــ کے چھتریوں کے نیچے مدھم اور رنگین روشنیوں کے گوشوں میں مصروفِ راز و نیاز تھے۔

ذرا سا ٹھٹک کر کوشلیا نے ڈیربالڈ کا ہاتھ دبایا۔

"وہ اس کونے میں کون ہیں؟"

ڈیربالڈ نے بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا ـــــ "وہ لوگ نہیں ہیں جن کی تمہاری نظروں کو تلاش ہے۔ شالو جہ اور بلونت تو یقیناً اپنے کمرے میں جا چکے ہوں گے۔"

"کیا وہ بہت پینے لگا ہے؟"

"نہیں، کچھ ایسا زیادہ تو نہیں بس ضرورتاً پی لیتا ہے۔"

کوشلیا خاموش ہو گئی۔

جب وہ اور ڈیربالڈ کمرے میں داخل ہونے کے لئے برآمدے کی سیڑھیاں طے کر چکے تو انھوں نے دیکھا کہ برابر کے کمرے کے باہر ایک خوب صورت سی لڑکی اکیلی بیٹھی اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی ــــ اس کے سامنے میز پر دو گلاس رکھے ہوئے تھے جو شاید وہسکی، برانڈی یا رم سے کچھ ہی دیر پہلے بھرے گئے تھے لیکن اس وقت ان گلاسوں میں نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ لڑکی کے مقابل والی کرسی خالی پڑی تھی ــــ وہ اس قدر گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کو کوشلیا اور ڈیربالڈ کی آمد کا پتہ نہ چل سکا۔

ڈیربالڈ نے اس لڑکی کو پہچان لیا ــــ سوٹ کیس رکھ کر اس نے اپنے کمرے کا تالا کھولا اور کوشلیا اور وہ کمرے میں داخل ہو گئے ــــ سوئچ آن کر کے اس نے لائٹ کھول دی تو کوشلیا نے کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے سوٹ کیس کھول کر وہسکی نکالو مجھے بڑی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔"

ڈیربالڈ نے سوٹ کیس میز پہ رکھ کر کھول دیا۔ بلجیم کٹ گلاس کا خوب صورت مگ نکال کر اس نے بڑے ادب سے جھک کر کوشلیا کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

"لیکن ڈیر میری بیئر کا تم نے کیا کیا؟ اس مگ میں تو وہسکی نہیں مجھے اپنی چہیتی بیئر پینی چاہیئے۔"

"فیوزے سے میں نے بیئر کے باٹل لے لئے ہیں اور پانی بھرے ٹب میں ڈال دئے ہیں۔ کمرہ محفوظ کرنے سے پہلے ہی میں نے بیئر کا انتظام کر لیا تھا۔"

"میں تمہاری ان نوازشوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

"صرف مسکرا کر، زبان سے کچھ کہے بغیر ــــ اس [illegible] شکریہ کے لفظ سے ہم ... [illegible] سے تھکنے لگتے ہیں اور آج تم خلاف معمول میرا بار بار شکریہ

ادا کر رہی ہو ــــ نوازش، عنایت، کرم، مہربانی، ان الفاظ کے استعمال سے تم میرے پاس ہو کر بھی کتنی دور معلوم ہوتی ہو۔"

مگ کو بیئر سے بھر کر ڈیر بالڈ نے وہسکی کی بوتل کھولی اور گلاس میں ڈالتے ہوئے اس نے کوشلیا کو سوڈا ملانے کے لئے کہا۔

ڈیر بالڈ کے گلاس میں سوڈا ڈالتے ہوئے کوشلیا نے پوچھا۔

"شانوجہ کا کمرہ کہاں ہے، کیا وہ لوگ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں؟"

"ابھی ابھی تم شانوجہ کو دیکھ چکی ہو ــــ لیکن اس نے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"کیا ــــ کیا وہ خوب صورت سی لڑکی ــــ وہ ــــ وہی۔"

"ہاں ــــ میں تو سمجھتا تھا کہ تم دیکھتے ہی پہچان لوگی۔ ــــ لیکن جب میں نے دیکھا کہ تم نے اس کو بغور نہیں دیکھا ہے تو خاموش ہو رہا ــــ"

"لیکن وہ شاید تمہارے متعلق ہی سوچ رہا ہوگا ــــ" کچھ دیر خاموش رہ کر ڈیر بالڈ نے اس طرح بات پوری کی۔

کوشلیا بلیم کٹ گلاس کے حسین مگ میں جھانک کر بیر میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ پھر اس نے مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ختم کر کے شیشے کا منہ احتیاط سے مگ میں جھکا دیا اور خالی مگ میں بیر کی سطح اونچی ہوتی گئی ــــ یہاں تک کہ وہ بھر گیا۔

"تم نے مجھے یہاں لا کر اچھا نہیں کیا ــــ" کوشلیا نے بڑے پچھتاوے کے ساتھ اس جملے کو ادا کیا۔

ڈیر بالڈ نے جس نے وہسکی کا گلاس ابھی میز پر رکھا تھا، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر بعد تم کہوگی کہ میں نے کچھ ایسا برا بھی نہیں کیا۔"

"تمہاری باتوں اور تمہاری دلیلوں کے چکر میں پڑ کر جانے میں کیا کیا مان لیتی ہوں۔ لیکن یہ جو سینے پر ایک پتھر سا دھرا ہے اس کو ہٹا سکوں گی؟"

"ہٹا سکتی ہو جبکہ تم اچھائی اور برائی کے تصور ہی کو ذہن سے محو کر دو۔"
"نہیں کر سکتی۔ جس عورت نے ہر سانس میں کرب محسوس کیا ہے اور گھنے سائے کے نیچے یہ جان کر رکتی رہی ہے کہ اسے آگے جانا نہیں ہے، وہ ابھی اتنی سفاک نہیں ہو سکتی۔"
"پھر وہ پتھر جو تمہارے سینے پر دھرا ہے وہ رہے گا۔"
"جانتی ہوں ــــ رہ سکتا ہے۔"
"لیکن جب تک یہ پتھر ہٹے گا نہیں تم شانو جہ کو کس طرح اپنا سکو گی۔"
"شانو جہ کو اپنانے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"بکواس کرتی ہو ــــ وہ تمہارا واحد ساتھی ہے جان، جسے تم چھوڑ نہیں سکتیں، وہ تمہیں چھوڑ دے تب بھی تم سے اس کی جدائی ممکن نہ ہو گی۔"
"اگر یوں ہو بھی تو کیا فرق پڑے گا ــــ یہی نا کہ مجھے اپنی مجبوریوں سے پھر ایک بار سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ شانو جہ کا باپ لپکتے ہوئے کوندے کی طرح میری زندگی میں داخل ہوا اور میری روح کو جلا کر اتنی تیزی سے نکل گیا کہ میں اسے پکڑ بھی نہ سکی۔ پھر کتنے ہی سرابوں کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ریت کے گھروندے بنائے لیکن نہ پانی کی بوند ملی نہ یہ گھروندے رہ سکے ــــ زندگی کے اس چٹیل اور تپتے ہوئے میدان میں تم ملے تو میں نے سوچا کہ چلو یہ بادل اُمڈ اُمڈ کر چھایا ہے بنا برسے چھٹے گا نہیں اور میں اس ننھے سے پودے کی جو یکہ و تنہا لق و دق صحرا میں سر اُٹھائے کھڑا ہے اب بڑے جتن سے آبیاری کر لوں گی ــــ لیکن تم ایک ایسے بادل تھے جو نہ کھلتے تھے نہ برستے تھے، اس کے باوجود میں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے پھر یہ سوچ کر بیٹھ رہی کہ چلو کچھ نہ سہی تم نے خواب تو دئے ہیں ورنہ جاگتی آنکھوں کو یہ بھی کہاں میسر آتے ہیں ــــ شانو جہ نے لیکن ان خوابوں کی بھی دھجیاں بکھیر دیں۔"
"تم چاہو تو ان دھجیوں کو سمیٹ سکتی ہو بکھرنے والے خواب پھر تمہاری آنکھوں

میں نیند بن کر سما سکتے ہیں ـــــ صرف اپنے سوچنے کے انداز بدل دو۔"

"میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا۔ سوچ سوچ کر ہی سہی جی تو لیتی تھی ـــــ زندگی کو میں نے آنکھ کھولتے ہی بیسوا کی طرح چکلے پر دیکھا اس کے باوجود اس کے ننگے سینے سے چمٹ کر زندہ رہی اس لئے کہ شانوجہ نے مجھے مرنے ہی نہ دیا۔ آج جب شانوجہ موت اور زندگی کے درمیاں سے ہٹ گیا ہے، میں سوچتی ہوں کہ آرام کیوں نہ لوں ـــــ تھک کر چور ہو گئی ہوں ـــــ زخمی پیروں سے کب تک راستہ ناپتی رہوں گی جب کہ نہ منزل ہے نہ منزل کا کوئی نشان ـــــ اب سوچنے کے لئے بھی کچھ نہیں رہ گیا۔"

ڈیر بالڈ نے اپنا گلاس خالی کر کے کافی مقدار میں وہسکی انڈیل لی اور بقیہ گلاس کوشلیا نے سوڈے سے بھر دیا۔

ڈیر بالڈ نے بڑے بڑے گھونٹ لئے اور نصف گلاس سے زیادہ خالی کر کے اس نے سگریٹ جلایا۔

کوشلیا خاموش تھی۔ ڈیر بالڈ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ کوشلیا نے اس کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا ـــــ وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا اور سر اوپر اٹھا کر چھت کی بلندیوں کی جانب دھواں پھینک دیتا ـــــ کوشلیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر وہ اکثر سگریٹ کا دھواں کوشلیا کے چہرے پر پھونک کر اس سے کہا کرتا کہ چاند کے ابر میں چھپنے کا سماں اس سے مختلف نہیں ہوتا۔

وہ بھی اپنا خاص جملہ دہراتی ـــــ "تم نے چاپلوسی شروع کر دی ہے اب مجھے ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔"

جب بھی کوشلیا زیادہ پی لیتی تو جانے اس کی آنکھوں میں اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے آ جاتے کہ وہ ہنستی تب بھی اس کی آنکھیں نم رہتیں۔

ڈیر بالڈ جانتا تھا کہ کوشلیا کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا سمندر بہنے کے لئے کسی نئے غم کا سہارا چاہتا ہے ـــــ ایسے کسی غم کا جو وہ سوبر ہوتی تو غم ہی نہ بن سکتا تھا۔

لیکن آج کوشلیا کے لئے ڈیر بالڈ کو سمجھنا مشکل ہو گیا تھا۔۔۔ اتنا مشکل کہ وہ اپنے آنسوؤں کو بھول گئی تھی۔

"تم آج پہچانے نہیں جاتے ہو۔۔۔" بیر کی نئی بوتل کو مگ میں احتیاط سے اونڈھلاتے ہوئے اس نے ڈیر بالڈ سے کہا۔

اس نے جیسے کوشلیا کی بات سنی ہی نہیں۔

"تم کہاں کھوگئے ہو۔۔۔؟" کوشلیا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

کچھ کہے بغیر ڈیر بالڈ نے کوشلیا کو لمحہ بھر کے لئے دیکھا۔۔۔ پھر گلاس اُٹھا کر اس نے ہونٹوں سے لگایا اور خالی گلاس میز پر رکھ کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

"تمہیں آج کیا ہو گیا ہے ڈیر۔۔۔؟" کوشلیا نے کرسی پر اپنی نشست سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا ہو سکتا ہے۔۔۔" ڈیر بالڈ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔۔۔ "میں تو صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ زخمی پیروں سے جب تم راستہ ناپتی رہی ہو کوئی تمہارے ساتھ بھی کبھی کبھی رہا ہے لیکن تم نے اس کو بالکل بھلا دیا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو ڈیر۔۔۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کس نے کس کو بھلا دیا اور کس نے بھلا دینے کی کوشش میں زندگی گزار دی۔۔۔" کوشلیا خاموش ہو گئی۔۔۔ ڈیر بالڈ نے پھر چپ سادھ لی تھی۔۔۔ کوشلیا کہنے لگی۔ "ہم ایسے مسافر ہیں کہ بس چلتے ہوئے بھلے لگتے ہیں، رُکتے ہیں تو سانس اُکھڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ سو اُٹھو ڈیر بھول جاؤ ان باتوں کو۔۔۔ آج پہلی بار تم روٹھے ہو اور میں منا رہی ہوں۔ محبت کا نہ پیمانہ ہے نہ ترازو۔۔۔ یہ تو ایک کھیل ہے زندگی اور موت کے درمیان۔ نہ میں حساب کتاب کروں نہ تم ناپو، اس کھیل میں ہار اور جیت تک کے فیصلے نہیں ہو سکتے۔"

ڈیر بالڈ نے نظریں اُٹھائیں۔۔۔ کوشلیا نے دیکھا اس کی آنکھوں کا سمندر، ڈیر بالڈ کی آنکھوں میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھا ـــــ "میں ابھی وہسکی لے آتا ہوں۔ تمہاری بیر لیتے وقت میں اپنی وہسکی لینا بھول گیا تھا۔"

"تمہیں فیوزے جانے آنے میں کافی دیر ہو گی۔ چلو میں بھی چلتی ہوں میں یہاں اکیلی کیا کروں گی۔"

"نہیں میں فیوزے نہیں جاؤں گا ـــــ میں نے پیارے لال سے کہہ دیا تھا' وہ لے آیا ہوگا۔ بس یہیں شاتو کے کمرے تک جانا ہے۔"

ڈیر بالڈ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کوشلیا اس کو دیکھتی رہی ـــــ وہ چلا گیا تو کوشلیا کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ جب وہ برد والے میں داخل ہوئی تھی تو اس کا بدن تھکان سے ٹوٹ رہا تھا لیکن اس وقت جب کہ وہ کرسی پر نیم دراز تھی خود کو بہت تازہ محسوس کر رہی تھی ـــــ بیر کا نشہ اس کے انگ انگ میں سرایت کر گیا تھا ـــــ تیز پینے کے سبب اس نے تیسری بوتل بھی نصف سے زیادہ چڑھالی تھی ـــــ کوئی اس کی آنکھیں موند کر لوریاں دینے کے درپے تھا اور وہ نیند کی آغوش میں اپنا آپا تج دینے کے لئے تیار تھی۔

اس نے پل بھر کے لئے سوچا ـــــ اب اس سے زیادہ جاگا نہیں جائے گا۔ ڈیر بالڈ آئے تو وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر سو جائے گی۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے دو ایک بار شانو جہ کو کبھی ساری میں کبھی فراک اور شلوار میں کبھی فوجی وردی میں دیکھا اور پھر اونگھ گئی۔

درمیان میں ایک آدھ بار اس کی آنکھ کھلی تو نیند کے غلبے نے کچھ سوچنے نہ دیا اور وہ آخرش گہری نیند سو گئی۔

جب وہ آنکھیں مل کر پوری طرح بیدار ہو رہی تھی تو اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی کٹیا میں نہیں ہے ـــــ اور اس نے بجلی کی سرعت سے کرسی پر اپنی نشست درست کر لی تھی اور ایک بھرپور جمائی کے دوران میں اس کا سر دار ذہن اس کا ہم خواسدہ

آنکھوں کو ساری کہانی یاد دلا چکا تھا کہ کس طرح، کب اور کیوں پردے میں آئی ہے۔

"ڈیر ــــ ڈیر ــــ" اس نے پکارا۔

پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھی ــــ پھر دلائی کو ایک کونے سے سرکا کر اس نے پلنگ پر دیکھا لیکن بستر پر ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔

وہ تڑپ کر بیٹھی، کسی نے حقائق کا جیسے اس پر انکشاف کر دیا، کسی نے اس کے کانوں پر ہونٹ رکھ کر جیسے سرگوشی کی۔ شانوجہ نے تم سے یہ رہا سہا سہارا بھی چھین لیا ہے ــــ تم شانوجہ کی ماں ہو ــــ یا اس کی ــــ یا اس کی سوتن ؟

نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں۔

اور کوشلیا پاگلوں کی طرح کمرے کے نمبر پڑھتی ہوئی شانوجہ کے کمرے سے آگے نکل گئی ــــ پھر اس نے ٹھہر کر اپنے حواس درست کئے۔ شانوجہ کے کمرے کا نمبر ٹھیک سے یاد کیا اور بند دروازے پر آ کر اس نے بے تحاشا دروازہ پیٹ ڈالا۔

شانوجہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا ــــ "کون ہے ــــ کون ہے" جھنجلا کر اس نے زور سے پوچھا۔

لیکن کوئی پاگلوں کی طرح دروازہ مسلسل پیٹ رہا تھا۔

شانوجہ نے اپنے ننگے جسم کے اطراف شال لپیٹنے کے لئے پلنگ سے جست لگائی۔ پھولوں کی پنکھڑیاں جو اس کی پشت اور کولہوں سے چپٹ گئی تھیں فرش پر آ گریں۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز شال لپیٹ کر دروازے تک جا پہنچا اور چٹخنی اتار دی تو دروازے کے دونوں پٹ بے سوا کے محرم کی طرح کھل گئے۔

کوشلیا نے شانوجہ کو اور شانوجہ نے کوشلیا کو سر سے پیر تک دیکھا۔

کوشلیا نے پوچھا ــــ "کہاں ہے وہ ؟"

شانوجہ مسکرایا ــــ اس نے کوشلیا کی پروا کئے بغیر کہا ــــ میرے بدن پر کپڑے نہیں ہیں ــــ میں شال کے اندر بالکل ننگا ہوں ــــ خلاف معمول تم اس ڈھنگ سے

کپڑے پہنے ہوئی ہو جیسے رات تم نے کپڑے اُتارے ہی نہیں ـــــ پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں ـــــ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ تم اب بھی مجھ سے یہ کہنے کے لئے نہیں آئی ہو کہ میں تمہیں ماں پکار سکتا ہوں۔"

کوشلیا نے شالو کے لگائے ہوئے زہریلے نشتر کو تڑپ کر محسوس کیا۔

"بکواس بند کرو ــــ مجھے پہلے یہ بتلاؤ کہ وہ ہے کہاں ؟"

"وہ جا چکا ہے۔ اور اگر ہوتا بھی تو تم اس کا کیا بگاڑ لیتیں ؟"

"تو تم اس کا پہلو بھی گرما چکے ہو ـــــ ؟ تم جانتے ہو ـــــ تم جانتے ہو کہ وہ میرا"

شالو چونکا ـــــ اس کی سمجھ میں آیا کہ کوشلیا پیارے لال کو نہیں اپنے ڈیر بالڈ کو پوچھ رہی ہے۔

شالو جو نے حقارت سے کوشلیا کو دیکھ کر کہا ـــــ "اونہہ ـــــ اس کی گرہ میں اتنے دام نہیں ہیں کہ وہ مجھے اپنے پہلو میں لے سکے۔"

"ورنہ تم اس کے بھی ہو جاتے ؟"

"جی نہیں ـــــ اس کے تو میں پتا جی کہہ کر پیر پکڑ لیتا۔ تم یہی چاہتی تھیں نا۔"

"مجھ پر طنز کرتے ہوئے افسوس ہے کہ تمہارا دل روتا نہیں ہے۔"

"رونے لگا، آہستہ آہستہ رونے لگا ـــ پہلے تم مجھے ان سارے مردوں کے حُلیئے بتا دو جو تمہارے ہو چکے ہیں، تاکہ جب وہ میری طرف ہاتھ بڑھائیں تو میں ان کی کلائی مروڑ کر پوچھوں کہ تم میرے باپ تو نہیں ہو ـ پھر ان کا گریبان پکڑ کر تمہارے سامنے لے آؤں ـــــ تم سے کہوں کہ ماں پہچانو یہ میرا باپ تو نہیں ہے ـــــ اور جب تم نفی میں سر ہلاؤ تو اپنا جسم اس کی آغوش میں دے دوں اور جو تم پہچان سکو کہ وہ کبھی تمہارے ساتھ بھی سو چکا ہے تو میں اس کی ادا کی ہوئی ساری رقم لوٹا کر اس کے پیر پکڑ لوں کہ پتا جی مجھے معاف کر دو۔"

کوشلیا مبہوت کھڑی شالو جو کی لن ترانی سُنتی رہی ـــــ پھر اس نے ہاتھ کانوں پر

رکھ لئے اور چیخ پڑی ــــ "شانو ــــ شانو ــــ بس کرو شانو"

کوشلیا کی چیخ کا یہ تیر شانو کے دل پر ترازو بن گیا ــــ کوشلیا کو گھائل کرتے کرتے اس کی بے بسی پر خود شانو گھائل ہو گیا۔

وہ منٹ بھر خاموش رہا ــــ پھر بڑھ کر اس نے کوشلیا کو سہارا دیا جو دروازے کا پٹ تھامے سسک رہی تھی۔

سہارا پا کر کوشلیا کمرے میں چلی آئی پھر اس نے شانو کو نظر بھر کر دیکھا پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

ہاتھ بڑھا کر شانو نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اس کو چٹخنی بہت مشکل سے نظر آئی۔ کیونکہ آنسو نظروں کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔

اس نے کوشلیا کو بھینچ لیا ــــ "ماں" ــــ تو کیسے انکار کر دے گی ماں کہ تو میری ماں نہیں ہے ــــ میں تجھے جانتا ہوں ماں۔ تو نے سالوں کے پیچھے زندگی تباہ کی ہے ــــ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس جہنم سے تو بھاگتی رہی ہے میں اسی جہنم میں تجھے کھینچ لایا ہوں ــــ میں کبھی کوئی خوش نہیں ہوں لیکن مجھے کوئی افسوس بھی نہیں ہے ــــ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ میں بہتوں سے اچھا ہوں۔ وہ لوگ جو مجھ پر بے دریغ لٹاتے ہیں وہ مجھ سے بڑے مجرم ہیں ماں ــــ ان کی گرہ میں جو دام میرے لئے ہوتے ہیں وہ رشوتوں اور ناجائز ٹھیکوں سے کمائی ہوئی دولت کا ایک حقیر سا حصہ ہیں' لیکن زمانہ ان کے آگے جھکتا ہے' ان کی بڑی بڑی موٹریں آنکھوں کو خیرہ کر کے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ آدمی کو آدمی کا خون نظر نہیں آتا ــــ ہمارا جرم تو اتنا ہے کہ ہم اپنے ہی خون میں زہر ملا کر مگن ہو بیٹھے ہیں ــــ کل جب ایک اچھے سے بنگلے اور اچھی سی کار میں بیٹھ کر تو اور میں نکلیں گے تو کتنی ہی نظریں تعظیم کو جھک جائیں گی۔ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بہت سے دیکھے ہیں' دولت کی خدائی سے انکار کرنے والا تو نے آج تک دیکھا ہے ماں۔"

کوشلیا نے سب کچھ سننے کے بعد بھی شانو کے سینے سے گردن اٹھائی تو

اس نے یہی سوال کیا۔

"سچ بتا دے شانو کیا وہ یہاں آیا تھا؟"

"نہیں ماں، وہ میرے پاس جا ہے بھی تو آ ہی نہیں سکتا۔۔۔۔ میں اس کی پہنچ سے باہر ہوں۔۔۔۔ تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں۔"

"پیارے لال کہاں ہے؟"

"وہ رات ڈھلتے جا چکا ہے۔۔۔۔ اسے صبح ہونے تک برہمن لبستی سے ہو کر شہر پہنچنا ہے، ہو سکتا ہے کہ ڈیر بالڈ بھی اسی کے ساتھ گیا ہو۔۔۔۔ لیکن تو اس قدر دل گبر کیوں ہوتی ہے۔۔۔۔ جانے دے، رہتا ہے تو تجھے کون سا نہال کر دیتا ہے۔ اُلٹے تو ہی اس پر خرچ کرتی ہے۔"

کوشلیا خاموش ہو رہی۔۔۔۔ "نہیں رے۔۔۔۔" پھر وہ آگے کچھ اور نہ کہہ سکی۔ اس نے اپنی دونوں آنکھوں کو دونوں ہاتھوں کی پشت سے مل کر خشک کیا اور سکرا کر کچھ اس طرح شانو کو دیکھا جیسے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کا اعتراف کر رہی ہو۔

پھر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے کہہ دیا۔۔۔۔ "تو ایک دم کتنا ہوشیار ہو گیا ہے شانو۔"

شانو ہنسا۔۔۔۔ "ایک دم ہوشیار ہو گیا ہوں۔۔۔۔؟" اس نے سوالیہ طور پر دہرایا۔ اور جب پلٹ کر پلنگ کی طرف بڑھنا چاہا تو شال کا ایک حصہ جسے وہ اوڑھے ہوئے تھا س کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے پیچھے اس طرح جھول گیا کہ کوشلیا نے اس کی پشت پر ور اس کے کولہوں پر پیلے گلاب کی پنکھڑیاں چپٹی ہوئی دیکھیں۔

یہ گلاب پیارے لال کے لئے شاید شانو نے اس وقت توڑے تھے جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے جھیل پر آیا تھا۔

کوشلیا نے بڑھ کر شال اس کی پشت پر اس طرح برابر کر دی جیسے اپنا ہی بدن چھپا رہی ہو۔

"تو اب میرے ساتھ چلے گا نا۔۔۔۔" کوشلیا نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

" تو تیرے گھر میں میرے لئے جگہ نکل آئی ہے ۔۔۔؟ میں جانتا تھا ۔۔۔ تو مجھے اپنے گھر سے نکال دے بھی تو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی ۔"

" کل پیارے لال سے ڈیرہ بالڈنے اپنے لئے وہسکی منگوائی تھی؟ تو جانتا ہے کچھ؟"

" نہیں ماں ۔۔۔ منگواتا تو وہ ضرور لینے آتا اور جو لے نہ جاتا تو یقیناً بلّو میرے پاس چھوڑ جاتا کہ میں اسے دے دوں ۔۔۔ بلّو آدمی برا نہیں ہے ماں۔ کم سے کم اتنا تو ہے کہ جھوٹی سچی محبت جتلا کر مفت میں میرے جسم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا ۔"

" کون بلّو ؟"

" بلونت یعنی تمہارا پیارے لال ' اسے میں پیار سے بلّو پکارتا ہوں ۔"

" تو اسے چاہتا ہے اتنا ؟ "

" ہاں ماں ' دام کھرے ہو جاتے ہیں تو میں رات کی رات ہر اس مرد کو اتنا ہی چاہتا ہوں جس کے ساتھ رات گزاری ہوتی ہے ۔"

" پر سُنا ہے کہ پیارے لال تیرے پاس زیادہ ہی آتا ہے ۔ پہلے بھی تو اس سے چھپ چھپ کر ملتا رہا ہے ۔"

" اس لئے کہ پیارے لال مجھے پسند کرتا ہے ۔ تو کہہ سکتی ہے کہ چاہتا ہے ۔ بالکل اس طرح جیسے تو ڈیرہ بالڈ کو چاہتی ہے ۔"

کوشلیا خاموش ہو رہی ۔

" دیکھ تو پو پھٹ رہی ہے ۔۔۔ اچھا تو ذرا میرے بستر پر لیٹ رہ ۔ میں نہا دھو کر تیار ہو لوں ۔"

شانو جب غسل خانے میں چپکے سے داخل ہو گیا تو کوشلیا نے بستر پر بکھری ہوئی پیلے گلاب کی پنکھڑیاں دیکھیں ۔ پھر بستر کی شکنوں اور سلوٹوں نے پتہ نہیں کیا کیا ۔۔۔ اسے سنائیں ۔۔۔ وہ چپکے سے شانو کے بستر کے قریب سے ہٹ آئی اور کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی لیکن وہ پھر اداس ہو گئی تھی ۔

شانو نہا دھو کر مردانے کپڑے پہن آیا تب وہ بھی اسے بج رہے تھے۔ اس نے کہا "ماں، ذرا فیونے کو فون کرلوں، آج پر دے کھیا کھچ بھرا ہوا ہے کوئی نہ کوئی ٹیکسی ہوگی ہی۔"

"کتنی دور ہے ——— اب تو ٹیکسی سے کم چلے گا نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے ماں ——— دیکھ نا ساتھ کتنا ہی سامان ہے۔" اور شانو جو نے جھک کر پلنگ کے نیچے سے دو سوٹ کیس گھسیٹ نکالے۔ پھر بید کی ایک بیکٹ نکالی جو مقفل تھی۔ "اس میں اچھی اچھی شرابیں ہیں۔" اس نے بید کی بیکٹ کو بتلاتے ہوئے کہا ——— "اور میں تیرے لئے بہت کچھ لایا ہوں ماں۔ رسٹ واچ، ساریاں۔ تو ذرا ہنس دے ——— ہنس دے نا ——— سنا ہے تو میرے لئے ایک ایک پل روتی رہی ہے۔"

کوشلیا ہنسنے لگی تو اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

اس نے پوچھا ——— "تجھے کس نے بتایا شانو !!"

"میں نے تو خود تجھے خوابوں میں روتے ہوئے دیکھا ہے ماں" ——— اور اس نے کوشلیا کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور اس کے گال چوم لئے اور فون کرنے کے لئے تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔

لوٹ کر اس نے بتایا کہ ٹیکسی آرہی ہے۔

"میں بھی اپنا سامان لے آتی ہوں ———" کوشلیا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی تو شانو نے پکار کر پوچھا ——— "کیا کوئی وزنی سامان ہے ماں ؟"

"نہیں شانو۔" اس نے جواب دیا اور دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ شانو اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

کمرے میں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی دو ایک چیزوں کو اس نے ڈیر بالڈ کے سوٹ کیس میں رکھا جو وہ چھوڑ گیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھیڑے بغیر کمرہ خالی کر کے چل پڑی۔

شانو نے دونوں کمروں کا بل ادا کیا ——— تو کوشلیا کو ڈیر بالڈ کی یہ بات اچھی لگی کہ اس نے پورے دنوں کا بل ادا کرنے کی زحمت نہ کی۔ کوئی اور دن دیکھا

کرتا تو شاید کوشلیا اتنا زیادہ محسوس نہ کرتی۔ وہ ڈیر بالڈ کو شالو کے سامنے کسی طرح بھی شرمندہ ہوتا نہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شالو اپنے پیارے لال کی تعریفیں اس طرح نہ کرے کہ کوشلیا کو ڈیر بالڈ سے تقابل کا احساس ہو۔ اور شالو ہمیشہ کچھ اسی ڈھب سے باتیں کرتا تھا کہ ڈیر بالڈ جیسے اس کے لئے ناپسندیدہ اجنبی ہے۔ وہ تو کوشلیا کے ساتھ اتفاقاً پیسے بالکل نہ تھے —— اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی اور جو ہوتے تو یقیناً وہ جھٹ سے بڑھ دے کا بل چکاتی ہوئی کہتی کہ ڈیر بالڈ اپنی پرس یہیں چھوڑ گیا ہے تاکہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو —— لیکن اب سوائے شالو کو دیکھتے رہنے کے کوشلیا کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹیکسی میں شالو کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ ڈیر بالڈ اپنی رقم اسی کے صندوق میں چھوڑ گیا ہے —— لیکن چابیاں کہاں ہیں —— ؟ اس نے جلدی سے اپنی ساڑی کا پلو دیکھا جو بغیر کسی سلوٹ کے بالکل ستھرا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر اپنے نیچے میں ٹٹولا۔ پھر اس نے ٹیکسی رکوائی جو اسٹارٹ ہو چکی تھی اور پٹ سے دروازہ کھول اتر پڑی۔

"کیا بات ہے ماں ؟"

"چابیاں بھول آئی ہوں" —— لیکن ٹیکسی سے اُتر کر وہ دو قدم چلی ہی تھی کہ اس کو یاد آگیا کہ چابیاں ڈیر بالڈ نے اپنے کوٹ کی جیب ہی میں رکھ لی تھیں۔

وہ بناوٹی ہنسی ہنس کر لوٹ آئی اور ٹیکسی پر پھر سوار ہوتے ہوئے کہا کہ اسے یاد آگیا ہے اس نے چابیاں سوٹ کیس میں رکھ لی ہیں، وہ بظاہر اطمینان سے شالو کے پاس بیٹھ گئی —— وہ نہیں چاہتی تھی کہ شالو کو بتلائے کہ ڈیر بالڈ نے اتنی بڑی رقم اس کے پاس رکھی ہے۔

ٹیکسی روانہ ہوئی تو کھائی کے قریب پہنچ کر اس نے ڈیر بالڈ کو اس مقام پر یاد کیا جہاں کھائی میں پھول پھینکنے سے قبل ڈیر بالڈ نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور اپنی محبت کی ہمیشہ کی طرح قسمیں کھائی تھیں۔

"ماں تم کا بھی مجھ سے خفا ہو گا —— کیوں ہے نا" شالو جو یکایک پوچھ بیٹھا

تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔
"کاکا کی خفگی کتنی شانو —— ہم ہنستے ہیں تو وہ غصّہ بھول جاتا ہے۔ مجھے روتا ہوا دیکھتا تھا تو مجھ پر کڑھتا تھا۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھے گا تو مجھے یوں سینے سے لگائے گا جیسے تو نے کوئی کارنامہ کیا ہے۔
"میں نے بہت بڑا کارنامہ تو کیا ہے ماں۔"
"یہی نا کہ مجھے سو سو آنسو رلایا ہے۔"
"نہیں ماں، جس آدمی کو میں نے رجھا کر اپنا لیا ہے، اس کے پاس بے شمار دولت ہے اور میرا عاشق ہے۔ دیکھ لینا ہم اس سے کتنا کما لیں گے۔ مجھے یقین ہے ماں کہ وہ دو چار دن ہی میں موٹر بھیج کر مجھے ملائے گا۔ عجب نہیں جو خود چلا آئے۔ کہتا تھا کہ جھیل کے کنارے تمہارے یہ دفعا جھونپڑے کی تعریف سنی ہے، کبھی آکر دیکھوں گا تاکہ اس جھونپڑے کو ایک چھوٹے سے نہایت خوب صورت بنگلے میں بدل سکوں۔ ایسے بنگلے میں جس میں میرا حسین شانو آرام سے رہ سکے اور یہ کہتے کہتے اس نے مجھے کھینچ کر اپنی گود میں بھر لیا تھا —— اور پھر ——"
"ہشت —— تو کتنا بے شرم ہو گیا ہے رے"۔
کوشلیا نے اس کو ٹوک دیا —— لیکن شانو بغیر کوئی پرواہ کئے ہنس پڑا۔
وہ موٹر کے باہر پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کو کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے جھیل کے کنارے صرف اپنا حسین و جمیل چھوٹا سا بنگلہ دیکھ رہا ہو جو دوڑتے ہوئے موٹر کے باہر بار بار اس کی نظروں سے ہو کر پیچھے بھاگ رہا ہو۔
اس نے باہر ہی محویت کے عالم میں دیکھتے ہوئے پھر بولنا شروع کیا۔
"ماں جب خان آئے گا تو میں اس سے کہوں گا کہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ برد ولے، نیونسے اور جھیل کی اس سرزمین پر میں خان کی آغوش میں اسی وقت آؤں گا جب کہ جھیل کے کنارے میرا بنگلہ تعمیر ہو جائے اسی بنگلے میں خان مجھے

اپنا سکے گا۔ اس وقت تک وہ مجھے اس سرزمین پر ہاتھ نہیں لگا سکے گا ـــــ وہ اس مقصد کے لئے مجھے یہاں سے دور کہیں بھی لے جا سکتا ہے ـــــ تو دیکھنا ماں۔" وہ کچھ سوچ کر پھر کہنے لگا۔ "حان کو مجھ سے ایک پل کی جُدائی بھی گوارہ نہ ہوگی ـــــ جب یہاں تک آکر بھی وہ مجھے اپنانے سے محروم رہے گا تو میری ضد پوری کرنے کے لئے فوری تعمیر شروع کر دے گا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر دو ایک دن کے لئے چلا جائے گا ـــــ میں نے اُس پر جادو کر دیا ہے ماں۔

ـــــ جادو۔"

کوشلیا نے شالو کو دیکھا تو اس کو محسوس ہوا کہ شالو بھی اس کی طرح کسی خیالی دنیا میں رہتا لگتا ہے ـــــ فرق صرف اتنا ہے کہ شالو کی دنیا خوب صورت بنگلوں اور موٹروں سے بنی ہے اور اس کی اپنی کچے گھروندوں اور چاندنی راتوں سے۔

ٹیکسی جھیل کے باغ کے چھوٹے سے گیٹ پر رکی تو ہارن بجانے پر بھی کاکا نہیں آیا ـــــ وہ نفناً اسی صبح بھی کسی کو بجرے میں جھیل کی سیر کرا رہا ہوگا۔

"ماں ـــــ میں کاکا کو اب کچھ کرنے نہ دوں گا ـــــ اسے آرام سے رکھوں گا ماں۔"

کوشلیا نے پلکیں جھپکا کر ایسی آنکھوں سے شالو کو دیکھا جیسے اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

جب وہ جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے تو سامان اُٹھا کر لے چلنے والوں میں ان کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا ـــــ کرایہ اور انعام دے کر شالو نے سامان اندر رکھا اور جھیل کی طرف کاکا کو دیکھنے کے لئے چل دیا تو کوشلیا بھی تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے سونے کے کمرے میں پہنچی جہاں اس نے صندوق میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم رکھی تھی۔

صندوق کا قفل کھلا ہوا تھا ـــــ اس نے کنڈی سے قفل الگ کر کے جھٹ سے صندوق کھولا تو اس کو اوپر دھری ہوئی ایک چٹھی نظر آئی ـــــ اس نے لپک کر چٹھی نکال لی اور پڑھنے لگی۔

"دشمن ہوش میری محبوبہ دلنواز کوش!"

میں تمہارا ہوں، تمہارا رہوں گا۔ تم نے آج کمرے پر اپنے دکھ درد کا ذکر کیا لیکن مجھے اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے میں تمہارے غموں کا ساتھی نہیں۔ میں بہت اُداس ہو گیا تھا اور تم سے جو کہنا چاہتا تھا وہ کہہ دینا مجھے اس وقت کچھ مناسب معلوم نہ ہوا ـــ میری بچی کی شادی ہے اور مجھے پیسے کی ضرورت ہے ـــ میں چاہتا تھا کہ تم سے جس قدر قرض مل سکتا ہے حاصل کر دوں تاکہ میری پریشانی تمہاری ہمدردی اور محبت کے ہاتھوں سکون میں بدل سکے۔ تم جانتی ہو کہ اس کاروباری دنیا میں لڑکے والے لڑکی سے نہیں اس کے پیسے سے بیاہ رچاتے ہیں۔ تم میرے اس درد کو جس طرح جان سکتی ہو شاید دوسرا نہ سمجھ سکے اس لیے کہ تم پر بیتی ہے۔ تمہاری ماں نے تمہارے بے پناہ حسن کے باوجود تمہارے ہاتھ اس لیے پیلے نہیں کئے کہ وہ آسمان سے دھن برسنے کے انتظار میں تھی اور تم اس دھن کا انتظار کئے بغیر شانو جہ کے باپ کے ساتھ بہت دور نکل گئیں ـــ اتنی دور کہ پھر لوٹ نہ سکیں ـــ کوش میں اپنی رقم کے علاوہ تمہارے صندوق میں جو کچھ رقم مل سکی لے جا رہا ہوں ـــ صرف آٹھ سو اکیاسی روپے ملے ہیں۔ میں تمہیں ایک ایک پائی لوٹا دوں گا کوش ـــ جان دیکھو نا۔ مجبوری کیسی بُری بلا ہے ـــ وہ بھی کسی نادار باپ کی مجبوری، میں بجائے اس کے کہ تمہارے ناز اُٹھاتا تمہارے احسان اُٹھا رہا ہوں۔

تمہیں شادی کی تاریخ لکھوں گا ـــ آؤ گی ـــ؟ میں جانتا ہوں تمہارا دل اتنا بڑا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گی ـــ اور یہ سوچ سوچ کر میں خوش ہوں کہ چلو میرے کام آئیں تو تم آئیں، تم جو میری زندگی کی پونجی ہو ـــ ورنہ جانے میں کن کن کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔

تمہارا ہمیشہ تمہارا

سعید الزماں ڈیر بالڈ"

جب کوشلیا نے کاکا اور شانو جہ کو جھیل کی طرف سے لوٹتے ہوئے دیکھا تو وہ چلا اٹھی

کے اسی خط کے بارے میں سوچ رہی تھی جسے ابھی ابھی پڑھ کر وہ اپنے صندوق میں چھپا آئی تھی۔

کوشلیا کو مسکراتا ہوا دیکھ کر کاکا نے کہا — "آج بیٹا گھر آیا ہے تو تیرے ہونٹ ہی نہیں وہ آنکھیں بھی مسکرا رہی ہیں جو بات بات پر بھر آتی تھیں — اتنے سارے آنسو تم نے کہاں چھپا دیے اب؟"

کوشی نے کاکا کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا — "آج میری زندگی کسی کے کام آئی ہے کاکا، میں بہت خوش ہوں۔"

کاکا نے کوشلیا کی بات سمجھی ہی نہیں۔

شالو نگر پوچھ بیٹھا — "ہمیں بھی تو بتا ماں — ہم بھی تو تیری خوشی میں حصہ دار ہیں۔"

کوشلیا منٹ بھر کے لئے سوچ میں پڑ گئی — پھر اس نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

"ڈیر یا لڈ کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے شالو — میں نے اس کے لئے اچھا سا بر ڈھونڈا تھا۔"

شالو بے ساختہ ہنس پڑا — "تو بہت معصوم ہے ماں۔ بھولی بھالی —

"تو نے اس لڑکی کے لئے بر ڈھونڈا ہے جس کا کوئی وجود ہی دنیا میں نہیں ہے — سعید الزماں کے کوئی لڑکی ہے نہ کوئی بیوی۔"

"چل پگلے — وہ بھلا مجھ سے جھوٹ کیوں کہے گا" — کوشلیا نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی آنکھیں کچھ اس طرح شالو کو تک رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ اگر یہ جھوٹ بھی ہے تو اس جھوٹ کو مجھے سچ مان لینے دے شالو۔

شالو نے کوشلیا کی حیرانی دیکھی تو اس کی کمر میں گدگدا کر کہا — "ماں تو ڈیر یا لڈ کی ساری ہی باتوں کو سچ مانتی ہے — اور جو میں کچھ کہتا ہوں تو اس پر یقین کر لیتی ہے — خود سے اس نتیجے پر پہنچتی ہی نہیں کہ ہم دونوں میں کون جھوٹا ہوگا — ہو سکتا ہے کوئی اس کی بیٹی ہو — میں نے تو یوں ہی مذاقاً کہہ دیا تھا ماں —"

اور شالو جیسے ہی تیرا بدل کر سوچا کر لی یا لڈ کے اس جھوٹ کے پیچھے جانے کتنی باتیں

چھپی ہیں جو آہستہ آہستہ ماں اسے تب ہی بتلائے گی جب کہ یہ جھوٹ چھپا رہے۔

لیکن کوشلیا ساری باتوں سے بے نیازسی دور، دور تحصیل کی سمت کچھ ڈھونڈ رہی تھی ——— اسے کون سمجھا سکتا تھا کہ ——— کوئی سچائی ان آنکھوں کو نہیں ملتی جو اتنی دور دور تک دیکھتی ہوں۔

شام ہوئی تو بہ درلے کی کھائی پر آدمیوں کا ٹھٹھ جمع تھا۔

جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی کپڑے کی دھجیوں کو دیکھ کر کاکا کا شبہ یقین سے بدل گیا تھا کہ وہ کوشلیا ہی تھی جس کے سائے کو کھائی کے مُنہ پر ڈولتے ہوئے اس نے دیکھا تھا ——— کاکا میں دو قدم چلنے کا یارا نہ تھا اور لوگ اسے سہارے ہوئے تھے۔

پیورے کا پیر اصمصام دین درخت کی اوٹ میں چھپا سِسکیاں بھر کر اس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا جس کا نیا نویلا کھلونا ٹوٹ گیا ہو ——— ایسا کھلونا جسے ابھی اس نے بس چھوا تھا۔

ستالو جو اسی کھائی کی طرح خاموش تھا جس میں ابھی کچھ دیر پہلے بڑی ہل چل سی مچی تھی۔

ہینس کہہ رہا تھا۔ کوشلیا ایک بڑی عورت تھی، ایک عظیم ماں جسے نہ محبت کا سُکھ ملا نہ ممتا کا۔"

پاس ہی کسی فاختہ کی آواز آرہی تھی اور سائے گہرے ہو رہے تھے اور دن ڈوب رہا تھا اور انسانوں کے اس غول میں کتنے دل ڈوب رہے تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا۔

کیمیائے دل

جیلانی بانو



کیا لمبے بال پوری زندگی کو الجھا دیتے ہیں۔

ابھی مجھے شہزاد آپا کے کٹے ہوئے بال دیکھ کر خیال آیا کہ اُن کی کہانی بھی اُن کے بالوں کی طرح لمبی تھی۔ ان کے بال سارے حسین گڈھ میں دھوم مچا گئے۔

ہو سکتا ہے وہ اپنے لمبے بال کھول کر اس دن میرے ساتھ پھاٹک تک نہ آتیں تو یوں موضوع سخن نہ بنتیں۔ یا پھر ان کا وہ حیدرآبادی منگیتر ہی دغا کر جاتا جس کی یاد میں وہ بیراگن بن گئیں۔ شہزاد آپا کو آپ کسی وقت بھی دیکھتے تو یوں لگتا جیسے ابھی آنسو پونچھ کر آئی ہیں ——— بھیگی بھیگی سی گلابی آنکھیں، چاندنی کی طرح چھٹکنے والا رنگ اور نہایت مریلی مدھم سی آواز جیسے اب بول کر کبھی نہ بولیں گی۔

اب سوچتی ہوں کہ وہ تو اچھی خاصی کسی اسلامی ناول کی ہیروئن بن سکتی تھیں مگر ہائے ہیرو ——— افسوس کہ آج کل ہیروؤں کا سخت قحط پڑا ہوا ہے۔ ورنہ میں ایک تہلکہ خیز اسلامی ناول لکھتی جس کی ہیروئن ہوتیں شہزاد آپا ———

میں نے بچپن سے اب تک جتنی بار شہزاد آپا کو دیکھا ہے اس میں سے آدھی بار وہ رو رہی تھیں باقی آدھے دنوں میں سے بھی آدھی بار کچھ سوچ رہی تھیں۔ بعض لوگوں کو بسورنے کی عادت ہو جاتی ہے کسی وقت ہنس پڑیں تو یوں شرمندہ ہو جاتے ہیں جیسے کوئی گناہ کر بیٹھے ہوں۔ شہزاد آپا قہقہہ نہیں لگا سکتیں۔ مجھے اس بات پر پکا یقین تھا۔ حالانکہ جس دن اپنے بال ترشوا کے انھوں نے اپنی کہانی ختم کی ہے

تو وہ ہنس رہی تھیں۔

اسی لئے جب آج میں نے رفیع ماموں کو سنا یا کہ شہزاد آپا یوسکو سے واپس آ چکی ہیں اور اپنے کمرے میں بیٹھی شراب پی رہی ہیں اور یہ قہقہے ان ہی کے ہیں تو ہمیشہ کی طرح انھوں نے مجھے جھوٹا سمجھا۔

(اس سے پہلے بھی جب میں شہزاد آپا کی معصومیت اور مظلومی کے قصے انھیں سناتی تھی تب بھی وہ یقین نہیں کرتے تھے)

شاید آپ کو بھی اس بات پر مشکل ہی سے یقین آئے کہ ایک پانچوں وقت کی نماز پڑھنے والی، ہمیشہ سفید کپڑے پہننے والی اور ٹخنوں تک سے پردہ کرنے والی لڑکی ——— ایک ناقابل یقین بلاؤز پہنے، بال کٹائے، میک اپ کئے، شراب پی رہی ہے ——— ہاتھ میں سگریٹ جل رہا ہے اور اس کے سامنے شام کی پارٹی کا کوئی خوبصورت سا دعوت نامہ رکھا ہے۔

لیکن ہمارے حسین گڑھ میں ایسے بے شمار انقلاب آ چکے ہیں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ یہاں کی آب و ہوا کے بارے میں لوگوں نے بہت سی روائتیں گڑھ لی ہیں ——— کہ جو لوگ ایک بار یہاں کا پانی پی لیں وہ موم بن جاتے ہیں ——— اب بنانے والے چاہے اس موم کا بھگوان بنا لیں یا شیطان ———

حسین گڑھ کی بات ہو رہی ہو تو جانے کیوں مجھے شہزاد آپا یاد آتی ہیں سب سے پہلے انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔

"ہنو۔ مجھے حسین گڑھ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اور میں ان کی باتیں سن کر خوب ہنسا کرتی تھی۔ شہزاد آپا بات بات پیچھے "ہنو جی، نکو جی" کہہ کر گردن ہلایا کرتی تھیں۔ ان دنوں ہمارے محلے کے سب بچے قدیر کو ہنو جی، نکو جی کہہ کر چڑاتے اور پھر ہم سب ———

(ارے ٹھہریئے ——— پہلے میں آپ کو شہزاد آپا کے بارے میں کچھ بتاتی چلوں ——— سچ تو اصل بات تو مجھے بھی آج تک نہیں معلوم ہوئی میں تو صرف اتنا جانتی تھی کہ ہمارے گھر سے ملا ہوا

" حاجی صاحب کا جو گھر تھا" الف لیلیٰ " تو وہ پنجابی خاندان اس گھر کو خالی کر گیا تھا۔ ان پنجابیوں کے شیطان صفت لڑکوں سے بھری آئے دن سر پھٹول ہوا کرتی تھی۔ لیکن "الف لیلہ" میں گئے بغیر چین بھی نہیں پڑتا تھا۔ منوں تو پھلوں کے پیڑ تھے وہاں کے صاحب کھٹالے لیجئے۔ اور آم ـــ جامن ـــ بیر ـــ نارنگیاں ـــ گلاب ـــ موتیا اور اور ـــ اسے کیا کہتے ہیں! وہی جو گول گول اناروں کی شکل کے پھل ہوتے ہیں ـــ یعنی وہی انار ـــ

یہ تو سارے کھٹے میٹھے پھل، انتہائی کڑی نگرانی میں پکتے تھے۔ کیونکہ ان لڑکوں کی ایک مسلسل بولنے والی بڑھیا دادی کھاٹ ڈالے باغ میں بیٹھی رہتی تھی۔ حقّہ پیئے جاتی اور سو سے لڑے جاتی۔ مجال تھی کہ کوئی بچہ ایک پتہ توڑ لے۔ محلے کے بچے بھی اسے مار ڈالنے کی ترکیبوں پر غور کرتے تھے۔

تو خیر ـــ دوسرے دن خوب بیر ہوا چل رہی تھی۔ گرمیاں شروع ہو رہی تھیں اور بدلتے موسم نے دل میں عجیب سی بے چینی بھر دی تھی کہ اسکول سے آنے کے بعد میں سارے گھر میں کودتی پھرتی۔ آسمان پر پتنگیں ڈھونڈتی اور سارے محلے کے پھلوں والے درختوں کا حساب رکھتی تھی۔ اس وقت بھی یقین تھا کہ پنجابیوں کے آنگن میں خوب کچی امیاں گر رہی ہونگی۔ پنجابی لڑکوں کے بغیر گلی سائیں سائیں سنسان پڑی تھی۔ جانے کیوں پڑوسی ہمیشہ برے لگتے ہیں۔ مگر جب چلے جائیں تو ایک میٹھی کسک بن کر اکثر یاد آتے ہیں۔

میں اکیلی اپنے پھاٹک کے منڈیر پر چڑھی دوسرے گھروں کے لان تاک رہی تھی کہ ایک کے پیچھے ایک چھم چھم کرتے کئی تانگے آئے اور "الف لیلہ" کے دروازے پر رک گئے۔

جانے کتنا تو سامان بھرا تھا ان تانگوں میں اور بڑی گوری گوری صورتیں جھانک رہی تھیں میری نظریں تو بس ایک لڑکی پر جم گئیں جو لمبا سا سفید کرتا پہنے تھی تنگ موری کا پاجامہ اور اس پر ساری کی طرح کمر سے لپٹا ہوا دوپٹہ۔ اس لڑکی کی دو سنہری چوٹیاں پیروں کو چھو رہی تھیں ـــ ہائے اللہ اتنے لمبے بال ـــ! بس اسی لمحے مجھے وہ لڑکی ہزار جان سے پسند آگئی۔ حالانکہ چھوٹی والی دوسری سانولی لڑکی کے بال بھی بہت لمبے تھے۔ وہ میری ہم عمر ہوگی۔

اور بمبئی لڑکی کی طرح وہ بھی تنگ پاجامے پر کلی دار کرتا پہنے تھی اور ہمدرد کی ایک واسکٹ بھی۔
وہ اندر جاتے ہی خوب ہنسنے لگی اور خوب چلا رہی تھی۔
"امی امی اپنے گھر میں پھلوں کے جھاڑ ار بھوت ہیں!"
"امی میں اسکول کب جاؤں گا ——!"
"امی ایک کیڑہ میرا منہ چڑا رہا ہے۔ اسے مار ڈالوں کیا ——!"
ان لوگوں کے آنے کی خبر سارے محلے میں، بلکہ شہر میں پھیل گئی۔ اس شہر کی تو یہ خصوصیت ہے کہ آپ ہنڈیا میں بگھار بھی ڈالیں تو چھاکا سارے محلے میں گونجتا ہے۔ یہ چھوٹا سا ضلع ہے جو مختلف فیکٹریوں اور اس سے متعلقہ محکموں کی وجہ سے کچھ اہمیت اختیار کر گیا ہے —— یہاں لہو گرم رکھنے کا بہانہ یہی ہے کہ دوسروں کے بارے میں سوچو۔ دوسروں کے دکھوں پر ہنسو۔ اور ان کی خوشیوں پر خودکشی کرو۔ خود شہزاد آپا کے ساتھ یہی ہوا۔
گلی پار کرتے وقت جب عورتیں کسی گھر کے سامنے سے گذرتی ہیں تو یہ کہنا نہیں بھولتیں
"اری بھنو۔ اس بدنصیب راحت کی بہن نے اپنے لئے سونے کے بٹن بنوا لئے ہیں ——
حاجی جوانمرگ ایک اور کوٹھی کھڑی کر رہا ہے —— جمن کی ماں آج کلیجی پکا رہی تھی۔ اللہ بیڑا غرق کرے گا ان منحوسوں کا ——"
تو اس قافلے کے حاجی صاحب کے ہاں اترتے ہی سارے محلے کی عورتیں اپنی جلتی ہنڈیا چھوڑ چھوڑ کر دوڑی ہوئی آئیں۔ اس شام گو جانے کس کے ہاں پھیکی دال پکی ہو۔ مگر انھوں نے نئے کرایہ داروں کی چٹ پٹی باتوں کو ملا کر روٹی کھائی۔
"سنا ہے حیدر آباد کے نواب ہیں۔ وہ تو صورتوں سے ہی شاہانہ رعب ٹپکے ہے"
"اور سامان تو دیکھو کیسا شاندار لائے ہیں۔ اب ان سے مقابلہ کریں وہ ٹٹ پونجیے سوتھ والے، تو ہم جانیں"
"ارے صورتیں کیسی اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں"
"بھنو۔ اللہ خیر کرے ایک سیانی لڑکی تو بھی جانے ہے پر کہاں"

" اوئی کیا صورتیں ہیں چڑیلوں کی نرا پھیکا شلجم، سچ کہتی ہوں پیاری ان بیگم کی صورت پہ تو ٹھیکرے برس رہے ہیں!"

اب یہ عورتیں چاہے کچھ کہتی پھریں۔ مگر حاجی صاحب کے گھرانے والوں میں پھیکا شلجم تو کوئی نہ تھا۔

ان لڑکیوں کی ماں ادھیڑ عمر کی دھان پان سی خاتون تھیں "پاشا دلہن" کہلاتی تھیں۔ حد درجہ خلیق و ملنسار اور کم گو۔ ہر وقت تخت کے اوپر ایک قیمتی قالین بچھائے، چاندی کا پاندان کھولے بیٹھی رہتی تھیں۔

ایک ان کی ملازمہ تھی مالن بی۔ تیس پینتیس برس کی ہوگی۔ اس کا رنگ بالکل الٹے توے جیسا تھا۔ خوب موٹی تازی۔ مگر بے حد مہذب اور مزاج شناس۔ اپنے مالکوں پر سے صدقے قربان ہونے کو تیار تھی۔ اگر پاشا دلہن دن کہیں تو زمین آسمان ایک کرکے آدھی رات کو سورج نکال لائے وہ لڑکیوں کی اتالیق بھی تھی۔ گھر کی نائب صدر۔ چولھے کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور پاشا دلہن کی خدمت گار۔ پاشا دلہن کی دو بیٹیاں تھیں صرف۔ ایک تو وہی جو بعد کو ہماری شہزاد آپا بن گئیں اس وقت پندرہ سولہ برس کی ہوں گی۔ مگر اپنی ماں کی طرح بڑی افسردہ مزاج تھیں۔

وہ ایسی خوبصورت تھیں ایسی خوبصورت تھیں کہ چاہو تو انھیں الف لیلیٰ کی ہیروئن بنا دو کسی ڈرامے میں۔ جتنی خوبصورت تھیں اتنی ہی شدت سے اداس رہتیں۔ ان میں جانے کیا بات تھی کہ انسان ان سے بے حد مرعوب ہو جاتا تھا۔ میں تو ان کی غلام بن گئی تھی۔ اگر وہ مجھے دن رات اٹھک بیٹھک کرنے کا حکم دیتیں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہو جاتی حالانکہ وہ انتہائی سادہ بلکہ سفید کپڑے پہنتی تھیں۔ ہمیشہ سر ڈھانپ کر چلتی تھیں تاکہ ان کے لمبے بال چھپے رہیں۔ ان کے برخلاف ان کی چھوٹی بہن قدیرہ بڑی ہنسوڑ تھی۔ اس نے حسین گدھی لڑکیوں کو دیکھ کر آتے نعرے لگنے لگے کہ وہ عجیب کہاں سے آن گئیں۔ دن بھر قدیرہ کی چیخ و پکار سن کر محلے والے کہتے تھے کہ یہ کون آفت آ بسے ہیں! قدیرہ بھی اپنی بہن سے کم خوبصورت نہ تھی مگر اس کا رنگ بالکل سانولا تھا۔ پھر بھی وہ سارے گھر کی بے حد چہیتی تھی۔ شہزاد آپا تو یوں سمجھتیں جیسے قدیرہ دودھ پیتی بچی ہو۔

قدیر کیونکہ میری ہم عمر تھی اس لئے وہ فوراً میری پکی سہیلی بن گئی۔ اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

وہ لوگ حیدر آباد میں اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے تھے کہ سو آدمی چھپ جائیں تو پتہ نہ چلے۔ ان کے پپا کوئی اپنی موت تھوڑی ہی مرے تھے! انھیں تو ایک بری عورت نے شراب پلا کے مار ڈالا۔ قدیر کہتی تھی حیدر آباد کی بڑی خراب عورتیں ہوتی ہیں۔ مردوں کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں۔ ان کے پپا کے مرنے کے بعد رشتہ داروں نے پاشا دلہن کو بھی گھول کر پی جانا چاہا تب کسی نے مشورہ دیا کہ اس لڑکیوں کا مستقبل بنانا چاہتی ہو تو حبیب گڈھ جا بسو۔ وہاں بچیوں کی پڑھائی بھی ہو جائے گی اور تم رشتہ داروں کی عنایتوں سے بھی بچ جاؤ گی۔

پاشا دلہن کو بھی شوہر کے بغیر اپنا گھر اور اپنا دیس دشمن لگتا تھا اس لئے وہ حبیب گڈھ آگئیں اور پڑوسیوں کی عنایتوں میں غرق ہو گئیں۔

یہاں اعلیٰ طبقے کی خواتین نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آناً فاناً مسز سراج، مسز درما اور مسز خالد وغیرہ نے نئے شہر میں پیش آنے والی ساری مشکلیں دور کر دیں۔

بیبیاں خاص طور پہ پاشا دلہن کو محفلوں مجلسوں میں بلا کر دیکھتیں بڑی ہمدردی سے ان کے بگڑے وقت کی کہانی سنی جاتی تھی۔

"اے پیاری اللہ بیڑا غرق کرے گا ان بدنصیبوں کا، جنھوں نے تم بے سہاروں کا سہارا چھینا ہے۔" بیگم اشتیاق کہتیں۔

"تم فکر مت کرو بھنّو۔ میرے ماموں کے بڑے سالے کے سسر حیدر آباد میں بیرسٹر ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تمھارا سارا روپیہ اگلوا دیں گے۔" مسز ہارون انھیں ڈھارس بندھاتیں۔

پاشا دلہن کے جاتے ہی ان پہ تبصرہ شروع ہو جاتا۔

"بیچاری کا ابھی تک مزاج وہی شاہانہ ہے لڑکیاں کیسی خوبصورت ہیں۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔" مسز سراج تو ان کی لڑکیوں پہ لوٹ ہو گئی تھیں۔

"بیچاری اپنا وطن، گھر بار چھوڑ کر یہاں کالے کوسوں آپڑی ہیں۔ سنا ہے اب بھی لاکھوں روپیہ

سونے کی اینٹیں ساتھ لائی ہیں۔ مگر دیکھو ناچھوٹی حسین گنڈھو دسلے انھیں چھین لینے دیں"۔

پاشا دلہن کو حسین گنڈھو کے پان اچھے نہ لگتے تھے تو مسز درما انھیں دلی کے پان منگوا دیتی تھیں جس دن ان کا دل گھبراتا اور وہ اپنے میاں کی یاد میں رونا شروع کرتی تھیں تو مسز راحت دن بھر ان کے پاس بیٹھی چوسر یا کیسی سے ان کا دل بہلاتی تھیں آغا صاحب کی لڑکیاں ان تینوں کو پکچر دکھانے لے جاتی تھیں اور مسز سراج اپنے میاں سے کہہ کر لائبریری سے شہزاد آپا کے لئے کتابیں منگوا دیتی تھیں۔

ریاض صاحب کی بیوی آئے دن کچھ نہ کچھ پکا کے بھیجتی تھیں۔ جواب میں پاشا دلہن بھی للن بی کو حکم دیتی تھیں کہ حیدر آبادی بریانی یا بگھارے بیگن ان کے ہاں بھیجو۔۔۔۔ ریاض صاحب کی بیوی وہ سالن سارے محلے کو چکھاتی پھرتی تھیں۔

" کیسے مزیدار کھانے ہوتے ہیں ان کے۔ بادام چیرونجی اور ناریل ڈال کر نرے میووں کے سالن پکاتی ہیں۔ جب ہی تو رنگ ایسے میدے شہاب ہیں"۔

" ہونہہ خاک مزے کے ہوتے ہیں"۔ ان کی پڑوسن جل کر کہتی۔

" نری کھٹائی ہوتی ہے۔ حیدر آبادی تو پلا تنک کھٹائی ملا کے پکاتے ہیں"۔

ہماری امی بھی پاشا دلہن کی بہن بن گئیں۔ پھر تو رفتہ رفتہ دونوں گھروں کے بیچ جو دیوار تھی وہ بھی بالکل نظر نہ آتی تھی۔

اداس دوپہروں اور چپ چاپ شاموں میں قدیر کے ہاں اچانک سناٹا سا چھا جاتا تھا یہاں تک کہ جیسے باغ میں چہکنے والی چڑیوں کو بھی کچھ ہو گیا ہو۔

پاشا دلہن نماز کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے رونا شروع کر دیتیں۔ مالن بی طرح طرح کی خوشبودار والے سالن پکانے کی بجائے دالان کے فرش پر بیٹھی آہیں بھرنے لگتیں، اور شہزاد آپا بلا کسی وجہ کے اپنی سنہری آنکھیں رگڑنے لگتیں۔ ایسے وقت قدیر کا موڈ بھی خراب ہو جاتا تھا حالانکہ میں سن سے کچے پکے امرودوں کی نشان دہی کرتی، مگر وہ سلامت بھائی کو یاد کئے جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں پاشا دلہن اور قدیر کی ہر ہر بات سے واقف ہو گئی۔ جیسے ان رشتہ داروں کی

عادتیں اور صورتیں اور نام تک یاد ہو گئے، جنھوں نے ان لوگوں کو دیس نکالا دیا تھا۔

البتہ سلامت بھائی کے وہاں رہ جانے کا مجھے افسوس بھی تھا وہ شہزاد آپا کے منگیتر تھے۔ قدیر کو گڑیاں اور چاکلیٹ لا کر دیتے تھے۔ شہزاد آپا کا ان سے سخت پردہ تھا۔ مگر شام کو کالج سے واپسی میں وہ قدیر سے کھیلنے آتے تھے تو شہزاد آپا کھڑکی کھول کر کسی طرح انھیں اپنے بالوں کی ایک جھلک دکھا دیتی تھیں۔ وہ شہزاد آپا کے بالوں پر بُری طرح مرتے تھے۔ قدیر کہتی تھی۔ سلامت بھائی دور کھڑے شہزاد آپا کی پیٹھ دیکھ کر کہتے۔

"قدیر کہہ دینا یہ بال ہمارے ہیں کوئی اور نہ دیکھ لے۔"

ایک بار سلامت بھائی بالکل کھڑکی کے قریب آکر چھپ گئے۔ جیسے ہی آپا بال کھولے وہاں آئیں انھوں نے ہاتھ بڑھا کے چھونا چاہا۔

شہزاد آپا سخت خفا ہوئیں اور قدیر کو اندر کھینچ کر دو طمانچے مارے۔ "کیا مجھے گناہگار بنانا چاہتی ہے۔ صبر کرنا بھی تو سیکھ۔"

پھر جب وہ لوگ حسین گڈھ آنے کے لئے تیار ہوئے تو شہزاد آپا روتے روتے بے ہوش ہو گئیں۔ سلامت بھائی کی اداس صورت دیکھ کر قدیر بھی روئی۔ لیکن پاشا دلہن بے بسی سے سناتی پھریں۔

"سلامت کی ماں کو میں نقد پچاس ہزار کہاں سے دوں! ہمارے نصیباں کھوٹے نہ ہوتے تو میری بچیوں کے سر سے باپ کا سایہ ہی کیوں اٹھ جاتا، اب ان کی قسمت کا لکھا حسین گڈھ میں پورا ہو جائے گا۔"

اسی لئے پاشا دلہن پچاسوں بار لوگوں کو سنا چکی تھیں کہ میری شہزادی ماں کے لئے تو بڑے بڑے جاگیرداروں کے پیغام تھے۔ مجھے اس کی بیاہ کی کوئی فکر نہیں ہے۔

جب میں شہزاد آپا کو چپکے چپکے روتے دیکھتی تھی تو جی چاہتا کہ انھیں یقین دلا دوں کہ سلامت بھائی کا کلیجہ کوئی چڑیل نہیں چبا سکتی

بعض اوقات ہم اور قدیر مل کر سوچتے کہ کہیں سے پچاس ہزار روپے مل جائیں تو سلامت بھائی

کی اماں کو دے کر انہیں یہاں بلوالیں پھر دیکھیں شہزاد آپا ہستی ہیں یا نہیں! اور پھر درختوں پر لگے ہوئے اونچے اونچے پھلوں کو توڑنے کے لئے بانس ڈھونڈنا کتنی بوریت کا کام ہے۔ قدیر کہتی تھی سلامت بھائی تو ہاتھ بڑھا کے امرود توڑ دیتے تھے۔

ہم کسی وقت کھیلتے کھیلتے اوپر شہزاد آپا کے کمرے میں چلے جاتے تھے وہ سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے، دونوں ہاتھوں میں چہرا تھامے، کوئی کتاب پڑھا کرتیں مجھے بڑے پیار سے قریب بلاتیں اور بڑے پیار سے پوچھتیں۔

"آپ کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ آپ کی کتنی بہناں ہیں!"

مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس نیم تاریک کمرے میں کسی نے شہزاد آپا کو قید کر دیا ہو۔ میں بڑی محبت سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی۔

"آپ ہمارے گھر چلئے نا۔ پھر ہم سب مل کر گوگے نواب کی بگیہ دیکھنے چلیں گے۔"

"نکو ہم نہیں جاتے"۔ وہ اپنا خوبصورت سر ہلا کر کہتیں۔

شہزاد آپا سخت پردہ کرتی تھیں۔ خصوصاً اپنے بالوں کو تو یوں ڈھانپے رہتی تھیں جیسے چیل کوے ان کے بال جھپٹ لیں گے۔

ایک بار میں اور قدیر زبردستی انہیں گیٹ تک گھسیٹ لائے۔

بیچاری دھان پان سی آپا کبھی اپنا دوپٹہ سنبھالتیں کبھی ہاتھ چھڑا لینے کی کوشش کرتیں اسی الجھن میں ان کے بال کھل کر بکھر گئے۔ اور اسی وقت سڑک پر کوئی کتا زور سے بھونکا میں نے مڑ کے دیکھا تو احمد بھائی نے ہمارا تماشہ دیکھنے کی دھن میں کتے کی دم پر سائیکل چلا دی تھی۔ کتے کی چیخ سن کر شہزاد آپا بدحواسی میں اندر بھاگیں۔

"ایو، جانے کون جا رہا تھا۔ میرا سامنا ہو گیا؟"

وہ سچ مچ سرخ ہوئی جا رہی تھیں اور ہم دونوں خوب ہنس رہے تھے۔ اس دن سے میں آپا کو خوب چھیڑتی تھی۔

"آپا آپ کتے سے بھی پردہ کرتی ہیں۔"

یہ سن کر انھیں بھی مسکرانا پڑتا تھا۔

جانے کیوں انھیں مسکراتے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔

پاشا دلہن کا یہی رونا تھا کہ ان کے ہاں مردنام کی کوئی چیز نہیں ویسے انھوں نے یہاں آتے ہی دو تین مرد نوکر رکھ لئے تھے جوان کے گھر کی ذرا ذرا سی خبریں پورے محلے میں پھیلاتے تھے۔ اگر وہ بیچاری سارے شہر کی عورتوں سے ہمدردی جوڑتی تھیں کہ ان کے مردوں سے درخواستیں لکھوا سکیں، مقدموں کی کارروائیاں پڑھوا سکیں۔ ویسے تو وہ خود بھی بہتیری قابل تھیں۔ اتنی کہ ٹیلیگرام خود پڑھ لیتیں۔ قدیر کو ہوم ورک کروا دیتیں گفتگو میں بھی جا بجا سرٹیفکیٹ، سپریم کورٹ اور نان سنس" جیسے الفاظ استعمال کر لیتی تھیں۔ لیکن تھیں بیچاری عورتوں کی اس قوم سے جو اپنی تعلیم اور سوجھ بوجھ پر کبھی اعتبار نہیں کرتیں۔ اور جاہل سے جاہل مرد کو بھی قابل مان لیتی ہیں۔ اس لئے اپنے ٹیلی گرام اور درخواستیں جب تک کسی مرد سے نہ پڑھوا لیتیں، انھیں اطمینان نہ ہوتا تھا حالانکہ گھر میں شہزاد آپا بھی تھیں انھوں نے حیدر آباد کے کسی مشہور کانونٹ سے سینئر کیمبرج پاس کیا تھا۔ اور جب حد سے زیادہ اداس ہوتیں تو اکثر انگلش ہی میں اس کا اظہار کرتی تھیں۔

پاشا دلہن دن رات اپنے مقدموں میں الجھی رہتی تھیں مالن بی ان کے قریب دکھ ریچے خالی زمین پر) مٹھی چھالیہ کاٹتی تھی اور پاشا دلہن کی ہر بات میں کلیاں پھندنے ٹانک کر آگے بڑھاتی تھی۔

" اتو! کیسے دناں آگئے کہ میری پاشا دلہن کو ٹیلے پیسے کی فکر ہونے لگی ہمارے پاشا دلہن بیاہ کر ہمارے گھر آئے تو سات برس تک ان کو یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ ڈیوڑھی کا باورچی خانہ کدھر ہے!"

" ان کے تو پاؤں دھلانے کے لئے کئی چھوکریاں تھیں بڑے بی بی پیدا ہوئے تو سرکار مجھے یہ سونے کے کڑے انعام میں دئے تھے"

ان باتوں کو سنتے وقت پاشا دلہن خلا میں گھورنے لگتیں اور انھیں فوراً مالن بی کو اٹھانے

کے لئے کوئی کام یاد آجاتا تھا۔

کھانا پکاتے وقت مالن بی مجھے اور قدیرہ کو ننھی ٹکیاں پکا دیتی تھی۔ اتوار کے دن ہم دونوں باغ میں آم تلے ہنڈکلیا پکاتے تھے تو وہ ہمیں پاشا دلہن سے چھپ کے نمک، مرچ، گھی، شکر بھی دیتی تھی۔ پاشا دلہن کو لڑکیوں کا چولھے کے پاس جانا بالکل پسند نہیں تھا۔

شہزاد آپا سالن لانے کھانے کی میز سے اٹھ کر چولھے کی طرف جاتی تھیں تو مالن بی رستے میں سے دوڑ کر سالن کا ڈونگا ان کے ہاتھ سے لے لیتی تھی۔

"ایو۔ سرکار۔ آپ کے دشمناں کام کرو۔ کیا میں مرگئی ہوں جو آپ چولھے کنے جارئیں۔"

اس گھر میں نئی فراک بنوانے کے لئے قدیرہ ہفتوں ضد کرتی تھی۔ حیدرآباد سے سی آرڈر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو پاشا دلہن کھانے کے ساتھ میٹھا پکوانے کے لئے منع کر دیتی تھیں۔ اس کے باوجود قدیرہ اور شہزاد آپا بالکل شہزادیوں کی طرح رہتی تھیں۔ پاشا دلہن بالکل ملکہ کے انداز میں چلتیں۔ خوش ہوتیں۔ اور دوسروں سے بالکل اسی انداز میں بات کرتیں جیسے ایک ملکہ کو اپنی پریشان حال رعایا سے کرنا چاہیئے یہ سب مالن بی کا حسنِ انتظام تھا۔ وہ اکیلی بیک وقت دس لونڈیوں کا رول ادا کرتی تھی۔ یوں لگتا جیسے ان کے ہاں لونڈیوں کی فوجیں ہیں جو کھانا کھلا رہی ہیں۔ گھر صاف کر رہی ہیں۔ قدیرہ اور شہزادی کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں۔ پاشا دلہن کو نہلا رہی ہیں۔ شہزاد آپا کو مزے مزے کی کہانیاں سنا سنا کے سلا رہی ہیں۔ شہزاد آپا اپنا سارا شہزادی پنا تو کھو چکی تھیں مگر ان کی ایک شاہانہ عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔ انھیں کہانی سنے بغیر نیند نہیں آتی تھی اور مالن بی کی نہایت فرتوتی ہزار بار کی سنی ہوئی کہانی سنتے وقت وہ ننھے بچوں کی طرح ہنکارے بھرا کرتی تھیں۔ ان کے لمبے بال کھل کر تکئے پہ بکھر جاتے تھے اور وہ مالن بی کے زانو پر سر رکھے کبھی ہنسنے لگتیں کبھی سسکنا شروع کرتیں تو مالن بی کی ساری ان کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی۔

مالن بی ٹھنڈی سانس بھر کے آہستہ سے انھیں چوم لیتی تھی۔

"اللہ میاں جلدی سے میری بڑی سرکار کا نصیبہ کھول دو۔"

قدیرہ کہتی تھی مالن بی کو اس کی دادی نے دس روپے میں خریدا تھا۔ دادی نے اسے قصوبہ

اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر کے اُلٹا لٹکا دیتی تھیں۔ پاشا دلہن کو جب غصہ آتا تھا تو اس کے بال پکڑ کے دیواروں میں جما دیتی تھیں۔ قدیر کے آبا جب تک زندہ رہے ان کے سپرد نانا مالن بی کا کام تھا پھر جب سے گئے جب پاشا دلہن ان کے کمرے میں آتیں تو وہ لات مار کے مالن بی کو نکال دیتے تھے سرکار کا انتقال ہوا تو پاشا دلہن نے اسے بھی کسی ڈرائیور یا باورچی کے نکاح میں باندھ دیا۔ مگر وہ پاشا دلہن کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئی۔ حسین گڈھ کی عورتوں کو مالن بی کی وفاداری پر رشک آتا تھا۔

"ایک ہمارے نوکر ہیں کہ دوسروں کے گھر جا کر ایک ایک کی ہزار ہزار لگاتے ہیں اور ایک مالن بی ہے کہ قسمت کو چاہے کتنے ہی پان کھلاؤ اور مگر مجال ہے کہ پاشا دلہن کی ذرا سی برائی سن لے اپنی اپنی قسمت ہے۔"

مگر یوں قسمت کا مان کر خاموش تو نہیں رہ سکتے۔ اچھا خاصہ پاشا دلہن کے خلاف بھی چپکے چپکے کھسر پھسر ہوا کرتی تھی۔

آج سب کی بہن پاشا دلہن کی دیکھی۔ ماں کا خوب مذاق اڑاتی تھیں۔ دراصل وہ لوگ پاشا دلہن سے سخت جلے ہوئے تھے۔ ان کی ساس اٹھتے بیٹھتے سنایا کرتی تھیں کہ اری بہنا، نہیں جھونپڑوں میں ورنہ اب تو ڈھیں محلوں کے ہمارے پڑوس میں وہ کو بھی یوں بنتی ہیں جیسے کہیں کی مہارانی ہوں کہ ہی تھیں میں نے بھی برتن نہیں دھوئے۔ بڑی آئیں حیدرآباد کی ملکہ معظمہ۔

"اور لڑکیاں کیسی نخروں بیٹی ہیں!" ان کی سو کہتی۔

"اپنے ہاتھ سے اپنے بال تک نہیں دھوتیں۔ جانے کس بدنصیب کے پلے پڑیں گی۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ لمبے بال ادبار کی نشانی ہوتے ہیں۔" ان کی بیٹی اپنی چوہیا کی دم ایسے بال جھٹک کے کہتی۔

اس سال "الف لیلہ" میں بڑی بہار آئی ہوئی تھی۔

شہزاد آپا نے سہانی بچوں کا اجاڑ ہوا باغ پھر سے سنوار دیا تھا۔ ہم تینوں مل کر درختوں کی پتی دیتے۔ اس کی کیاریاں بناتے۔ گڑھے کھودتے تھے سرخ، سبز اور کاسنی پھولوں کے رنگ۔ شہزاد آپا کا سفید دوپٹے میں دمکتا ہوا چہرہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی کلی پھول بننے کے لئے بے دھ بتاب ہو۔ کام کرتے وقت بھی قدیر خوب شرارتیں کرتی تھی۔ کچے پکے پھل توڑ ڈالتی، چڑیوں پر پتھر پھینکتی۔ میرے اور شہزاد آپا کے اوپر ہرے سے پانی پھینکتی۔

شہزاد آپا کے ساتھ ہم دونوں بھی دیر تک برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے تھے اور کھلتے ہوئے پھولوں اور پکتے ہوئے پھلوں کا تماشا دیکھتے تھے۔ کبھی اچانک جانے کہاں سے بادل آجاتے تھے دھیمی دھیمی پھوار پڑنے لگتی۔ تیز ہوا میں اپنے بالوں کی لٹوں کو سمیٹ کر شہزاد آپا کہتیں:

"یہ بادل جانے کہاں سے اچانک آجاتے ہیں؟"

"حیدرآباد سے آتے ہوں گے" قدیر قہقہہ لگا کے کہتی۔

"آپا، سلامت بھائی نے بھی ان بادلوں کو دیکھا ہوگا نا؟"

"آپا! یہ بادل اپنے بنگلے کے اوپر بھی گئے ہوں گے!"

یہ سن کر شہزاد آپا بھی بچوں کی طرح بادلوں کو گھورنے لگتیں۔

"آپا، آپ نے سلامت بھائی کے سب فوٹو اعمیں واپس کیوں کر دیئے۔ سلمٰی کو دکھاتے ــــ" قدیر کچھ سہ کچھ کے جاتی۔

"اُن کے فوٹو ہم کیوں رکھتے وہ اپنے کون تھے۔"

آپا دھیمے سے جواب دیتیں تو قدیر پیچھے پڑجاتی۔

"ہوں آپا۔ سلامت بھائی اپنے کوئی نہیں تھے نا! ہوں آپا ــــ؟"

"ہشت، دیوانی بھی ہے۔" آپا اٹھ کر اندر جانے لگتیں تو قدیر کو اور ہنسی آتی تھی۔ نہ جانے کیوں!

ایک دن بستہ لئے میں اسکول جانے کو باہر نکلی تو احمد بھائی مل گئے۔ وہ ہمارے محلّے ہی میں رہتے تھے سب بچے انھیں احمد بھائی کہتے تھے۔ کیونکہ وہ کالج جاتے وقت اکثر اپنی سائیکل کے پیچھے بٹھا کر ہمیں اسکول تک چھوڑ دیا کرتے تھے —— اس دن بھی انھوں نے مجھے سائیکل کے سامنے بٹھا لیا تو راستے میں بہت سی باتیں پوچھیں —— وہ جو اس دن "الف لیلہ" میں لمبے والوں والی لڑکی کھڑی تھی وہ کون تھی —— اس کا نام کیا ہے —— اور —— اور یہ کہ آج شام کو اسے پھر گھسیٹ کر پھاٹک تک لاؤ۔"

"ارے نہیں احمد بھائی، وہ تو کتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔" میں نے انھیں سمجھایا۔

"مگر یہ جہیں گڈھ ہے۔ تم انھیں سمجھاؤ کہ یہاں لڑکیاں پردہ نہیں کرتیں۔"

لو بھلا۔ کوئی شہزاد آپا سے ایسی بات کہہ سکتا ہے!

ماں بی تو قدیر کو بھی پردہ کروانے پر مصر رہتی تھی۔

"اب آپ نو برس کے ہوگئے ماشاء اللہ چھٹے پاتا۔ اب آپ گوشہ کرنا۔" وہ پھر دلار سے سمجھاتی تھی۔

"نکو، میں گوشہ نہیں کروں گا ——" وہ چلا کے کہتی اور پھر ہنسنے لگتی تھی۔ قدیر کو جانے کیوں اتنی ہنسی آجاتی تھی۔ وہ ان باتوں پر بھی ہنستی تھی جن پر کوئی نہیں ہنس سکتا۔

ان دونوں بہنوں میں اندھیرے اجالے کا فرق تھا۔ شہزاد جتنی گوری تھی قدیر اتنی ہی کالی۔ شہزاد آپا ہر وقت گم سم رہا کرتی تھیں اور قدیر ہر وقت کچھ نہ کچھ بکے جاتی تھی۔ شہزاد آپا بلا وجہ رو سکتی تھیں تو قدیر کو ہر بات پر ہنسا آتا تھا۔ پھر بھی اپنی بڑی بہن پر وہ دل و جان سے فدا تھی۔ دوسروں کے باغوں میں سے جب ہم بیر چرا کے لاتے تھے تو وہ آپا کی خدمت میں پیش کئے جاتے۔ کوئی خوبصورت سا پھول نظر آتا تو قدیر کو آپا کے بال یاد آجاتے تھے۔ حد یہ تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر اسے اپنے سانولے رنگ کا افسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ فوراً اپنی آپا کے رنگ پر فخر کرنے لگتی تھی۔

شاید قدیر کی دیکھا دیکھی مجھے بھی اس کی آپا سے عشق ہو گیا تھا بلکہ ان پر تو سارا شہر عاشق

ہو گیا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی کی لڑکیوں پر تو شہزاد آپا کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ سب خاص طور پہ تقریبوں میں بلا کر ان سے ملتی تھیں اور انھیں دوست بنانا چاہتیں۔ آپا حیدر آباد سے سینئر کیمبرج کر کے آئی تھیں اور اب انھیں کالج بھیجنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

لیکن پاشا دلہن کو یہاں کی لڑکیوں کا یہ انداز پسند نہیں تھا کہ سر پہ برائے نام کا دوپٹہ ڈالے سڑکوں پر چلی جا رہی ہیں زیادہ سے زیادہ ایک اٹنگا سا برقعہ اوڑھ لیا۔

"ہم لوگاں تو کاریں بھی پردہ لگ کے سوار ہوتے تھے۔" پاشا دلہن کہتیں۔

"ہمارے بیٹیاں تو زندگی میں پہلی بار جس مرد کی صورت دیکھتے ہیں وہ ان کا دولہا ہوتا ہے۔"

اس طرح شہزاد آپا کو کالج بھیجنے کے مسئلہ پہ کافی بحث و مباحثے ہوا کرتے۔ پھر یہ ہوا کہ ایک رکشہ کے اوپر چادر باندھی جاتی۔ اس کے اندر برقعہ اوڑھ کے شہزاد آپا بیٹھتیں ساتھ میں مالن بی کتابیں اٹھا کے چلتی۔

کالج کی جو پرنسپل تھی اس کا باپ کبھی اس کالج میں لیکچرر تھا جو شہزاد آپا کے دادا نے قائم کیا تھا اس لئے بیچاری پرنسپل شہزاد آپا کو دیکھ کر بے ساختہ کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اکثر انھیں رکشا میں سوار کروانے خود بھی گیٹ تک چلی آتیں۔ شہزاد آپا کھانا بھی پرنسپل کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی کھاتی تھیں۔

اس لئے لڑکیوں نے انھیں پرنسپل کی "سویٹ ہارٹ" کا خطاب دیا تھا۔ وہ جدھر سے نکلتیں لڑکیاں ان کے چوڑی دار پاجامے، کھڑے دوپٹے اور لمبے بالوں کا مذاق اڑاتی تھیں پھر ان کی زبان —— اللہ کی پناہ۔ لیکچرر پوچھتیں: "آپ نے غالب کو پڑھا ہے؟"

"جی ہو —" وہ گردن ہلا کے کہتیں۔

کوئی کہتا —: "شہزاد آپ کو فلاں کتاب تو نہیں چاہیئے؟"

"نکو"۔ ان کے مختصر سے جواب پر سب خوب ہنستے تھے۔

اس کے باوجود جب اگلے سال ریزلٹ آیا تو شہزاد آپا پوری یونیورسٹی میں فرسٹ آئی تھیں۔

پھر کیا تھا شہزاد آپا کا نام یونیورسٹی کے لیکچررز تک پہونچ گیا۔ یونین کے سکریٹری اور پریسیڈنٹ نے انہیں یونین ہال میں آنے کی دعوت دی۔ لیکن توبہ کیجیے، شہزاد آپا نے اپنے مال ہی طرح سے ڈھانپ کر رکشا کے اوپر چادر اور مضبوطی سے بندھوائی۔

بی اے اور قدیر نے تھرڈ کلاس آٹھویں جماعت پاس کی تھی۔ مگر آپا کی قابلیت پر خوب کرتے تھے۔

ہم تو شہزاد آپا سے پڑھیں گے۔" سہیلیوں پر خوب رعب جماتے تھے۔ "ہماری آپا جیسی خوبصورت ایک بھی لڑکی نہیں ہے۔"

قدیر کہتی — "سلامت بھائی کہتے تھے تمہاری آپا تو کالج کی گڑیا ہیں۔ ذرا سی ٹھیس برداشت نہیں کر سکتیں۔"

پھر اچانک دو باتیں ساتھ ساتھ ہوئیں۔

ایک تو یہ کہ قدیر کے چچا نے انھیں جائداد سے بے دخل کرنے کا مقدمہ جیت لیا اور دوسری یہ کہ بیگم سراج اپنے بیٹے احمد کا پیغام لے کر پاشا دلہن کے ہاں گئیں۔

اس دن قدیر کے ہاں سب بہت اداس تھے۔ پاشا دلہن اندر بڑے کمرے میں تخت پر بیٹھی جانے کن کن عزیزوں کو رو رو کر خط لکھ رہی تھیں۔ شہزاد آپا کالج جانے کے بجائے امی کے پاس بیٹھی کچھ نہایت پرانے رسید کاغذوں کو الٹ پلٹ رہی تھیں۔

البتہ قدیر کو ایک بھونرل گیا تھا اور وہ اس کی دم میں دھاگہ باندھ کر چھوٹے بچوں کی طرح کھیل رہی تھی اور ہم دونوں مل کر خوب ادھم مچا رہے تھے اور سارے محلے کے بچوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ مالن بی دالان میں چاول پھیلائے انہیں صاف کر رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔

"لو اماں، یہ دیکھو، گت۔ کان کے چھوٹے لوگاں اور ہماری پاشا زادی کا پیغام بھیجا دہم ہوئے، کیا ایسے ویسے ہیں کہ کسی کو بھی اٹھا کے بیٹی دے دیں گے، باپ نہ دادے چودہ پشت

حرامزادے۔ جاگیر نہ منصب ـــــ ڈیوڑھی نہ روشن چوکی۔"

"مالن بی۔ اے جی بیٹھو جی!" پاشا دلہن نے انھیں پتلی مرمریں نازک آواز میں ڈانٹا۔

"اللہ رکھے پھر دیکھو یہاں کے لوگوں کی ہمت!" اس کے دل میں جیسے ابال سا آ رہا تھا جو پاشا دلہن کی ڈانٹ سے بھی نہ رکا۔

میں اب کافی بڑی ہو گئی تھی اور اپنے بڑے پن کا ثبوت دینے کے لئے میں نے یہ ساری باتیں اماں کو جا سنائیں۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی آئیں لیکن ماں بیٹی نے تو جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی سے بھی ہمدردی کا ایک بول نہ سنیں گی۔ حالانکہ اماں ان کی پکی سہیلی تھیں اور سوائے اماں کے انھیں کسی پر اعتبار نہ تھا۔

دوسرے دن پاشا دلہن ہمارے ہاں آئیں تو انھوں نے بتایا کہ اب وہ اپنے دیس پھر مراجعت کریں گی اور اس کے لئے انھیں حیدرآباد جانا ہوگا لیکن شہزادی پاشا اب کسی قیمت پر حیدرآباد جانے کو تیار نہیں تھیں۔ اس لئے وہ جاتے وقت گھر کی ذمہ داری اماں کو سونپ گئیں کہ دیکھ بھال رکھنا حالانکہ مالن بی کی موجودگی میں کس کی مجال تھی کہ "الف لیلہ" کی طرف آنکھ بھی اٹھاتا۔

ادھر احمد بھائی دو پیغام لے آئے کہ بیگم حسرت کے تیور ہی بدل گئے۔ ہزار ہزار تو انھوں نے پاشا دلہن کے جاتے ہی کوسنے سنائیں اور پچاسیوں عیب شہزادی پاشا میں نکال پھینکے۔

وہ محسن بی کی بستی میں آئیں تو بھری محفل میں اعلان کر ڈالا کہ دیکھوں تو اب حسین گڑھ کا کون لڑکا پاتا ہے دلہن، جو کوٹھے پر چڑھے گا

بیگم حسرت ابھی بھی رواں دواں خاتون تھیں جس پر مہرباں ہوتیں اُسے دنیا کا لاثانی انسان بنا کر چھوڑتیں۔ جس کی دشمن ہوتیں تو دشمنی کے سارے اصولوں پر بھی پوری اترتیں۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اُن کی نوکرانی حمیدہ نے یہ بات پھیلائی کہ شہزادی کی ماں ان کے باپ کی نکاحی بیوی نہیں تھیں اسی لیے ان کے چچا نے عدالت میں یہ بات ثابت کر کے انھیں جائیداد سے بے دخل کر دیا ہے۔

"پیا ہی جانے کیسے گنوں کی ہوں گی جو رشتے داروں نے بھی ان کے جنم پر تھوک کر دیس سے نکال پھینکا ہے۔"

بیگم سراج اپنی پڑوسنوں کو سناتی تھیں۔

ہمارے ہاں کسی بات کو پھیلانے کے لئے کسی اسکیم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہوا میں ایک پُھلاو تو وہ خود بخود جنین بن جاتا ہے۔ اب جو بھی اس بات کو دہراتا وہ اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کرتا جاتا تھا۔

باسا دلہن چلی گئیں تو اماں نے ایک دن بھی مالن بی کو کھانا نہ پکانے دیا۔ کالج سے آتے ہی شہزادآپا اور قدیر ہمارے ہاں آجاتی تھیں۔ ہم تینوں مل کر خوب اودھم مچاتے۔ مالن بی کہانیاں سناتی اور اماں کو شہزادآپا کے رشتہ داروں کی سردمہری کے قصے سناتی۔ قدیر شرارتیں کرتی اور میں خوشی کے مارے سارے گھر میں چیختی پھرتی تھی کہ شہزادآپا ہنس رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں ہمارے گھر میں گھوم رہی ہیں۔

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک ایسے منگیتر کی دلہن بنے والی تھی جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا (حالانکہ وہ میرا خالہ زاد بھائی تھا) مگر وہ ہم سے بہت دور کلکتہ میں رہتا تھا اور مجھے پالنے کے بارے میں اس کی ماں ہر مہینے اماں کو ایک خط لکھا کرتی تھیں۔ چنانچہ میں اپنے منگیتر کی حسب مرضی پالی جا رہی تھی۔ وہی پڑھ رہی تھی جو وہ چاہتا تھا۔ وہی سیکھ رہی تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔

یہ بات شہزادآپا کو بھی معلوم تھی۔ اس لئے میں کبھی پیالی میں دودھ کی ب... لیتی تو وہ مجھے جتا دیتی تھیں۔

"تمھیں بہت سی چائے نہیں پینا چاہیئے"

(اماں نے ایک بار انھیں بتایا تھا کہ میری س س کو چائے پینے والوں سے نفرت ہے)

لیکن جب شہزادآپا ہمارے گھر میں ہوتیں تو میرا جی چاہتا تھا کہ میری سب بہنیں ہوتیں جو شہزادآپا کا دل بہلانے کا فرض ادا کر سکتیں۔ جب شام کو شہزادآپا پڑھ کے آتی تھیں تو اماں نیچے مائیں اکٹھے بٹھا دیتی تھیں تاکہ آپا زادی کے ساتھ گھوم پھر سکیں۔

ہمارے رفیع ماموں ریسرچ کر رہے تھے اور بڑے مشہور شاعر تھے جب وہ مدینہ پورے

اپنی لرزتی ہوئی آواز میں کلام سناتے تھے یا کسی رسالے میں ان کی غزل چھپتی تھی تو ہم خوب اکڑاتے پھرتے۔

مارے خاطر کے ایک دن میں نے شہزاد آپا کو رفیع ماموں کی بیاض لا کر دکھائی تاکہ وہ بھی ہمارے ماموں کی شاعری سے محظوظ ہوں۔

انھوں نے اِدھر اُدھر سے سگریٹ کی بو میں بسی ہوئی وہ میلی کاپی دیکھی اور پھر گری چیز کی طرح میز پر ڈال دی۔

شہزاد آپا کہتی تھیں کہ شاعری واعری سب فضول چیزیں ہیں بھلا ایک ریسرچ اسکالر کا شاعری سے کیا تعلق!

دو تین دن بعد ایک دن میں اسکول سے آئی تو سارا گھر تہہ و بالا تھا۔ سب مل کر رفیع ماموں کی بیاض ڈھونڈ رہے تھے جو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ماموں جان سخت غصہ میں تھے کسی کا پانچ روپے کا نوٹ کھو جائے تو وہ پریشانی نہ ہوگی جو ماموں کو اس چھوٹی والی کاپی کے کھونے سے تھی۔ اتنے میں چغل خور قدیر نے اُن سے جا لگائی کہ آپکی کاپی تو اُس دن سلمیٰ لئے پھر رہی تھی۔

پھر کیا تھا ــــ! اللہ دے اور بندہ لے۔ رفیع ماموں کا بس نہ چلتا کہ مجھے کچا چبا ڈالتے۔ چنانچہ دو تین تھپڑوں کے بعد قبولنا پڑا کہ کاپی شہزاد آپا کو دی تھی۔ شہزاد آپا کا نام سنتے ہی وہ جیسے انسان کے روپ میں آ گئے اور نہایت نرمی سے بولے "کیوں ــــ کیا انھوں نے منگوائی تھی؟"

"ہاں ــــ" میں آنسو پونچھ کر بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتی رہی۔

"تو جاؤ۔ اب وہ پڑھ چکی ہوں گی۔ اب واپس لے آؤ۔ اور ہاں ــــ یہ بھی کہنا کہ ہماری شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات بھی لکھ بھیجیں۔"

میں فوراً قدیر کے ہاں جا کر "پنج گٹے" کھیلتی رہی۔ اور آ کر عرض کیا کہ دو چار دن بعد دیں گی ــــ بس جناب ــــ ماموں جان تو یوں کھِل اٹھے جیسے کسی کو اچانک ایک ٹیبہ

شامل ہو جائے ۔ اب وہ مجھ سے دن بھر آپا کی ایک ایک جنبش کا حال سن کر وجد میں آتے چلے جاتے
کھانے کے دوران اکثر شہزادی کی اماں اور ان کے سائیں کا ذکر ہوتا میں بہت خوش تھی کہ اس بہانے
ماموں جان بھی آخر یا تسا دلس کے ہمدرد بن گئے ۔

دوسرے دن شہزادی آپا ہمارے گھر آئیں تو اتفاق سے ان کا سر کھلا ہوا تھا ماموں
جان نے انھیں اوپر سے دیکھا تو بولے ۔

" ہائے ان بالوں پر سے تو میری سو بیاضیں نثار ہیں ۔"

" تو ماموں جان ہمیں سو بیاضیں دیجئے ۔ ہم شہزادی آپا کے بالوں پر سے اتاریں گے ۔" میں نے
بڑی مسرت سے کہا ۔

" چپکی بیٹھ ـــــ تیرا کیا بیچ ہے ہر بات میں " انھوں نے مجھے بے مروتی سے ڈانٹ دیا ۔
اس دن میں قدیر کے لئے کھٹائی چرانے چولھے کے پاس گئی تو نعیمن نے مجھے ماموں جان کی
وہی بیاض دکھا کر پوچھا ۔

" اے بٹیا یہ تمھارے کام کی تو نا ہے ۔ میں چولھا سلگانے کے لئے تمھاری کھاٹ تلے سے
لائی ہوں ۔"

میں نے چپکے سے وہ کاپی لے جا کر ماموں کی میز پر رکھ دی ۔
صبح ابھی کوئی نہ اٹھا تھا جو ماموں جان نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا ۔
" میری کاپی وہاں سے کون لایا ـــــ انھوں نے کیا کہا ! پوری تفصیل سناؤ ۔"
" کچھ نہیں " ـــــ میں نے جمائی لے کر کہا ۔
" کہنے لگیں کسی کو خبر نہ ہو چپکے سے وہیں رکھ آؤ ۔"

دوسرے دن اسکول میں میں نے قدیر کو بڑے فخر سے سنایا کہ ہمارے ماموں تو آپا کے
بالوں پر سے ہزار بیاضیں نثار کرنے کو تیار ہیں ۔ مگر قدیر نے فوراً بگھار کے کہا ۔
" آپا کے بالوں کا نام مت لینا ۔ وہ اپنے بال سلامت بھائی کو دے چکی ہیں ۔"
ادھر ماموں جان تھے کہ جیسے آٹے کی طرح پھیلتے جا رہے تھے ۔ کبھی روز نہ دیے گاتے ،

کبھی ہنسنے۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے طرح طرح کی کریمیں اور پاؤڈر مل کر جیکب داعوے ٹالنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر ایک روز انھوں نے مجھے ایک موٹا سا لفافہ دیا کہ شہزادکو دے آؤ۔
اب تو میں بہت ڈری۔ کیونکہ اب لڑکی ذات، چاہے کیسی ہی تنی گڑیا ہو مگر ایسے خوشبوؤں میں بسے لفافوں سے تو بہرحال تھرتھری چھوٹتی ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ایک انجانا سا خوف مجھ پر چھا رہا تھا اس لئے میں نے وہ لفافہ سینے میں پھاڑ کر گلی میں پھینک دیا اور ماموں جان کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا خط تو شہزاد کے سینے سے چمٹا ہوگا۔
میری جان آفت میں پڑ گئی تھی اب ڈرائینگ روم میں ماموں جان کے دوست آتے تھے تو قہقہوں کے ساتھ بار بار آپا کا نام لیا جاتا تھا۔
ایک دن ہم اور قدیر گڑیا کا غرارہ قطع کروانے آپا کے پاس گئے تو وہ دلہن بنی زانو پر سر رکھے رو رہی تھیں اور ماماں بی انھیں ایک نہایت فرتوس سی کہانی سنا رہی تھی۔
تو راجہ کی بیٹی ایسی خوبصورت تھی کتے جیسے سونے کی ڈلی۔ ملک ملک کے شہزادے اس کی ایک جھلک دیکھنے کو آتے اور ——
مجھے دیکھتے ہی آپا اٹھ بیٹھیں اور مارنے کے انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کے بولیں۔
"تیرے ماموں کو کیا ہوا ہے سلمٰی۔ وہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"
میں کانپ اٹھی کہ آج بھانڈا پھوٹ گیا۔ مگر مارے عقل مندی کے کچھ نہ بولی۔
"تم لوگاں تو اچھے تھے نا۔ پھر مجھے بے فضول میں کیوں بدنام کر رہے ہیں۔ میں آگ ہوں کیا سمجھے! مجھ سے کھیلنا اچھا نہیں ہے۔ میں تو ایسے ادھار صورتیں کو چٹکی سے بھی نہ چھوؤں"
آپا غصّہ کے مارے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔
چنانچہ اس خاکسار نے فوراً یہ پیغام ماموں جان کے گوش گذار کر کے اپنی جان چھڑائی۔
پھر —— پھر پہلے ناظرین —— کیا بیان کروں کہ کیا کیا ہوا! ماموں جان کا بس چلتا تو ان کے گھر میں کود کے آپا کو اٹھا لاتے۔ اماں لاکھ ان لوگوں کی طرف سے برے بن مگر ماموں جان

کہتے تھے کہ احمد جو کہتا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ یہ لڑکی پہلے خود ہی محبت کی پینگیں بڑھاتی ہے اور کوئی اس کے جال میں پھنس جائے تو پارسائی کے مینار پر جا کھڑی ہوتی ہے۔ آخر ہماری بھویو کو بھی انھوں نے اپنی کہانی سنا کے ہمنوا کر لیا۔

چنانچہ اگلے دن ہی جب میں بچہ پد کے ساتھ سراج صاحب کے ہاں گئی تو انھوں نے رکشا سے اترتے ہی کہنا شروع کر دیا: "اری بہن یہ پاشا دلہن بڑی چار سو بیس ہیں۔ جانے کہاں سے آ بسی ہیں ہمارے شہر کو گندہ کرنے۔ جھوٹ موٹ بیٹی کے پردے کا ڈھونگ رچایا ہے۔"

اس پر سراج صاحب کی بیوی نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔

"میری بہن، اس سے تو ہماری یہ سائیکلوں پر گھومنے والی لڑکیاں ہی اچھی ہیں کہ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ایک وہ حرافہ ہے کہ اپنی چاند سی صورت سات پردوں میں چھپا کر بھی نت نئے گل کھیلتی ہے۔"

اس واقعہ کے بعد قدیر کے گھر والے ہم سے شاید کافی بدظن ہو گئے تھے۔ کیونکہ میں وہاں گھنٹوں کھیلتی۔ اب بھی کوئی مجھ سے بات نہ کرتا۔ نہ تو شہزاد آپا مجھے پیار سے اپنے کمرے میں بلاتی تھیں۔ نہ ان کی ماں کبھی میٹھی گولیاں کھلاتیں اور نہ قدیر ہی گرمجوشی سے استقبال کرتی تھی۔

لیکن اماں کو کیونکہ پوری بات کا علم نہیں تھا اس لئے ایک دن انھوں نے پاشا دلہن سے صلح صفائی کر لی کہ بیچاریوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بیچ والے یوں ہی لگائی بجھائی کرتے ہیں (حالانکہ بیچ والوں میں میرے سوا اور کوئی نہ تھی) اس لئے بیچاری پاشا دلہن ان لوگوں پر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ رفتہ رفتہ پھر ہم اور قدیر ساتھ ساتھ ہنسنے لگے۔ لیکن اس دن کے بعد سے شہزاد آپا ہمارے ہاں کبھی نہیں آئیں۔ ایک دن میں ان سے لپٹ کر خوب روئی تو انھوں نے مجھے بھی معاف کر دیا۔ ان بیچاری کو خبر ہی نہ تھی کہ میں کیسی بی جمالو تھی!

قدیر کی اماں حیدر آباد سے لوٹیں تو جیسے سارے شہر کا سکون تک وہاں رہن رکھ کے مقفعے میں لگا آئیں۔ شہزاد آپا کے کانوں سے ہیرے کی بالیاں اتر گئیں۔ پاشا دلہن کے سونے کے کڑے بھی غائب ہو گئے۔ اب اسکول جاتے وقت قدیر کو پہلے کی طرح روپے کے بجائے صرف ایک آنہ ملنے لگا۔

" ہائے بیچاری مقدسہ ہارگئیں۔ اب گئے سب ٹھاٹ باٹ" پھوپو نے دلی مسرت سے کہا۔ اور فوراً کوٹھے پر جاکے پڑوسن کے ساتھ نودولتیوں کی حصلت پر گفتگو کرنے لگیں۔

اب شام کو آپا گھر آتی تھیں تو ان کے ساتھ نئی نئی شکلوں والی لڑکیاں بھی آنے لگیں۔ ان لڑکیوں کی خاطر تواضع کرنے کے لئے پاشا دلہن خود اٹھ کر آتی تھیں اور ان سے اپنے مخصوص دکھنی لہجے میں باتیں کرتیں۔

" ایسی سردی ہم کبھی نہیں دیکھے۔ ہاتھاں پانواں ٹھنڈے ہو جائیں"

پھر ایک دن ماموں جان نے اماں کو سنایا کہ رات یونین کے مشاعرے میں شہزاد بھی برقعہ اور کھڑ کے آئی تھیں، اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ پہلے تو اس خبر پر کسی کو یقین نہیں آیا میں فوراً دوڑی قدیر کے ہاں اس خبر کی تصدیق کرنے۔

" فیضی صاحب نے دعوت نامہ بھجوایا تھا۔ آپا کو بولے بھی تو انی زبردستی انہیں بھیج دیئے۔" قدیر نے چپکے سے بتایا۔

" کون فیضی صاحب؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

" ہی تو فیضی صاحب کو نہیں جانتی! کیسی دِوانی ہے! وہ آپا کو انگلش پڑھاتے ہیں۔"

اب میں اور قدیر بھی میٹرک میں آ چکے تھے، وہ کافی ہوش مندی کی باتیں کرنے لگے تھے۔ مثلاً محلے کے اکثر لڑکوں پر ہمیں شبہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے اسکول جاتے وقت باہر نکلتے ہیں۔ بلکہ ایسے شبہ پر قدیر تو اکثر کسی کا منہ چڑا دیتی۔ کسی پر ہنسنا شروع کر دیتی تھی۔ اسکول میں بھی ساری نڈر اور بے باک لڑکیاں اس کی دوست بن گئی تھیں۔ وہ سب سستی قسم کی جاسوسی ناولیں پڑھا کرتیں۔ ادھر میرے منگیتر ڈاکٹری کے پہلے سال میں آ چکا تھا اور اس نے مجھے سائنس چھوڑنے کی ہدایت کر دی تھی اور یہ بھی لکھ بھیجا تھا کہ میں زیادہ آزاد نہ بن جاؤں اس لئے اماں مجھے قدیر کے گھر کے سوا کہیں نہیں جانے دیتی تھیں۔ میں خود بھی کسی خوبصورت لڑکے کو سڑک پر جاتے دیکھ لیتی تھی تو دل اچانک گناہ کے احساس سے بھر جاتا تھا۔ جانے کون کہتا ہے کہ عورت کو مرد نے غلام بنا کر رکھا ہے۔ ابھی ہمارے دل کی بات پوچھے تو ہم مرد کی غلامی کرنے،

اسے سجدہ کرنے کا جذبہ لے کر ہی پیدا ہوئے ہیں کسی انجانے مرد کو ایک لمحے میں اپنی جان، اپنی روح، اپنا خدا ماننے میں عورت کو جو راحت ملتی ہے، وہ آزادی کے کون سے جذبہ میں ہے! وہ عورتیں کتنی بدنصیب ہوتی ہیں جنھیں کوئی حکم دینے والا، اپنی ملکیت جتانے والا نہیں ملتا۔ لوگ اُن کی عزت کرتے رہ جاتے ہیں اور وہ ساری زندگی ہاتھ پھیلائے کسی سہارے کو ڈھونڈا کرتی ہیں۔ شہزاد آپا کی طرح، جنھیں جانے کیا چیز نہیں ملی تھی! —— توبہ —— میں جانے کیا کہہ رہی تھی!

ہاں، تو اب ہم دونوں ٹائٹ شرٹ اور تنگ موری کے پاجامے پہننے لگے تھے۔ قدیر کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ فلم "میرے محبوب" کی ہیروئن کی طرح اپنے بال بھی ماتھے پر سے کاٹ لے۔ مگر آپا کے ڈر سے جھکی رہتی تھی، کیونکہ آپا امی تک۔ وہی ڈھیلے ڈھالا کلیوں والا کرتا پہنتی تھیں مگر قدیر کو ہر ت کا شوق تھا۔ ایسے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کا بڑا شوق تھا وہ کہتی تھی "ہم شروع ہی سے لڑکوں کے ساتھ رہیں تو ایسے بزدل نہ ہیں۔ میرا بس چلے تو ان سارے لڑکوں کو پیروں سے کچل ڈالوں جو سلامت بھائی کی طرح اپنے ماں باپ کے حوالے سے محور بن جاتے ہیں۔ میں تو ایسوں کو ماکوں چنے چبوا دوں۔"

شاید یہی کسی کو ستانے، ترسانے اور جلانے کا جذبہ تھا جو چودہ برس کی عمر میں ہر وقت اسے ابھارتا رہتا تھا۔ وہ مجھے اور اپنی دوسری سہیلیوں کو بھی خوب مارتی، ستاتی۔ سارے تھکا دینے والے کھیلوں میں شریک ہوتی تھی۔ پھر اکثر وہ میرا ساتھ چھوڑ کر کسی سہیلی کے ساتھ اس کے گھر بھی جانے لگی۔ پاشا دلہن کھڑکی میں سے جب مجھے اکیلا آتے ہوئے دیکھتیں تو گھبرا جاتیں۔

"قدیر پاشا نہیں آئے ——؟"

ایک دن پاشا دلہن اور شہزاد آپا مل کر اسے سمجھانے لگے۔

"تم کیوں گئی جی کسی کے گھر۔ کیا معلوم اس لڑکی کے گھر والے کیسے ہوں گے!"

"کیسے بھی ہوں امی۔ مجھے کھا تو نہیں جائیں گے!" اس نے تنک کر جواب دیا۔

"مگر ہر قسم کی لڑکیوں سے دوستی نہ بڑھاؤ۔" آپا امی کی مدد کو دوڑیں۔

"ہٹو۔ ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں جو ہر ایک سے بکتے پھریں۔"
اس نے بلا سوچے سمجھے کہا اور پھر آپا کا سرخ چہرا دیکھ کر جلدی سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ہنسنے لگی۔
"میری آپا جانی۔ اب میں بڑا ہو گیا نا۔ کیا چھوٹا پاپا ہوں کہ بھٹک جاؤں گی اور حسین گڈھ میں میرا دل بھی نہیں لگتا نا۔ بتائیے کیا کروں۔" وہ چھوٹے بچوں کی طرح پیر پٹکنے لگی۔

اس برس حسین گڈھ میں جیسی سردی پڑی، پھر کبھی نہ آئی۔ چوبیس گھنٹے سورج نہ نکلتا تھا۔ اسکول کالج بند ہو چکے تھے۔ سب دن بھر کمرے بند کئے بیٹھے رہتے تھے لیکن قدیر کے ہاں تو جیسے سب کسی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ تو ذرا سی خنکی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب تو دن رات کمرہ بند کئے بیٹھے رہتے۔ ہیٹر جلتا رہتا تھا۔ اس پر بھی پاشا دلہن کو نمونیا ہو گیا۔ وہ دن رات کراہے جاتیں۔
ایک رات کو میں اور قدیر کوٹ پہنے، لحاف پیروں پر ڈالے ہوم ورک کر رہے تھے۔ آندھی ہو یا طوفان، میں نے قدیر کے ہاں جانا کبھی نہ چھوڑا تھا۔ حالانکہ اتنی سردی میں سب مجھے منع کرتے تھے لیکن میں رات کا ہوم ورک ہمیشہ قدیر کے ساتھ بیٹھ کر کرتی تھی۔
مسہری پر پاشا دلہن لیٹی تھیں ان کے پاس نیچے فرش پر مالن بی بیٹھی حیدرآباد کے پرانے قصے سنا رہی تھی۔
آپا بھی اسی کمرے میں لیٹی کتاب پڑھ رہی تھیں اور بار بار اٹھ کر انگیٹھی میں کوئلے ڈالتیں اتنے میں دو بڑی فیشن زدہ سی لڑکیاں، سائیکلیں سنبھالے، کھٹ پٹ کرتی آئیں، آپا نے بڑے پرجوش انداز میں ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں ڈرائینگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ پھر مالن بی کو حکم دیا کہ بہت اچھی چائے بھیجو۔ لیکن میں نے اور قدیر نے مالن بی کو بٹھا کر خود ہی اپنی چھاپیں چائے تیار کی۔ کیونکہ یہ دونوں لڑکیاں کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کی پریسیڈنٹ اور سکریٹری تھیں اور کالج سے

نکل کر دوسرے کالجوں، اور اسکولوں میں بھی ان کی قابلیت اور ریسچ ورک کی دھوم تھی اسی لئے ہم دسویں کلاس میں پڑھنے والیوں کے لئے ان سے مرعوب ہونا اور انھیں تجسس بھری نظروں سے دیکھنا قدرتی بات تھی۔ میں چائے لے کر گئی تو ایک لڑکی آپا سے کہہ رہی تھی۔

"تمھیں فیضی صاحب کے پاس ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ ورنہ فنڈ کیسے اکٹھا کر سکیں گے۔"

"ہاں بھئی۔ ممکن ہے تمھیں دیکھ کر فیضی صاحب پچاس کے بجائے دو تین سو دے دیں۔"

اس دبلی پتلی فیشن زدہ لڑکی کا نام وحیدہ تھا اور اس ملائی سردی میں بھی وہ بغیر آستینوں والا صرف ایک مختصر سا بلاؤز پہنے تھی۔ وہ بلاؤز اتنا تنگ تھا کہ جب وہ زور سے ہنستی تھی تو مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں بلاؤز پھٹ نہ جائے۔

"ہاں اور نیا ——" دوسری لڑکی نے چائے کی پیالی اٹھا کر کہا۔

"بلکہ یہ گدھی اگر انھیں رام کرے تو کوئی نہ کوئی اسکالرشپ مار لے گی۔ اس احمق کو زندگی جینے کے گر ہی نہیں آتے۔ اللہ قسم مجھے تیری جیسی اگر ایک چیز بھی اللہ میاں دیتے تو زندگی آج امریکہ میں بیٹھی ہوتی۔" اس لڑکی کا نام دلپذیر احسان تھا۔ اور ان دلپذیر احسان نے زندگی جینے کے لئے اپنے بال کاٹ کر انھیں سیکڑوں پروں کی شکل میں سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں اور پچکے ہوئے گالوں پر جانے کیا الا بلا تھوپی تھی کہ بہت سے رنگ چمک رہے تھے ایسے سیاہ رنگ کی طرف سے وہ بالکل انجان ہو گئی تھی۔

"مگر آپی راضی نہیں ہوں گی۔ ہمارے خاندان کی لڑکیاں کبھی ——"

"ایسی تیسی تیرے خاندان کی۔" وحیدہ نے آپا کی پیٹھ پر ایک دھموکا دیا —— "پیاری تیرے خاندان نے تجھے ڈر کے علاوہ کوئی اور تحفہ بھی دیا ہے۔ بڑی آئی خاندان کی رکھوالی۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان لڑکیوں کو دھکے دے کر باہر نکال دوں۔ چڑیلیں میری آپا کو سکھا رہی تھیں جیسے ان جیسی لڑکیوں سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپا ان کی بات نہیں مانیں گی۔ کیوں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپا کسی غیر مرد سے بات کر سکیں۔

لیکن دوسرے دن ہم اور قدیر اسکول سے آئے تو پاشا دلہن نے بتایا کہ آپا اپنی

سہیلیوں کے ساتھ فنڈ جمع کرنے گئی ہوئی ہیں۔

"قدیر، پاشا دلہن نے آپا کو کیوں بھیج دیا۔ کالج کے لوگ بہت خراب ہیں۔ خواہ مخواہ باتیں پھیلائیں گے۔" میں نے بے حد پریشان ہو کر قدیر سے کہا۔

"لیکن آپا کو اسکالرشپ کے لئے بھی کوشش کرنا ہے نا۔ اگلے سال سے میں بھی کالج جاؤں گی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور آئینہ اٹھا کر اپنی صورت دیکھنے لگی۔

اس بات کو شاید ایک مہینہ گزر چکا تھا۔

ایک دن حسب عادت دولتیاں جھاڑتی ہوئی قدیر کے ہاں پہنچی تو ڈرائنگ روم میں ایک مرد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ایک موٹا، لمبا اور گنجا سا آدمی بہترین سوٹ پہنے بڑی شان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ قدیر سے پوچھوں کہ یہ کون گنجا آیا ہے لیکن پھر سوچا کہ شاید ان کا کوئی حیدر آبادی رشتہ دار ہو۔ کیونکہ میں نے آج پہلی بار ان کے ہاں کسی مرد کو دیکھا تھا وہ میز پر رکھے ہوئے مختلف کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ سامنے ماں بی سر ڈھانپے بڑے مؤدب انداز میں کھڑی تھی اور پردے کے پیچھے سے پاشا دلہن اپنے مقدموں کی داستان سنا رہی تھیں۔

قدیر مجھے ایک کونے میں لے گئی اور قہقہہ لگا کر بولی "دیکھا اس بن مانس کو۔ جانے اس گنجے سے آپا کیسے پڑھتی ہوں گی۔"

"وہ کون ہے!"

"اری یہی تو وہ فیضی صاحب ہیں۔ آپا کے پروفیسر۔ انھوں نے آپا سے کہا ہے کہ وہ ہمارے مقدمے کامیاب کروا سکتے ہیں ان کے بڑے بھائی بہت بڑے بیرسٹر ہیں۔"

"سچ —" میں خوشی سے جھوم اٹھی اور اسی وقت اپنے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ اللہ پاک فیضی صاحب ضرور پاشا دلہن کے مقدمے کامیاب کروا دیں۔ تاکہ ہماری آپا کو فنڈ جمع کرنے کی خاطر لوگوں کے گھروں پر نہ جانا پڑے۔

اس کے بعد اکثر فیضی صاحب قدیر کے ہاں آنے لگے۔ پاشا دلہن ان کی چائے اور

کھانے کا بے حد اہتمام کرتی تھیں۔ اس دن میں اور قدیر مل کر ڈرائینگ روم کو خوب صاف کرتے شہزاد آپا کے کاڑھے ہوئے ٹیبل کلاتھ اور کشن وہاں رکھتے۔ فیضی صاحب پہلے تو گیٹ پر ہارن بجاتے تھے۔ پھر مالن بی انھیں اپنے ساتھ لاکر ڈرائینگ روم میں بٹھا دیتی تھی تو پاشا دلہن پردے کے پیچھے سے بندگی عرض کرتیں۔ پاشا دلہن چاہتی تھیں کہ شہزاد اور قدیر فیضی صاحب کے سامنے نہ جائیں۔ اس لئے پہلے ہی اعلان کر دیا جاتا کہ دونوں لڑکیاں کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا کہ مقدموں کی تفصیل ساتے وقت پاشا دلہن اپنی دکھنی زبان میں کوئی بات انھیں نہ سمجھا پاتیں۔ فیضی صاحب بار بار پوچھتے کہ آپ کو مقدمہ دائر کئے کے برس ہو گئے! اور پاشا دلہن کی سمجھ میں نہ آتا کہ "کے" سے ان کا کیا مطلب ہے۔

تب وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر شہزاد کو بلاتیں کہ ان کی بات سمجھے، کیونکہ وہ یو، پی کی لڑکیوں کے ساتھ رہ کر کافی ایکسپرٹ ہو گئی تھیں۔ چنانچہ شہزاد آپا پہلے اپنے بالوں کو اچھی طرح دوپٹے میں لپیٹ کر آتیں اور اپنی اماں کو سمجھاتی تھیں۔

"صاب ایسا پوچھ ایئں کتے آپ کو مقدمہ چلا کر کتنے سالاں ہو گے!"

اور فیضی صاحب منہ پھاڑے شہزاد آپا کی بات یوں سنتے تھے جیسے وہ لاطینی بول رہی ہوں۔

اس سال کے رزلٹ بڑے ہنگامہ خیز رہے۔

میں اور قدیر جو ہر سال رعایتی نمبروں سے پاس ہوا کرتے تھے نہ صرف میٹرک پاس ہو گئے بلکہ شہزاد آپا بی یو سی میں فرسٹ ڈویژن آئیں۔

لوگ تو یونہی فیضی صاحب کے آنے جانے پر خفا بیٹھے تھے آپا کے فرسٹ آنے کی خبر سے اور جل گئے۔ خود ہمارے ماموں جان جو ایک زمانے سے شہزاد آپا کے بارے میں کچھ کہتے تھے سر ہو کر بول ہی اٹھے ـــــ "اب بھی پاس نہ ہوتیں۔ کیا فیضی صاحب کو یونہی گانٹھ رکھا ہے۔"

"واہ شہزادی آپا ایسی تھوڑی ہیں"۔ میں نے فوراً صفائی پیش کی۔ ہائی اسکول پاس کر کے انسان میں کتنی خود اعتمادی آجاتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب میں ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی اور ایک ذرا سا سچ بولنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ اور ماں ماموں جان کے سامنے جھوٹ کا ایک طومار گڑھ کے اپنی جان عذاب میں ڈال لی تھی۔

لیکن ماموں جان نے مجھے گھور کر دیکھا اور مسکرا دئے۔

"تم کیا جانو! ابھی سے تمھیں کیا معلوم کہ وہ کیسی ہیں"۔ اب میں انھیں کیا بتاتی کہ میں کیا کیا جانتی ہوں۔ بس چپ ہو جانا پڑا۔

انھوں نے اماں سے کہا "آپا اب مو سیانی ہو گئی ہے۔ اسے آوارہ لڑکیوں کے ساتھ مت بھیجا کرو۔ ورنہ احمد اسے قبولنے کو تیار نہ ہوگا"۔ یہ سن کر میں سہم گئی۔ کیونکہ مجھے اپنے اَن دیکھے منگیتر سے جانے کیسی محبت ہو گئی تھی حالانکہ سب کہتے تھے کہ وہ کالا بھجنگ ہے میرا اس کا جوڑ نہیں۔ لیکن میرا اس کا نام ایک بندھن میں بندھ چکا تھا اس لئے میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے خفا ہو جائے۔

اس دوران بیگم سراج کا پاشا دلہن سے ایک زوردار جھپٹا ہوا۔

کیونکہ ایسے قصے سننے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے وہ بات سنے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے۔

ہوا یہ کہ ایک نہایت مریل مرجھلا سا ناک میں بولنے والا لڑکا تھا۔ اس کا نام جھبو تھا اور سراج صاحب کی بیوی نے اسے اوپر کے کام کے لئے رکھا تھا۔ وہ لڑکا تھا تو صرف دس برس کا، لیکن حسین گڑھ کے نوکروں کی ساری خصوصیتیں اس میں سما چکی تھیں۔ لہٰذا ایک دن پاندان میں سے روپیہ نکالتے دیکھ کر بیگم سراج نے دس جوتیاں مار کے اُسے نکال باہر کیا۔ وہ روتا سسکتا کہیں مالن بی کے پلّے پڑا اور فوراً پاشا دلہن کی نظرِ عنایت اس پر ہوئی۔

اس دن سے پانچ چھ مہینے بعد پاشا دلہن کے پاؤں دبانے لگا۔

اس کے علاوہ سارا دن درختوں پر چڑھا کچے پکے پھل کھائے جاتا۔ اور بھتنوں جیسی

آواز میں قدرت کے ساتھ غاؤں غاؤں کرتا پھرتا۔ رکابیاں پیالے توڑتا، چھتوں پر کودتا اور مالن بی کے کوسنے گالیاں کھاتا پھرتا تھا۔ لیکن جس طرح کوئی بیوی اپنے نکمے سے نکمے شوہر کو سوکن کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح تمام محلے کی شریف اور مہذب بیبیاں اپنے نوکروں کو دوسروں کے ہاں برداشت نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ بیگم سراج نے بھی اپنے پھاٹک پر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کے آگے خوب بکھان کئے۔

"اری ہنو، میرے ہاں کے نوکر کو بھگا کے لے گئیں۔ اری وہ تو گھر کے مردوں کو بھی بھگا دیں۔ جب ہی تو میں نے کان پکڑے کہ ایسی لے حیاؤں سے کبھی نہ ملوں گی۔"

"بیچاریوں کے نصیبوں سے دولہے اجڑ گئے ہیں کہ اتنے اتنے سے بچوں کو گھیرتی پھرتی ہیں۔"

ادھر پاشا دلہن اپنی نرم و نازک آواز میں صفائی پیش کرنے لگیں۔ لیکن ان کی آواز اور زبان دونوں بیگم سراج کی روانی میں جانے کہاں بہہ گئیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ سراج صاحب کی لڑکی نفیسہ نے سامنے والے غنی صاحب کو چھوٹے کے ہاتھ چٹھی بھیجی تھی۔ اسی وقت بیگم سراج نے چھوٹے کو مارا تو اس نے انتقاماً وہ چٹھی بیچ سڑک پر پھینک دی۔ اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے وہ چٹھی اتفاق سے نفیسہ کے ہونے والے خسر کے بھائی نے اٹھائی ہے ۔۔۔ اور پھر جیسی کہ آپ کو بھی امید ہے چاروں طرف اچانک آگ بھڑک اٹھی۔

جہاں دشمنوں سے نمٹنے میں بیگم سراج طاق تھیں اور وہ ہر سچی بات کو اس طرح جھوٹی ثابت کر سکتی تھیں کہ خود کہنے والا توبہ کر لے۔ مگر انہیں فکر تھی تو یہ کہ کہیں وہ حرامی چھوکرے پاشا دلہن کے ہاں میوہ والے سان کھانے کی ترنگ میں یہ نہ سنا دیا ہو کہ خود بیگم سراج اس کے ساتھ برقعہ اوڑھ کر کہاں جایا کرتی تھیں۔

پاشا دلہن کو یہاں آئے ہوئے پانچ برس ہو گئے تھے اور اتنے دنوں حالات کی

چکی ہیں بسنے کے بعد وہ یہاں کے اصولوں اور روایتوں سے پوری طرح واقف ہو چکی تھیں۔

اس لئے بیگم سراج نے پٹھان کے خلاف آگ بھڑکائی تو انھوں نے سب روٹھے ہوؤں کو منانے کے لئے میلاد شریف کیا۔ بہانہ یہ تھا کہ لڑکیاں پاس ہوئی ہیں۔ ہم اور قدیر مہمانوں کی فہرست لے کر گھر گھر گئے۔

اب چاہے اشتیاق صاحب، ڈپٹی صاحب اور بیگم حیدر علی کے ہاں سراج صاحب کی بیوی سے پاشا دلہن کے خلاف کتنا ہی زہر اگلا ہو لیکن میلاد کا بلاوا پھیرنا تو سخت گناہ ہے اللہ رسول کا ذکر سننے سے کون سوا کافر کے انکار کر سکتا ہے۔

اس دن محلے کی لڑکیوں کے تو ٹھاٹ تھے۔ میں نے بھی ضد کر کے اس دن اماں کی سلیٹی بنارسی ساری پہنی تھی (حالانکہ میرا منگیتر فیشن کے سخت خلاف تھا) لیکن ہمارے ہاں لڑکیوں کو اپنی سج دھج دکھانے کا کوئی موقعہ تھا تو یہی میلاد کی محفلیں۔ یا پھر شادیاں ـــــ مگر بقول اماں کے، اب شادیاں تو عنقا ہوتی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے نصیب سے دولھے ہی اجڑ گئے کہ جس گھر میں دیکھو سوکھی اچھوری شکلوں والی لڑکیاں بچھتے جا رہی ہیں ـــــ پڑھتے جا رہی ہیں ـــــ کیا کریں بیچاریاں ـــــ ؟ ہاں، تو اس دن کیونکہ پاشا دلہن کے ہاں میلاد شریف تھا اور نکتیوں کے بجائے پیڑے بٹنے والے تھے اس لئے شام ہوتے ہی سارے اونچے گھرانوں کی بیبیاں چھم چھم غرارے ہلاتی زیوروں میں چمکتی، عطر میں مہکتی، آنا شروع ہو گئیں۔

ابھی حسین گڑھ میں ساریوں کا رواج زیادہ نہ تھا خصوصاً میلاد کی محفلوں میں تو انگریزی عطر لگانا اور ساری جیسا ہندوانہ لباس پہن کر آنا سخت منع تھا۔ بھلا ساری پہن کر رسالت مآب کے دربار میں کوئی کیسے جا سکتا ہے! لیکن پاشا دلہن آج بھی ساری پہن کر الگ پہچانی جا رہی تھیں۔ سفید بنارسی ساری اور سفید ہی حیدر آبادی جالی کا کرتا پہنے، ایک ہاتھ میں یاقوت کی تسبیح لئے وہ پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ اس سادگی میں بھی ان کا بوڑھا حسن دمک رہا تھا۔ اور ساری بیبیوں کی نگاہیں ان اماں بیٹی پر جمی ہوئی تھیں۔

شہزادہ آپا آج ہلکے گلابی چمکدار کپڑے کا دوپٹہ اور اسی رنگ کا تنگ مہری کا پاجامہ پہنے

بالکل مغل شہزادی لگ رہی تھیں۔ پاشا دلہن کہتی تھیں کہ ہمارے ہاں سات پشتوں سے کنواریاں یہی لباس پہنتی آئی ہیں۔ اس لئے قدیر بیگم میں روایت سے بغاوت کر لے مگر شہزاد ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔

ادھر حسین گڑھ کی لڑکیاں طرح طرح کے فیشنوں میں گم تھیں۔ نواب صاحب سیتا گڑھ کے ہاں کی خواتین، جن کے ہاں زینت محل کے فلم اسٹاروں والے تازہ ترین فیشن چلتے تھے اور نذیر حسین کے گھرانے والے، ان کی سویدیں تھی اس لئے ان کی لڑکیاں بھی بال کٹواتی تھیں۔ بغیر آستینوں والے بلاؤز پہنے، سر پر طرح طرح کے رنگ تھوپے، وہ کار ڈرائیو کرنا سیکھ رہی تھیں۔ اس طرف زینت محل" کا حسن تھا، جس کی وابستگی سے حسین گڑھ کے شاعروں نے شاعری کرنا سیکھی تھی اس گھر کی ایسی جیسے مرلے کی، واتیں تھیں۔

لیکن جس سے بات دلہن ان محفلوں میں شریک ہونے لگی تھیں تو سب کی نگاہیں شہزاد کی طرف بھی اٹھنے لگیں۔ کیونکہ شہزاد آپا نے اپنے حسن کو انتہائی سادہ بنا کر حسین گڑھ کے مردوں کی عقل پر جو چھاپہ مارا تھا وہ ایسی جگہ ایک انقلاب سے کم نہ تھا۔ آج تو اور بھی غضب ہوا جب انھوں نے سر سے پیر تک گلابی کپڑے پہن کر نہانے کے بعد اپنے بال یونہی کھلے چھوڑ دئے تھے

گو حسین گڑھ کی خواتین عطر پاش لئے مہمانوں پر عطر کی پھواریں چھوڑتی پھر رہی تھیں مگر ان کی نگاہیں شہزاد آپا پر تھیں۔ اندر والے کمرے میں بڑا سا تخت بچھا تھا۔ اس پر کار چوبی مسند تھی۔ اوپر زر بفت کا شامیانہ ڈال کر موتیوں، پیسوں اور پھولوں کی جھالروں سے سجایا تھا۔ سامنے مسند کے تکئے پر میلاد کی کتابیں رکھی تھیں۔ میر لقا دری کا سلام، میلاد اکبر اور چند کرم جیسی کتابیں جو پشت ہا پشت سے ہر گھر میں میلاد شریف کے موقع پر پڑھی جاتی ہیں۔

اگر بتیوں اور عود کے دھوئیں سے سب کھانس رہے تھے۔ دلہن کی سیج کی طرح سجائے ہوئے مسند کے نیچے میں قدیر، شہزاد آپا اور ہماری چند خوش گلو سہیلیاں اپنی اپنی بے سری آوازوں کو ایک سُر میں جمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جتنی عمر رسیدہ بیگمات تھیں انھوں نے سر ڈھانپ کر ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں جوڑ رکھے تھے اور تسبیح کی گردش بھی کچھ مدھم سی تھیں لیکن ان کی آنکھیں بڑے تجسس بھرے

انداز میں ہر بی بی کے کپڑے، زیور اور طور طریقے جانچ رہی تھیں۔ لڑکیوں نے بھی احتراماً سر تو ڈھانپ رکھے تھے لیکن ان کے بدن کے کسی حصہ کو قرار نہ تھا وہ آپس میں کھسر پھسر کر کے خوب قہقہے لگا رہی تھیں۔ اگر بتیوں سے اٹھنے والا خوشبوؤں کا دھواں بیبیوں کے لبوں سے دنیاوی کثافتیں دھو رہا تھا۔ ادھر شہزاد آپا کی نازک شریلی آواز روحانیت کے دروازے کھول رہی تھی۔

جس قدر حاضرین محفل ہوں — سب کی یا رب مرادیں حاصل ہوں

اے عدا صدقہ آل اطہر کا — خاتمہ ہو بخیر اکبر کا

رب سلم صلے علے رسول اللہ — مرحبا مرحبا رسول اللہ

عین اسی وقت پاشا دلہن نے نہایت سرگوشی بھرے انداز میں نواب بیگم کو سنایا۔

"شہزاد پاشا کی نسبت آئی ہے۔ فیضی صاحب کے ہاں سے۔"

"ایں — ! فیضی کے ہاں سے پیغام آیا ہے؟" نواب بیگم نے چونک کر اتنی زور سے پوچھا کہ تمام بیبیاں چوکنی ہو گئیں۔ کئی ایک تو اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور میلاد شریف کے احترام کو بھول کر پوچھنے لگیں۔

"کس کی نسبت آئی ہے! کہاں سے — !" جیسے انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"فیضی صاحب کا رشتہ آیا ہے شہزاد کے لئے۔ وہی فیضی صاحب جو انگلش کے ریڈر ہیں۔ دلی کا اونچا خاندان ہے۔ بہت پیسے والے لوگ ہیں۔"

"سچ مچ — !"

"اے کیا کہو ہو — !" پر جیسے ہی حواس ٹوٹے تو نذیر حسین کی بیٹی نے کہا۔ "اے وہ تو بڑے بدنام ہیں۔ یونیورسٹی میں تو ان کے آئے دن اسکنڈلز پھیلتے رہتے ہیں۔"

کیسا میلاد، کہاں کے حصے، ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ جیسے تیسے سلام پڑھا جانے لگا۔ احتراماً سب کھڑے ہوئے تو کئی خواتین چپکے سے دوسرے کمرے میں سٹک گئیں اور اس پیغام پر قیاس آرائیاں ہونے لگیں — ایک پاشا دلہن تھیں کہ ابھی تک یوں ہی آنکھیں بند کئے مراقبے میں بیٹھی تھیں اور ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

مرحبا مرحبا رسول اللہ

مرحبا مرحبا رسول اللہ

اور ایک شہزاد آپا تھیں کہ جانے کتنی بے شمار دعائیں مانگے جا رہی تھیں۔ ہم سب کب کے فاتحہ پڑھ کے چوکی پر سے اٹھ چکے تھے۔ مگر وہ جھولی پھیلائے کپکپاتے ہاتھوں سے جانے کیا مانگے جا رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو یہ دیکھا کہ دینے والے نے انھیں صبر تو بالکل نہیں دیا ہے اسی لئے مذاہ آنکھوں سے بھی جب آنسو ڈھلکنے لگے تو گھبرا کے وہ اٹھ بیٹھیں۔

دالان کے تھم سے لگی پیڑے کھاتی ہوئی ان کی سہیلی رضوانہ نے کہا۔

"اب فیضی کے بعد اور کتنی لمبی فہرست دے رہی تھیں اللہ میاں کو؟"

"ایک درجن بچوں کی ___" کسی نے پیچھے سے کہا اور بچاری آپا سچ مچ شرم سے سُرخ ہو گئیں۔

دوسرے کمرے میں پاشا دلہن بیبیوں کو سنا رہی تھیں۔

"اللہ میاں کو معلوم ہے بہن کہ میں شہزاد بیگم کے ابا کی رُوح سے سخت شرمندہ ہوں۔ ہمارے خاندان کی بیٹیاں تیرہ چودہ برس کی عمر میں اٹھا دی جاتی ہیں۔ شہزاد پاشا اٹھائیس برس کے ہو گئے۔ میں کیا کروں ان کی قسمت ہے۔"

وہ ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگیں۔

"مگر اب تو ہیرا سا داماد کھوج ہی ڈالا تم نے۔ بڑی نصیبے والی ہو پیاری۔ ورنہ آجکل تو ایسے پڑھے لکھے خاندانی لڑکے دولہے کے لئے ڈھونڈو تو نہیں ملتے۔"

"ہاں لڑکا ماشے اللہ بہت اچھا ہے۔ پڑھا لکھا۔ صورت دار بڑے باپ کا بڑا بیٹا۔ مگر بس اتنا ہے کہ ذرا نیمو کا رس بہت پیتا ہے۔" اشتیاق صاحب کی بیوی نے سب کو سنایا۔

"نیمو کا رس پیتے ہیں، کیوں ___؟" ایک ساتھ کئی عورتوں نے پوچھا۔

"بس یوں ہی۔ کبھی زیادہ پی لی تو نیمو کی ترشی کی ضرورت پڑا ہی کرتی ہے۔ ویسے لڑکے میں کوئی برائی نہ ہے۔"

"ایوّ، تو کیا انے (وہ) پینے والا ہے!" باشا دلہن گھبرا گئیں۔

"اے ہٹو تمھاری باتیں!" انھوں نے زور سے ایک تھپڑ باشا دلہن کے کاندھے پر رسید کیا "کوئی عادی شرابی تھوڑی ہے۔ یوں ہی کبھی کبھار دوست کسی کوٹھے پر لے گئے تو تھوڑی سی چکھ لی۔"

"تو کیا کوٹھوں پر بھی جاوے ہے"! کوتوالن نے ناک پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ ساری خواتین سانس روکے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

"اے بھائی مجھ سے ہر بات کیوں پوچھے جا رہی ہو!" اشتیاق صاحب کی بیوی پریشان ہو کر بولیں۔

"ان کا پرانا دوست ہے فیضی۔ ہر وقت کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس لئے میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ بیچارہ کبھی کبھار زیادہ روپے ہار جاتا ہے تو غم غلط کرنے کوٹھے پر چلا جاتا ہوگا۔ اب تم لوگ چاہو تو اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا لو۔"

"ہائے تو گویا مٹ گیا جواری بھی ہے!" شرافت حسین کی بیوی نے بچے کے منہ میں سے دودھ چھڑا کے اسے ٹھسک دیا۔

"اے تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ جیسے میں اس پر تہمت لگا رہی ہوں۔ کبھی ریس کے لئے پیسے نہ ہوں تو کیا بیچارا اتنے سے بھی جی نہ بہلائے! مگر تم سب تو بال کی کھال نکالتے ہو حالانکہ سب گواہ ہیں میں نے اس کے سوا جو کچھ کہا ہو کہ وہ نامراد نیمو کا رس پیتا ہے اللہ جانتا ہوگا جو اس میں اور کوئی برائی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے پیچھے پڑوسیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھوڑ گئیں۔

ان دنوں باشا دلہن، اکثر دوپہریوں میں رنگین جھلملاتے کپڑے پھیلا کے بیٹھ جاتیں۔ پھر مالن بی کے ساتھ انھیں آڑا ترچھا کاٹتیں۔ ایسے وقت شہزاد آپا کبھی کمرے سے باہر نہ آتی تھیں۔ ایک بار مالن بی نے انھیں کوئی بلاؤز قطع کرنے کو دیا تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اندر بھاگ گئیں۔

لیکن اس حادثے کے بعد دالان پھر سونا ہو گیا۔ اور سب چمکتے ہوئے کپڑے بکسوں میں سمینٹ کر رکھ دیئے گئے۔

میں اور قدیر بڑی اداسی سے سوچتے کہ اب کیا کریں! آپا کی شادی میں دھومیں مچانے کے کیا کیا پروگرام بنائے تھے۔ اِس سال آپا نے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ لہٰذا ہم اس اہتمام میں لگ گئے۔ کالج جانے والی لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی طرح ہنسنے اور چلنے کی پریکٹس کرنے لگے۔

شام کے وقت کئی لڑکیاں ہمارے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے آجاتی تھیں۔ ایک شام آپا بھی کتاب ہاتھ میں لئے ٹہلتی ہوئی ہمارے پاس آکھڑی ہوئیں اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس واقعہ کے بعد اکثر مجھے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔

اتنے میں گیٹ کے اندر ایک کار آئی اور فیضی صاحب اترے۔ ان کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ سیاہ برقعوں میں گوری گوری صورتیں چھپائے ہوئے۔ زیوروں میں لدی ہوئیں خوب بھڑکیلے کپڑے پہنے۔ میں نے اور قدیر نے چھوٹے کو بازار بھیج کر خوب مٹھائیاں اور پھل منگوائے میرا دل جانے کیوں ناقابلِ برداشت خوشی سے کانپ رہا تھا۔ جیسے خود میرا دولھا کمرے میں آبیٹھا ہو۔

معلوم ہوا یہ شہزادآپا کی ہونے والی نندیں ہیں اور فیضی صاحب کے بارے میں چند عورتوں نے جو غلط فہمی پھیلادی ہے اسے دور کرنے آئی ہیں۔

مالن بی نے جلدی سے انھیں بڑے کمرے میں تخت پر لے جاکر بٹھایا اور پاشا دلہن ان کا استقبال کرنے پورچ تک آئیں۔

مالن بی دروازے میں کھڑی بڑی تنقیدی نظروں سے بڑے پاشا کی نندوں کو دیکھ رہی تھی اور قدیر بار بار ڈرائینگ روم میں جھانک کر کہتی۔

"چھی کیسی منحوس شکل کا ہے یہ آدمی۔ ہائے میری آپا پر کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ میں تو زہر کھالوں مگر ایسے کمینے آدمی کی صورت نہ دیکھوں۔"

کوئی تین گھنٹے تک ان خواتین نے پاشا دلہن سے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی اتنی

تعریفیں کیں کہ ان کے جانے کے بعد پاشا دلہن کا چہرا خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ رات کو سارے کاموں سے نمٹنے کے بعد مالن بی اکیلی ہی ڈھول سنبھال کر بیٹھ گئی تھی۔

کیسا جادو ڈالا ماں بنارسی رومال والا
میں بیٹھی تھی کوٹھریا میں
نکلہ کر جھٹی پھینکا ماں بنارسی رومال والا
کیسا جادو ڈالا ماں ——
میں بیٹھی تھی امبیاں میں
پڑھ کے نیمو پھینکا ماں بنارسی رومال والا
کیسا جادو ڈالا ماں بنارسی رومال والا

پھر میں اور قدیر بھی مالن بی کی آواز میں آواز ملانے لگے اور شہزادی آپا چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

ہم سے رہا نہ جائے گا ملے جان تیرے بغیر

مالن بی نے دوسرا گیت شروع کیا تو آپا ضبط نہ کر سکیں اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اندر بھاگیں۔ پیچھے پیچھے ہم دونوں۔

آپا مسہری میں گر کے سسکیاں لینے لگیں۔ اُن کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں قدیر کہہ رہی تھی —
"میری اپیا کے بال ہی ایسے ہیں کہ سب اجاڑ صورتاں اس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں"
"مگر خدیر یہ معلوم ہے کہ میں اپنے بال کسے دے چکی ہوں!"
آپا اُٹھ کر بیٹھ گئیں تو قدیر نے سر جھکا لیا۔ آپا نے اپنے آنسوؤں کو گالوں کے ابھار پر آنے دیا اور جھنجلا کر بولیں۔
"پھر تم لوگ مجھے مرنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو!"
"تو پھر ہم کیا کریں آپا —" قدیر کے اس سوال پر مجھے بہت تعجب ہوا۔ یہ لڑکی کیسی سیانی ہو گئی ہے! کتنی ہوشمندی کی باتیں کرنے لگی ہے! آپا کو بھی بڑا تعجب ہوا۔ انھوں نے قدیر کو

بڑے غور سے دیکھا اور بے بسی سے ہاتھ مل کر بولیں۔
"ہو تو ٹھیک کہتی ہے۔" انھوں نے آنسو پونچھ لئے اور چھت کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے اب سنگسار ہونے کو تیار ہوں۔
اس دن سے نیفی صاحب نے رتن دیر کے ہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ جس وقت دیکھو سر اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور پھر یہ اصرار کہ شہزادی بھی ان کے پاس آ کر بیٹھے۔ پاشا دلہن پہلے تو بہانوں سے ٹالتی رہیں پھر صاف صاف کہہ دیا کہ عقد سے پہلے شہزادی بیگم ان کے سامنے نہیں آسکتیں مگر تو سمجھتے ہوئے جوان کے کان پر جوں تک نہ رینگی ہو۔
جب کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی تو ایک دن پھر ایک لحیم شحیم خاتون تشریف لائیں۔ نیفی باہر کار میں بیٹھے رہے۔ معلوم ہوا نہ یہ نیفی کی بہن ہیں اور اپنے ساتھ شہزادی آپا کو بازار لے جانا چاہتی ہیں تاکہ وہ اپنی پسند کے زیور اور کپڑے وغیرہ خرید لیں۔ کیونکہ شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ پاشا دلہن کے انکار پر وہ بہت خفا ہوئیں اور آخر میں بولیں۔
"اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہے تو شہزادی کو ہمارے ساتھ بھیجئے ورنہ میں جاتی ہوں۔"
یہ سن کر سب گھبرا گئے۔ نیفی صاحب نے ایک مشہور بیرسٹر کر دیا تھا۔ پاشا دلہن کے مقدموں کے لیے۔ پھر ان کی تنخواہ بہت بڑی تھی اور یورپ ہو آئے تھے۔ دلّی میں ان کی خاندانی جائیداد بھی۔
اس لئے پاشا دلہن کے کسی فیصلے سے پہلے شہزادی آپا کمرے سے باہر آئیں اور ان خاتون کے ساتھ باہر چلی گئیں۔
ان سب کے جانے کے بعد پاشا دلہن اور سالن بی نے جو رونا شروع کیا ہے تو کسی طرح نہ چپیں۔ ہم نے لاکھ جتن کئے۔ پھر ہماری اماں آ گئیں اور انھوں نے کہا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب پڑھے لکھے ہیں اس لئے پرانی روایتوں کا خیال چھوڑ دو۔ لیکن پاشا دلہن کو غصہ تھا تو ان خاتون کی زبردستی اور اپنی بے بسی پر۔ آج شہزادی کے باپ زندہ ہوتے تو کسی بادشاہ کی ہمت نہ ہوتی کہ ان کی بیٹی کو یوں زبردستی

گھسیٹ لے جاتا۔

خیر شام ہوئی۔ شہزاد آپا نہیں لوٹیں ـــــ رات ہو گئی ـــــ صبح ہوئی ـــــ میں اور قدیر ادبیر شہزاد آپا کے کمرے کی کھڑکی کھولے سڑک پر فیضی صاحب کی کار ڈھونڈھ رہے تھے۔ مالن بی کے ساتھ قدیر دو بار ان کے مکان پر جا چکی تھی۔ ملازم سے معلوم ہوا کہ فیضی صاحب تین دن کے لئے دلی گئے ہیں۔

تب تو وہ آپا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں روتے روتے قدیر کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

مالن بی بھی سب کی نظریں بچا کر اپنی آنکھیں پونچھتی پھر رہی تھی اور باشا دلہن نے اپنے اوپر لحاف ڈال لیا تھا انہیں لرزہ چڑھ رہا تھا۔ کیونکہ محلے والوں کو جانے کیسے اس بات کی سن گن لگ گئی تھی اور ہر گھنٹے پر کسی نہ کسی بہانے سے کوئی نہ کوئی خاتون آدھمکتیں یہ پوچھنے کہ شہزاد کہاں ہے۔

مالن بی بھی کہہ رہی تھی کہ بازار آنے والے مختلف کوٹھیوں کے نوکر تو یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ حیدر آبادی نواب کی لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

بیگم سراج نے تو فوراً یہ بھی مشہور کر دیا کہ چھوٹے نے انہیں وہ سب خط لا کر دیئے ہیں جو شہزاد نے فیضی کو لکھے تھے۔

"اے مجھے تو آٹھ دس دن پہلے سے خبر تھی کہ وہ لونڈیا اڑنے والی ہے بہن جبھی تو کہتے ہیں کہ جوان لڑکیوں پر اتنی پابندی مت لگاؤ۔ لو دیکھو موقعہ پاتے ہی پھر سے اڑ گئی۔"

تیسرے شام بڑے آپا گھر آئیں تو ان کی رنگت ہلدی جیسی ہو رہی تھی جیسے وہ مسلسل تین دن تک پیدل چلتی رہی ہوں۔ آتے ہی وہ اپنے کمرے میں گئیں۔ اور کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا مالن بی اور باشا دلہن ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

"لڑکیو تم اوپر جا کر پڑھو" باشا دلہن نے کہا تو ہم دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اس طرح کہ ہمارے اندیشوں سے بھرے ہوئے دل کا بوجھ کسی طرح نہ سنبھل رہا تھا

اور ہمارے بیرمن امن بھر کے ذرا ہو گئے تھے۔ پھر بی سر جھکائے اکنومکس کی پھوری سلجھاتی رہی کہ جس چیز کی قیمت گر جاتی ہے اس کی قدر بھی گر جاتی ہے۔

تیسرے دن میں قدیر کو کالج لینے کے لئے بھی تو پوچھا: "شادی کی کون سی تاریخ ٹھہری؟"

اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے کنگھا دور پھینکا اور کھلے بال لپیٹتی مجھے لے کر اوپر آ گئی۔

"یہ فیضی صاحب سے لڑ کے آئی ہیں!"

مجھے ہنسی آنے لگی۔ بیچاری آپا کو بڑے ترقی پسند منگیتر سے پالا پڑا تھا۔

"انھوں نے آپا کو جو تحفے لا کر دیئے وہ سب پھینک آئیں اب ہمارے مقدمے کا کیا ہوگا!" قدیر سسکیاں لینے لگی۔

"بیچاری آپا —" مجھے آپا کی مجبوری پر دکھ ہو رہا تھا۔

"ہاں، آپا ہمیشہ بیچاری ہی رہنا چاہتی ہیں۔ اپنے آپ کو چھوئی موئی بنا لیا ہے — اگر میں آپا کی جگہ ہوتی —"

اس نے دانت کچکچا کے کہا جیسے فیضی کو کچا چبا ڈالے گی۔

مالن بی اور پاشا دلہن نے اس بات کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر لوگ اس دلچسپ موضوع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔

شہر کے نومشق شاعروں نے اس موضوع پر خوب طبع آزمائی کی جو فیضی کے نام سے بھی واقف نہ تھے انھوں نے بھی اس کی دوستی کا دم بھرا اور نئے نئے انکشاف ہونے لگے۔

کالج میں احمد کی بہن نے لیکچرس سے کہا کہ شہزادی تو پرانی پاپی ہے وہ تو اکثر کسی نہ کسی کے ساتھ کیمپ یا مینی تال وغیرہ جایا کرتی ہیں —

بیگم اشتیاق کی روایت تھی کہ فیضی کا تو یہ پرانا کاروبار ہے وہ شادی کے لئے کبھی تیار ہی نہ تھا۔

مسز ہارون اپنے کوٹھے پر کھڑی پڑوسنوں سے کہہ رہی تھیں۔

" اری بہن، میں تو جانو یہ حیدر آباد کی کسبیاں ہیں وہاں دھندا نہ چلا تو حسین گڈھ کو آباد کرنے آگئیں۔"

" ہاں آپا سچ کہتی ہو" پڑوسن بھی تائید کرتی۔

" غضب خدا کا تین دن تک لڑکی اس کلموہے کے ساتھ رہی تو یوجا تو منکی ہو گی اس حرام خور نے! بھلا سیفی کے چنگل سے کوئی لڑکی نکل سکتی ہے! میری چھوٹی بہن حمیرا یہیں رسیجا ہوا تھا۔ اس کے تو پچاسوں قصے مشہور ہیں۔"

ادھر ہمارے شہر کے نوکر —— اللہ کی پناہ ——

الہ دین پاشا دلہن کے پڑوس میں خانساماں تھا مگر اس نے ڈاکٹر نسیم کے ہاں جا لگائی کہ شہزاد کے خطوط لے کر فیضی کے ہاں وہی جایا کرتا تھا بلکہ اس نے تو مسز نسیم سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اب کی وہ خط لا کر ان کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ اور مسز نسیم بیچاری نے اس خوشی آنند وعدہ کے بھروسے پر اسے بیڑی پینے کے لئے ایک اٹنی بھی تھما دی۔ ایک بار میں اور قدیر کالج سے نکلے تو لڑکوں کی ایک ٹولی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ تو روز کا معمول تھا کہ لڑکے اپنی سائیکلیں تھامے گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور راستے بھر فلمی گیت اور بھپتے ہوئے فقرے سنانے چلتے۔

مگر اس دن ہم دونوں سعیدہ آپا کے لیکچر پر بحث کرتے کرتے چونکے تو ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

" چلو یار —— آج ساتھ ہی چلیں۔ دام پوچھ آئیں گے۔"

" پرانی کار کے یا نئی کار کے۔؟" اس کے دوست نے بالکل ہمارے قریب آ کر کہا۔

" کون وہ فیضی والی! لاحول ولا ——"

گھر آ کر قدیر نے کتابیں پھینک دیں اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ میں ایک طرف شرمندہ سی کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کوئی قدیر کے رونے کی

وجہ پوچھے تو کیا بتاؤں گی! مگر خدا کا شکر ہے کہ پاشا دلہن ماں بی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ شہزادی آپا سامنے میز پر اپنا کرتا پھیلائے استری کر رہی تھیں ــــ کرتی رہیں ــــ انھوں نے بڑے اطمینان سے اپنے سب پاجامے، کرتے، دوپٹے تہہ کئے اور الماری میں رکھے۔ پھر اپنے بالوں کو منہ پر سے ہٹاتی ہوئی قدیر کے پاس آئیں۔

"قدیر پاشا ــــ تم ابھی سے رونا شروع کئے تو کتنا روتے منا ــــ؟ اسا نکو رو۔ تمھیں صرف ہنسنا ہے۔ آنسو میرے لئے چھوڑ دو۔"

"آپا میں بدلہ لوں گا۔ میں جان لے لوں گا۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا اور بہن سے لپٹ کر رونے لگی۔

اس کے بعد قدیر نے میرے ساتھ کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ برقعہ اوڑھ کر رکشا میں جانے لگی۔ ایک دم وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ہر وقت قہقہے لگانے والی قدیر کو ان باتوں پر بھی ہنسی نہیں آتی تھی جن پر آپا بھی مسکرا پڑتی تھیں۔

وہ کالج سے بھی اکثر غائب رہنے لگی۔ ساری بے تکلف سہیلیوں سے رسمی بات چیت کرتی، اور تو اور وہ مجھ سے بھی جیسے کچھ چھپانے لگی تھی۔ میں بڑی دیر تک کالج کے گیٹ پر اس کا انتظار کرتی تھی۔ مگر وہ کالج ختم ہوتے ہی جانے کہاں چلی جاتی تھی۔

ایک دن کالج میں یوں ہی قدیر کا ذکر آیا تو رشیدہ نے کہا کہ اب تو قدیر کا بھی فیضی کے ساتھ رومان چل رہا ہے۔ ہمارے حسین گڑھ میں ہر ناممکن بات کہنا اور سننا ممکن ہے اسلئے میں نے بھی اس کا رخیر کو خاموشی سے برداشت کیا۔ لیکن جب رات کو میں نے قدیر سے پوچھا کہ آج کہاں تھیں تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"ذرا فیضی صاحب کے پاس گئی تھی۔ انگلش کے نوٹس تیار کرنا ہیں۔"

"تم ــــ تم بھی فیضی کے پاس جانے لگیں ــــ!"

مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میری جان۔ انھوں نے آپا کو پسند کیا تھا میں انھیں پسند کرتا ہوں۔"

تعجب کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ ذرا دیر کو تو مجھے حسین گڈھ کی ان ساری افواہوں اور سرگوشیوں پر یقین آگیا جو ان بہنوں کے بارے میں مشہور تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ ہنستے ہنستے قدیر نے چپکے سے گالوں پر ڈھلک آنے والے آنسو پونچھ لئے اور نظریں جھکا کر بولی۔

"سلمیٰ، میں نے تجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مگر اب چھپانا پڑ رہی ہے۔"

"قدیر تو پاگل ہو گئی ہے!! اس بھیڑیئے کے پنجے سے کیسے نکلے گی!" میں نے اسے جھنجھوڑ پھینکا میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی پیاری سہیلی کے لئے ابھی سے خوب رو دوں۔ اس نے شہزاد آپا کے انجام سے بھی کوئی سبق نہ لیا۔

"تو ابھی بہت چھوٹی ہے متّا، ذرا مجھ سے عقل سیکھ۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔

تین چار دن بعد ایک صبح میں کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو شہزاد آپا نے بلا بھیجا۔ وہ اوپر والے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ صورت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کیلئے مہینوں رو کر اٹھی ہوں۔

"تمھیں معلوم ہے کہ خدیر پاشا کیا کر رہے ہیں۔ فیضی اتنا پاگل نہیں ہے کہ کسی لڑکی سے شادی کر لے گا۔"

میں یوں اچھل پڑی جیسے اچانک انگاروں پر پیر پڑ گیا ہو۔

قدیر کی حرکتوں پر میرا سر ندامت سے جھکا رہا تھا۔ ہم دونوں بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کچھ کہنے کے لئے پوچھا — "قدیر کہاں ہے —؟"

"وہ کل سے گھر نہیں آئی ہے۔"

میں نے پھر سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں خود بخود شہزاد آپا کے ساتھ رو رہی تھی۔

تین دن ہو گئے۔ قدیر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ پرچہ رکھ گئی تھی کہ میرے چلے جانے سے گھبرانا مت۔ لیکن پاشا دلہن کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور مالن بی سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی۔ شہزاد آپا ہونٹ دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ٹہلے جا رہی تھیں۔ جانے

خیریت گذری کہ ان دنوں کالج کی لڑکیاں پکنک پر آگرے گئی ہوئی تھیں اس لئے بات نبھ گئی اور محلہ والوں کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی۔

چوتھے دن مغرب کے بعد ایک کار پورچ میں آئی اور قدسیہ اور فیضی ہنستے ہوئے اترے قدسیہ سرخ زریں ساری پہنے تھی۔ خوب زیور پہن لئے تھے۔ ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور مانگ میں افشاں بھی چمک رہی تھی۔ معلوم ہوا ان دونوں نے دہلی جا کر عقد کر لیا ہے۔ آتے ہی قدسیہ ایک ایک سے لپٹ کر ملی فیضی نے بھی دلہن کو جھک کر سلام کیا۔ شہزادی آپا تعجب کے مارے کانپ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقعہ پر ہنسیں یا رو دیں!

فیضی کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر قدسیہ میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر بھاگی اور مجھ سے لپٹ کر بولی "کیوں مان گئیں نا ہمیں۔ کیسا انتقام لیا ہے! یہ مسٹر اتنی آسانی سے جھانسے میں آنے والے تھوڑی تھے! میں نے اسے دھمکی دی کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ شادی کر و ورنہ پرنسپل کے آگے پوری بات رکھ دوں گی۔ ڈر کے مارے وہ مجھے فوراً دہلی لے کر بھاگا!"

"تو کیا —— کیا تم نے ——" میں جانے کیوں پسینے میں نہائی جا رہی تھی۔

"ہاں بھئی میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اس سے آپا کے آنسو چھین لوں گی۔"

"لیکن اب یہ بات دوسرے مت کہو ——" میں نے سہم کر کہا۔ "وہ بھا رانتو ہے اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔"

"اری جا بڑی آئی مجھے عقل سکھانے والی۔" اس نے حسب عادت قہقہہ لگا کر کہا اور نیچے چلی گئی۔

امی اب ہم ہنی مون منانے کشمیر جا رہے ہیں۔ وہاں سے فیضی کے وطن دلی جائیں گے۔" پھر وہ میری طرف دیکھ مسکرانے لگی۔

"اب تو بھی چلی جا نہ اس نخروں والے میاں کے پاس جو تجھے دس برس سے اپنے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔"

پھر وہ شہزادی آپا کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکرانے لگی۔

"میری اپیا جانی۔ اب مسکراؤ نا فیضی نے ایک ہزار خرچ کر کے ایک اور وکیل کر دیا ہے۔ اب تم مقدمہ جیت لوگی۔"

مگر شہزاد آپا اس بات پر رو پڑیں۔ پھر دونوں بہنیں خوب مل کر روئیں۔ قدیر چلی گئی تو جیسے آپا کے ہاں کوئی جاندار نہ رہا۔ ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ کشمیر جانے کے کوئی دو مہینے بعد قدیر کا خط آیا کہ فیضی اس سے روٹھ کر حسین گڑھ چلے گئے ہیں اور وہ یہاں اکیلی گھوم رہی ہے۔ تین مہینے بعد وہ لوٹی تو اس میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں آ چکی تھیں وہ بہت دبلی ہو گئی تھی۔ حد سے زیادہ بدمزاج اور سست۔ ان دونوں کی ایک منٹ کو نہ بنتی تھی۔ پاشا دلہن کے ہاں بھی دونوں بہت کم آتے تھے۔ اور جب بھی آتے تو فیضی کے ساتھ قدیر کی لمبی چوڑی شکایتوں کی فہرست ہوتی۔ پاشا دلہن کبھی اسے پیار سے ڈانٹتیں اور کبھی سمجھاتیں۔ شہزاد آپا الگ رو رو کر قدیر کو سمجھاتی تھیں۔ لیکن قدیر کی شادی کے بعد وہ فیضی کے سامنے کبھی نہ آئیں۔ خود فیضی بھی گھر آتے تو ان کی طرف سے یوں انجان بنے رہتے جیسے قدیر کی کسی بڑی بہن کا وجود ہی نہ ہو۔

قدیر کا بیاہ ہوتے ہی میرے منگیتر کا نیا آرڈر آیا کہ اگلی چھٹیوں میں وہ شادی کو آ رہا ہے اس لئے میں چست لباس پہننا اور اپنی سہیلیوں سے ملنا بالکل چھوڑ دوں۔ اماں نے یہ حکم سنایا تو میں نے نہ جانے کس دل سے اپنے وہ سب کپڑے بکسوں میں بند کئے جو میں نے جی جان سے سلوائے تھے۔ قدیر کے جانے کے بعد میری سہیلی کون تھی جس سے میں رشتہ توڑتی۔ اسلئے اب میں بھی اپنے آنگن میں سلنے والے جگمگاتے جوڑوں میں کھو گئی۔ اماں تو میرے بیاہ کی تیاریوں میں یوں لگی ہوئی تھیں۔ جیسے کل ہی میرا دولہا آنے والا ہو۔ مگر یہ بات صرف شہزاد آپا جانتی تھیں کہ یہ چھ مہینے میرے لئے چھ کروڑ برس بنے ہوئے تھے۔

آپا اب اور اداس رہنے لگی تھیں۔ وہ صرف اس وقت مسکراتیں جب میرے دلہن بننے کا ذکر ہو رہا ہو۔ اب ان کے ہاں کوئی بات نہ کرتا تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد شہزاد آپا بھی گھر پڑی سارا دن گذارتیں۔ وہ ریسرچ کی تیاری کر رہی تھیں۔ میں اب بھی شام کو

کالج سے آتے ہی ان کے پاس جاتی تھی۔ وہ حسب معمول اپنے بالوں کو سفید دوپٹے سے ڈھانپے نازک ہاتھوں سے کتابیں الٹتی پلٹتی رہتیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کی بھیگی بھیگی سی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

چائے بناؤ۔" اُن کا حکم ہوتا، جب کبھی وہ مجھ پر یا قدیر پر بہت مہربان ہوتی تھیں تو ہم سے چائے بنوایا کرتیں۔ یا پھر چائے پی کر وہ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتی ہونگی تاکہ ہماری بکواس پر کم از کم مسکرا ہی دیں۔

چائے کے دوران میں اکثر آپا کو کالج کی خبریں سناتی تھی۔

" آپا ـــ آپا آج صفیہ آتشی رنگ کی پیور سلک کی ساری پہن کر آئی تھی ـــ اور کل مینر بانو کے الوداعی فنکشن میں عقیلہ آپا نے سارے کا جوڑ کھولئے ـــ آپا ـــ آپا کیا واقعی محسنہ کا رومان شریندر سے چل رہا ہے؟"

" مجھے کیا معلوم ـــ" وہ میز پر پیالی رکھ کر کہتیں۔

" بھئی وہ دونوں تو آپ کے کلاس فیلو تھے نا!"

" لیکن یہ باتیں کلاس میں تھوڑی سی ہوتی ہیں۔ یہ اسکیمیں تو لوگ باہر تیار کرکے پھیلاتے ہیں۔" ان کے چہرے کی اداسی بڑھ جاتی تھی اور میں فیضی والا واقعہ یاد کرکے چپ ہو جاتی تھی۔

شہزاد آپا کی سہیلیاں اب بھی آتی تھیں۔ اُن کے جانے کے بعد کبھی ان کا موڈ اچھا ہو جاتا کبھی ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی تھی۔

بڑی بہادر بنتی ہیں ـــ میں دل میں سوچتی ـــ بھئی تنہا بسر کرنے والی لڑکیوں کے دل بھی چڑیا کے تو نہیں ہوتے! یہ تو بس اس قابل تھیں کہ کوئی سخت تنگ مزاج جابر قسم کا مرد انھیں اپنے چھوٹے سے گھر میں بند کر دیتا۔ جہاں بے حد پردہ ہوتا۔ اور وہ بچے پالنے، کھانے پکانے اور شوہر کی ڈانٹیں سن کر رونے میں زندگی گذار دیتیں۔

قدیر اور فیضی چھٹیاں گذارنے بھی گئے تو اُن کا کوئی خط ہی نہیں آیا۔ پاشا دلہن دن بھر

پوسٹ مین کا انتظار کرتی تھیں۔

مالن بی روز آپا سے خط لکھوائے جاتی۔

آخر قدیر کا جواب آ ہی گیا۔

بہت مختصر سا خط تھا۔ اس نے فیضی سے طلاق لینے کی درخواست عدالت میں دے دی تھی۔ طلاق کے بعد وہ بمبئی کے ایک اسکول میں ٹیچر لگنے والی تھی اس نے حسین گڈھ کبھی نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

قدیر کی طلاق کی خبر پورے حسین گڈھ میں آناً فاناً پھیل گئی مگر تعجب اس بات پر تھا کہ قدیر کی بجائے سب فیضی کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے شاید اس لئے کہ فیضی عورتوں کے سلسلے میں بہت بدنام تھا۔ خود پاتا دلہن بھی آنے والی بیویوں کو [illegible] رہی تھیں۔

" میری بیٹیاں تو موم ہیں۔ وہ چاہے کسی شکل میں ڈھال لیتا۔ آپ تو جانتی ہیں بہن میری بیٹیاں زور سے بات بھی نہیں کر سکتیں۔"

لیکن اندر مالن بی کے زانو پر لیٹی شہزاد آپا رو رو کے کہے جا رہی تھیں۔

" وہ بڑی ضدی ہے اُس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے میری خاطر اپنے آپکو آگ میں جھونک دیا۔"

" آپ کب تک روئیں گی آپا۔ فیضی تو آدمی ہی بُرا تھا ورنہ کیا قدیر جان بوجھ کر طلاق لیتی۔"

اس ایک برس میں اس گھر پر جتنے حادثے گذرے تھے ان کا اثر سب سے زیادہ مالن بی پر پڑا تھا۔ وہ بجھتی جا رہی تھی۔ کسی بات میں نہ بولتی۔ اب اس نے خوشبوؤں اور میوے والے سالن پکانا بالکل چھوڑ دیئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے اُسے اختلاج شروع ہو جاتا۔ گھر میں کوئی مہمان آتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے کہیں چھپ جاتی تھی باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ایک دن ہم سب لڑکیاں کالج کے لان میں بیٹھی فیضی اور قدیر کا ذکر کر رہے تھے۔

سب لڑکیاں قدیر کی طرفدار تھیں اور فیضی کے سیاہ کارنامے یاد کر رہی تھیں۔

اتنے میں زور زور سے گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میں نشاط نے کلاس روم کی طرف بھاگتے ہیں کہا۔

" اے دیکھو ——— بڑے ہال میں جمع ہو۔ فیضی صاحب کا تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے پھر چھٹی کا اعلان ہوگا۔"

" فیضی کا ———!" ہم سب اچھل پڑے۔

معلوم ہوا کہ کل فیضی بمبئی سے لوٹے اور رات میں انھوں نے شراب میں کوئی زہر ملا کے پی لیا۔

(قدیر کہتی تھی حیدرآباد کی عورتیں بڑی خراب ہوتی ہیں۔ مردوں کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں) میں بھاگم بھاگ قدیر کے ہاں آئی۔ جب توقع دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو تھامے رونے لگیں۔

پھر مالن بی چولھے کے پاس سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آئی۔

" کیا ہوا اسلی بی بی ؟"

" رات فیضی صاحب نے خودکشی کر لی !"

" ایو میری اماں۔ میرے سرکار کی عزت کیسے کیسے لٹ رہی ہے ———" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا اور گر پڑی۔

میں نے اور شہزادی آپا نے دو گھنٹے تک اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور تھک ہار کے اس کے اوپر چادر ڈال دی۔

مالن بی دفن ہوگئی تو میں اپنے گھر آئی۔ وہاں بھی اماں سر پکڑے روتی ملیں۔ سب نے مجھ سے لاکھ چھپایا لیکن یہ بات مجھ سے نہ چھپ سکی کہ میرے منگیتر نے وہاں شادی کر لی ہے۔ اس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ میں کسی بدنام لڑکی شہزادی سے عشق کرتی ہوں۔

جانے اس خبر سے میں کتنا روئی ہوں گی! مجھے کسی بات کا احساس نہ رہا۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ میں جس کے لئے جی رہی تھی وہ کوئی اور نہ تھا شہزادی آپا تھیں۔ اب میں یہ بات کس سے

تی پھرتی کہ آپا کی عاشق میں نہیں قدیر تھی، جو عاشقی کے اصولوں پر پوری اتری۔

اس تو پاشا دلہن اور شہزاد آپا نے گھر سے باہر نکلنے کی قسم کھالی تھی۔ سب نوکروں کو
ی نکال دیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے سپریم کورٹ میں جو مرافعہ دائر کیا تھا اس نے گھر کا
پیہ پیسہ کھینچ لیا تھا۔ پھر رہا سہا سامان پاشا دلہن نے قدیر کو جہیز میں دے دیا۔ اب وہ ہاتھ
ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھی رہتی تھیں۔

" امی بڑے پاشا یہ چاندی کے پاندان کو زنگ لگ رہی ہے اسے بیچ دیں گے"۔ ایک
ن پاشا دلہن نے شہزاد آپا سے کہا۔

" مجھے بھی تو گھر میں پڑے پڑے زنگ لگ رہی ہے امی پاشا۔ آپ پاندان نکو بیچو۔ میں
ئی کام ڈھونڈ دوں گا"۔

لیکن کام خود شہزاد آپا کو ڈھونڈتا ہوا آگیا۔ کالج میں ایک لیکچرر کی جگہ خالی ہوئی اور
انٹرویو کے بغیر انتخاب کر لی گئیں۔

میں نے یہ خبر سنی تو دوڑتی ہوئی آپا کے پاس آئی۔ مگر وہ آج بھی وہی رونی صورت
ئے بیٹھی تھیں۔ اُن کے پاس میں دلپذیر احسان بیٹھی تھیں جو اب ڈاکٹر دلپذیر تھیں۔ وہ
صد مدرسہ اسٹیبلیشمنٹ بن چکی تھیں اور جن باتوں کے لئے حسین گڑھ والوں نے انھیں اچھال
ا تھا وہ اب مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ ان کے جسم کے تیکھے زاویوں کی طرح۔ شاید اسی لئے
م انٹلیکچوئیل خواتین کی طرح وہ بھی ابھی تک کنواری تھیں۔ اپنی جوانی کو ہر طرف سے باندھ
رھ کر رکھتیں۔ خوب میک اپ کرتیں۔ وہی ناقابل یقین بلاؤز پہنتیں۔ سارے شہر کے ادیبوں
دانشوروں سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ میں ڈاکٹر دلپذیر کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ وہ
و سمجھا رہی تھیں۔

" لڑکوں کے کالج میں پڑھانا ہے تو کیا ہوا۔ ! لڑکے تجھے پھاڑ کر تو نہیں کھا جائیں گے۔
ائے پاس کر لیا مگر تیرا مردوں سے خوف نہیں گیا۔ تیرے آگے کتنا شاندار مستقبل ہے
رشپ مل گئی۔ اب کوئی فارن اسکالرشپ بھی مل ہی جائے گا ــــــ"

"پھر — پھر کیا ہوگا —؟" شہزاد آپا نے احمقوں کی طرح دلپذیر کو دیکھا۔

"پھر —!" انھوں نے اپنے کہیں کہیں سے سفید ہونے والے بالوں پر ہاتھ پھیر کے کہا۔

"تو بھئی میں کوئی عالم غیب تو نہیں ہوں کہ آگے کا حال بتاؤں۔"

"لیکن میں ہوں،" شہزاد آپا نے کہا، "مجھے معلوم ہے کہ اب میرے آگے کوئی راستہ نہیں سوائے اپنے آپ کو کھو دینے کے، اس لئے مجھے لیکچرر بننا پسند نہیں ہے۔"

ڈاکٹر دلپذیر چلی گئیں۔ تب بھی شہزاد آپا نے میرا کوئی نوٹس نہیں لیا، بیٹھی دوپٹے کی شکنیں درست کرتی رہیں۔

اتنے میں ان کی امی ہاتھ میں سوپ لئے باورچی خانے سے نکلیں اور وہیں فرش پر بیٹھ کر چاول صاف کرنے لگیں۔

"امی آپ — آپ چاول صاف کر رہی ہیں۔" شہزاد آپا نے تعجب سے ادھر دیکھا۔

"ہو بٹیا مالن بی مر گئی نا —" انھوں نے سوپ وہیں پھینک دیا۔ اور زور زور سے رونے لگیں۔

شہزاد آپا نے کتاب وہیں کرسی پر ڈالی اور جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں۔ وہاں سے الٹے سیدھے کپڑے پہن کر نکلیں اور پاشا دلہن کے پاس جا کر کہا۔

"امی، میں چارج لینے کالج جا رہا ہوں۔"

میں جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ میرے آگے سے جیسے صدیاں گذر گئی ہوں۔ پھر میں نے چونک کر ہونٹوں سے ملنے دانتوں کو چھوا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنی صدیوں کا تماشہ دیکھنے کے باوجود میں بوڑھی نہ ہوئی تھی۔

شہزاد آپا کے ہاں سے آئی تو میں بخار میں جل رہی تھی۔ پھر اس آگ میں بھننے لگی کہ شہزاد آپا مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئیں۔ آخر میں نے ان کے عشق میں دنیا ہار دی تھی!

پہلے تو میرے سر میں درد ہوتا تھا تب بھی وہ دن میں کئی کئی بار اپنی امّی کی آزمودہ دوائیں لیکر آتی تھیں لیکن اب میں بخار اترنے کے بعد بھی کئی دن تک ڈھونگ رچائے پڑی رہی

محلے کے ہر بچے آپی سماری کی ہیبت ناک حسرت بھجوائیں اور آخر ایک دن غصہ کے مارے خود ہی رضائی ٹیلک کرانے کے ہاں پہنچ گئی۔

" آپا ۔۔۔ آپ ۔۔۔ !" مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ شہزاد آپا ہیں وہ توفیشن کا کوئی نیا ماڈل نظر آرہی تھیں۔ چمکتی ہوئی ساری اور کھلے گلے کا بلاؤز پہنے گلے میں موتیوں کی ایک لمبی سی مالا لٹکا رہی تھی اور وہ بڑے اسٹائل کے ساتھ کرسی پر بیٹھی اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں پر پالش کر رہی تھیں۔

" آپ نے اتنے اچھے کپڑے پہنے ہیں تو مجھے کیوں نہ خبر کی۔"

میں ان سے لپٹ گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں نئے سرے سے ان پر عاشق ہوں اور اپنے آپ کو ان پر نثار کرکے بھیک دوں۔

" آپ بیمار تھے نا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دیکھ کر کہیں اور نہ بیمار ہو جاؤ۔"

انھوں نے پھر ردنی صورت بنانے کی کوشش کی۔ مگر آج وہ غضب کی پیاری لگ رہی تھیں۔ ان کی ننگی بانہیں کندن کی طرح چمک رہی تھیں اور کھلا گریبان سے ۔۔۔ پھر اچانک مجھے جانے کیوں یہ وہم ہونے لگا جیسے یہ شہزاد آپا نہ ہوں، پھر انھوں نے تدبیر کا خط اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

" کیا سوچ رہی ہے اے لڑکی! اے تیری گوئیاں کا خط آیا ہے۔"

تدبیر کا خط بے حد ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ صرف امی اور آپا کی خیریت پوچھی تھی اور مجھے پیار بھیجا تھا ۔۔۔ ہاں، خط کے آخر میں دو سطریں اور تھیں۔

" کل یہاں سلامت بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی بیوی اور تین بچوں اور پانچ ملازموں کے ساتھ تفریح کرنے آئے ہوئے ہیں۔ اب وہ اتنے موٹے ہو گئے ہیں کہ میں انھیں یاد بھی نہ رہی تھی۔"

پھر کالج ڈے آیا۔

دیمین کالج کے لان پر ایک طرف لیکچررس، اولڈ گرلز اور معزز مہمانوں
بیٹھی تھیں دوسری طرف رنگ برنگی چڑیوں کی طرح لڑکیاں چہک رہی تھیں۔ اچھ
تھیں سب لڑکیوں کی نگاہیں ان پر تھیں جوان کے آئیڈیل تھے۔ دلوں اور نظ
بسے ہوئے تھے۔

" ارے ہائے آج تو منیزہ آپا نے لپ اسٹک لگائی ہے۔"

" ڈاکٹر سولیپذیر کیسی چہک رہی ہیں۔ ان کی ان ہی اداؤں پر تو ہم جان دیتے
ایک مردنما سوکھی ماری لڑکی اپنے دل پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔

" اری سلمی ذرا ادھر تو دیکھ تیری سویٹ ہارٹ آرہی ہے۔" آمنہ نے مجھے جھنجھ
شہزاد آپا ڈاکٹر سدھیر کے ساتھ آرہی تھیں۔ کھلی بانہوں کے شرخ بلا
ان کی سیاہ چمکیلی ساری کا بلو کھسک کر ان کے پیروں میں الجھ رہا تھا۔ ان کے گہر
لپ اسٹک والے ہونٹ قہقہے لگارہے تھے ــــ اور ــــ اور اُن کے وہ لمبے
سات پردوں میں بہنے والے تاریخی بال کٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑے اسٹا
کٹے ہوئے بالوں کا گھونسلہ سا بنا کر سر پر رکھ لیا تھا۔

میں جانے کیوں آمنہ کو پکڑ کے لڑکھڑانے لگی۔ جیسے آج میرے سارے س
گئے ہوں۔ ڈاکٹر سدھیر کے کسی مذاق پر وہ زور سے ہنسیں تو میں چونک پڑی۔

" اری تجھے سانپ تو نہیں سونگھ گیا۔" مجھے آمنہ جھنجھوڑنے لگی۔

" ہاں مجھے ایک ناگن ڈس گئی ہے۔" میں نے یہ بات آمنہ سے نہ کہی۔ میرے
کھوڑی سراج کی بہن کہہ رہی تھی۔

" ہونہہ ــــ بہت بنتی تھیں یہ بیچاری شہزاد۔ آخر ہم نے انھیں ان
سکھا ہی دیا۔"

آتشِ رفتہ

جمیل ہاشمی



جمیلہ ہاشمی

نیلی دھوڑ

پوس کی لمبی رات بیتی جا رہی ہے کہیں دور کسی گھڑیال نے بارہ بجائے ہیں مگر بلونت کی موٹر کا ہارن نہیں بجا۔ پھاٹک کھلنے کی آواز نہیں آئی۔ جب وہ باہر سے آتا ہے تو موٹر کی بتی اس ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سیدھی میرے پلنگ پر پڑتی ہے۔ جیسے سرد ہوا تیر کی طرح یہاں سے، منہ پر آ کر لگ رہی ہے۔ اس ریشمی رضائی میں کتنی ٹھنڈ لگتی ہے۔ ریشم تو بس بہوؤں، سیٹھوں کے پہننے لائق ہوتا ہے۔ اس کی رضائی میں ساری رات ٹھنڈ سے جسم اکڑتا جاتا رہتا ہے۔ مگر اجیت کہتی ہے — "بس بابو آپ یہی رضائی لیا کریں لوگ کیا کہیں گے کہ کتنے جاہل ہیں یہ لوگ جو کھدر کی رضائی اوڑھتے ہیں!" تو مجھے ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ گھر میرا نہیں بلونت سنگھ کا ہے۔ اور میں اس کے گھر میں رہ کر بہو کا دل میلا نہیں کر سکتا! ویسے بھی نہ جانے اب نیند کیوں نہیں آتی۔ ساری رات یوں ہی بیت جاتی ہے اور نہ جانے وہ زمانہ کیوں بار بار دل میں لوٹ آتا ہے جو اصل میں لوٹ کر نہیں آئے گا کبھی ایک بات اور کبھی دوسری، یادوں کے دیئے سے لمبی اور ٹھنڈی اور اندھیری راتوں میں جل اٹھتے ہیں۔ جب بیتے دن لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں تو پھر بیتی باتیں کیوں دل کو کبھی اتنا سرد کر دیتی ہیں اور کبھی اتنا گرم جیسے وہ جوش رگوں میں واپس آگیا ہو جب ذرا ذرا سی بات پر چھری چل جاتی تھی، اور کرپانیں نکل آتی تھیں۔ پھر بدلتی رتوں کے ساتھ دل کو وہی باتیں کیوں پیاری رہتی ہیں جو کبھی پیاری تھیں۔ نہ جانے کیوں؟ اس ٹوٹے شیشے میں سے پوہ کی رات کے سہانے تارے آنکھیں جھپکاتے نظر آرہے ہیں۔ کیسی سندر رات ہے۔ سپنے جگانے والی۔ پھر میرے سپنے تو بہت دن

ہوئے سو چکے ہیں۔ اب وہ وقت کیوں یاد آتا ہے جب میں نے سپنے دیکھے تھے۔ اصل میں میں نے دادی سے وہ کہانی سننے کے بعد ہی سپنے دیکھنے شروع کئے تھے۔ پوہ کی ایسی ہی رات تھی

حویلی والے پیپل کے پتے ہوا کے زور سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اتوول تھے اور خالی گلیوں میں تیز ہوا کے زور سے سوکھے پتوں کے اڑنے کی آواز ہمیں اپنی کوٹھری میں سنائی دیتی تھی۔ میں اور جیتی دادی کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے اور ڈر کے مارے گھڑی گھڑی اور زور سے دادی کو پکڑ لیتے تھے۔ کوٹھری میں دیا بجھا تھا اور گھور اندھیارے میں ہمیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ دروازے کے باہر یوں لگتا تھا جیسے کوئی رو رو کر بین کر کے منتیں کرتے ہوئے دروازے کھولنے کو کہہ رہا ہو۔ کواڑوں پر ہوا اس زور سے آن کر لگتی تھی اور کواڑ قلابوں پر یوں چرچراتے تھے مانو ابھی کھل جائیں گے۔

میں نے ڈر کر کہا تھا —" دادی دروازہ کون کھول رہا ہے؟"

اور دادی نے کہا تھا: "کوئی نہیں، ابھوں چپ کر کے سو جاؤ، اس طرح پوچھنے سے تو دیو جن آجاتے ہیں، ہے واہ گرو جی کریں سچے بادشاہ، کس زور کی آندھی ہے آج تو راتے کی کی باری پانی لگانے کی ہے۔ بیچارا میرا اکیلا پوت ہے، لوگوں کے تو دو دو چار چار بھائی ہوتے ہیں اس بے چارے کا کوئی ٹونڈی جتنا سہارا دینے والا بھی نہیں۔ میں اوگن ہاری بیچاری اس کی ماں ہوں، میرے پر رحم کر، ہے واہ گرو!"

دوسری کوٹھری میں میری ماں اور گاؤں کی اور لڑکیاں چرخے کاتتی گیت گا رہی تھیں اور تل چاول کھا رہی تھیں۔ سونے سے پہلے ماں نے مجھے اور جیتی کو تل چاول دیئے تھے اور پیار کر کے کہا تھا کہ جاؤ دادی کے ساتھ سو جاؤ۔ میں نے ضد کی تو ماں نے مجھے گڑ کی بنی ہوئی پنیال دیں جن میں چاولوں کا آٹا ہوتا ہے۔ پھر ماں نے دادی سے کہا تھا: "ماں جی آپ آج جیتی کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ سلا لیں۔ آج بہت سردی ہے اور بابے پر شاموں کی ..."

دادی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ میری دادی بہت بدمزاج عورت تھی۔ سارا گاؤں اس سے ڈرتا تھا۔ پچھلی سی کہانیاں اپنے پاس رکھتا اور بلاجے کے اس علاقے میں جہاں دن کو بھی اکیلی عورتیں ایک سے دوسرے گاؤں نہ جا سکتی تھیں، وہ رات کے سمے اکیلی چلی جاتی۔ حویلی گاؤں سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھی اور دور تک پھیلے ہوئے ہمارے کھیت اس سے بھی دور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی اکیلا حویلی سے پرے جب کبھی آدھے دلے کوہ پر گیا ہوں، مجھے چھوٹی نہر کے پاس آموں کے باغ سے بہت ہول آیا ہے وہاں دن کو بھی اگر کوئی ڈاکو چھپ کر بیٹھ جائے تو کسی کو پتہ نہ چلے۔ درخت اتنے گھنے ہیں اور رات کی طرح اندھیرا سا ہر وقت چھایا رہتا ہے جن دنوں آموں پر بور آتا ہے تو اس اندھیرے باغ میں کوئلیں کوہو کوہو بولتی رہتیں۔ میرا دل کوئل کی بولی سن کر نہ جانے کیوں ڈول جاتا ہے۔ جیسے ناؤ پانی پر ہچکولے کھانے لگے۔ پھر گاؤں کے لڑکے بالے باغ کے رکھوالے باغ میں کھیلنے اور حفاظت کرنے کے لئے وہاں آتے ہیں اور دو دن رونق سی رہتی ہے۔ رونق کی طرح وہ خوشبو جو گاؤں میں باغ پر کھیتوں میں ہر جگہ اڑتی ہے، اناج اور آموں کی خوشبو مل شراب کا سا نشہ پیدا کرتی ہے یہاں شہر میں پھولوں کی خوشبو ہے بلونت کی کوٹھی میں اتنے پھول ہیں ہرے، نیلے، پیلے، لال، گلابی، اور یوں پھیلے ہوئے ہیں جیسے میتا کے میلہ میں ہنستی کھلکھلاتی مٹیاریں۔

دادی بدمزاج تھی تو کیا، ہمیں بہت چاہتی تھی۔ میں تو اس کا بہت لاڈلا تھا ماں کہا کرتی تھی یہ تو دادی کے لاڈ سے بگڑا ہوا ہے اور پھر دادی ماں سے کہتی ـــــ "گڈیئے تو تو ایسے ہی بچے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس عمر میں سارے ہی بچے ضد کرتے ہیں۔ ایسی ایسی ضدیں کہ واہ گرو یاد آجاتا ہے۔ یہ تو اتنا بھولا بچہ ہے اگر تجھ سے کچھ کھانے کی یا گڑ مانگنے کی ضد کرے تو کیوں اتنا تھوڑا دل ہے تیرا، ماؤں کا دل تو دریا ہونا چاہیئے۔"

میں ضدیں بھی تو انوکھی کیا کرتا تھا، ماں چکی پیس رہی ہے، اسے روٹی ٹکر کھیتوں پر جانا ہے اور میں پاس بیٹھا کہہ رہا ہوں ـــ "میں چکی میں دانے ڈالوں گا۔"

اگر دودھ بلو رہی ہے تو میں کہتا ـــ "اٹھ ماں پیڑھی پر بیٹھنے دے۔"

کبھی کبھار وہ ایک آدھا چانٹا بھی جڑ دیتی۔ میں روتا ہوا دادی کے پاس جاتا، پھر دادی ماں پر اندر جاتی، ٹکور گرم کرتی یا پاس بیٹھی ماں کو گالیاں دیتی رہتی اور بولے جاتی۔ مگر میں نے اس سے یہ ضد نہیں کی تھی کہ میں بیلنے میں کپاس دوں گا۔ مجھے انجانے میں ہی اس سے خوف آتا تھا جتنا وہ مجھے پیار کرتی اتنا ہی میں اس سے زیادہ ڈرتا تھا۔

جینتی سے اسے ذرا بھی پیار نہ تھا۔

اس پوہ کی رات جب میں ڈر کر دادی سے فرمائش کرنے لگا تو دوسری طرف جینتی بھی دادی کے پیچھے پڑ گئی مگر دادی نے اسے کہا ــ "چل لڑکی چپ کر کے سو جا۔ دیکھ باہر کس زور کی ہوا چل رہی ہے اور تجھے کہانی کی پڑی ہے۔"

اور میں دل ہی دل میں حیران بھی تھا اور خوش بھی، کہ دادی نے جینتی کو تو جھڑکا ہے اور مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بچپن کے ان دنوں میں دل کیسی کیسی باتوں سے خوش ہوتا اور پر کی طرح ہلکا ہو کر ہوا کے ساتھ اڑتا معلوم دیتا ہے۔ ان دنوں دکھ اور سکھ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ کئی دوپہروں میں ننگے پاؤں کھیتوں چلنے کے بعد بھی پاؤں میں جلنے اور درد سے انگارے کا انگلی سے لگ جانا رونے دھونے اور ضد کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بھولے بھولے کون سی طاقتیں ہوتی ہیں جو انسان کو لوہے کی طرح سخت اور مضبوط کر دیتی ہیں۔ پھر بڑے بڑے دکھ برداشت کرنے کی طاقت نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے۔ پر دادی سے سنی ہوئی پوہ کی راتوں میں اندھیرے اجالے کی کہانیاں ساری زندگی یوں پھیل جاتی ہیں جیسے بڑ کی داڑھیاں اپنے گرد کی زمین پر دبے پاؤں قبضہ کر لیتی ہیں۔

میں نے دادی سے ضد کرنی شروع کی۔ دوسری کوٹھری سے گانے کی آواز آرہی تھی اور حیرت کی گھوں گھوں میں گھلے ہوئے گیت جو کبھی کبھی ہواؤں پر یونہی میرے آس پاس اڑتے ہوئے آجاتے ہیں اور پھر میں آنکھیں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ وہ کوٹھری کہاں ہے، وہ گاؤں کدھر ہے، وہ پرانی زندگی گیت کا بول تھا جو مجھے اس کوٹھری میں سنائی نہیں دیتا اور تیز ہوا کے گیت

کبھی دور ہو جاتا ہے اور کبھی مدھم مدھم کان میں پڑتا ہے جیسے رہٹ کی رُوں رُوں۔

اس رات دادی بہت چپ سی تھی! جیسے اداس ہو۔ اس دن اس نے ماں کو بہت گالیاں دی تھیں کہ ماں ہمسایوں کے گھر جا کر رو پڑی تھی اور دادی نے جب سنا تھا تو جا کر اسے چوٹی سے گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر لے آئی تھی۔ ماں ہولے ہولے رو رہی تھی اور آنسو پونچھ رہی تھی۔ اندر باہر پھرتی کام کر رہی تھی۔ پھر اس نے روٹی پکا کر لسّی کا مٹکا اٹھایا تھا اور سر پر رکھ کر حویلی سے باہر چلی گئی تھی۔ دادی نے جاتے جاتے اسے کہا تھا ــــ "کڑیئے جلدی واپس آ جانا مجھے ذرا کانیاں جانا ہے میں نے سنا ہے چانن سنگھ بیمار ہے۔"

اور میری ماں نے یوں جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو، کہا تھا ــــ "کیوں ماں کیا بات ہے ماما کب سے بیمار ہے تو نے تو ہمیں بتایا نہیں اتّے کو بھی ساتھ لے جا۔"

دادی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا ــــ "اتّے کو تو اکیلے اتنے کام کرنے ہیں۔ اپنے ویر کو میں اکیلی ہی دیکھ آؤں گی۔ بس تو ذرا جلدی واپس آ جا۔ اور دیکھ یہ کپاس پڑی ہے۔ اس کو اندر کوٹھی میں رکھ دے، میں آ کر خود ہی میل لوں گی۔"

اتم سنگھ میرے باپ کا نام تھا۔

گہرے کالے بادل بوجوں کی طرح چڑھتے آتے تھے ہوا بہت زوروں سے چل رہی تھی اور درخت جھک جھک جاتے تھے جب دادی گھر واپس آئی اس نے ہاتھ میں جوتی پکڑ رکھی تھی اور ننگے پاؤں پر گرد جمی ہوئی تھی جس کو جھاڑ کر اس نے کہا ــــ "کڑیئے کوٹھے پر سے اپلے تو اتار لا۔ لا مجھے ٹوکری دے۔ نہ جانے جھڑی کتنے دنوں کی ہو۔ گیلی لکڑیوں سے نہ چولہا جلتا ہے اور نہ ہی تنور۔"

ماں نے پوچھا ــــ "کیا حال تھا؟"

"اچھا تھا۔" دادی نے مختصر جواب دیا اور پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی ــــ "حکیم جی بھی یہاں نہیں ہیں۔ اتّے کو اتنے کام نہ ہوتے تو اسے وڈن کھیڑے بھیجتی۔ مگر وہ اکیلا ہے اتنے کام تو پورے نہیں کر سکتا۔"

اور میری ماں نے کہا ــــ "آخر ساری دنیا ہی اکیلی ہوتی ہے سارے کام ہی کرنے ہوتے ہیں۔ تونے اپنے کے اکیلے ہونے کو کہانی بنا لیا ہے۔ پڑوس میں جیت سنگھ اکیلا ہے تیرا اپنا بھائی جان سنگھ اکیلا ہے۔ میرا باپ اکیلا تھا۔ گاؤں میں کتنے لوگ ہیں جو ایسے ہی بونے گاہنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ وید حکیموں کے پاس جاتے ہیں۔ رشتہ داروں کی خیر خبر بھی رکھتے ہیں۔ تونے کیا اسے ہتھیلی کا پھوڑا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اگر ماسے کی بیماری پر وہ ذرا ڈرن کھیڑے سے ویدجی کا پتہ کر آئے تو کیا ہو جائے گا؟"

اور دادی نے کہا ــــ "چپ کر کڑیئے، واہ گرو بھلا کرے تو تو چپ ہی نہیں کرتی۔ ہونا کیا ہے؟ میرے پوت کو کیوں کہہ ہو۔ میں جو ہوں جا کر سویرے ویدجی کا پتہ کر آؤنگی آپ ہی۔ تو کیوں بولتی ہے ڈرن کھیڑے کون سا سو کوس ہے۔"

ماں نے کہا ــــ "پر تو ماسے کو بیمار چھوڑ کر کیوں آگئی تھی۔ گھر کو کوئی سر پر تو نہ اٹھائے لیجاتا۔ دیکھ تو سہی کتنے کالے بادل آئے ہیں۔ اب اگر جھڑی لگ گئی تو سویرے تو کس طرح ڈرن کھیڑے جائے گی۔ میں اسے کو کہوں گی وہ روٹی کھانے تو گھر آئے گا نا۔"

دادی نے جیسے زندگی میں پہلی بار ہتھیار ڈالے ہوں۔ چپ ہو رہی اور جب بابو روٹی کھانے گھر آیا تو اس نے یہ سن کر کہ ماما بیمار ہے اسی وقت گھوڑے کو باہر نکال لیا، مگر ہوا بہت تیز تھی اور دادی نے بڑی سختی سے کہا ــــ "اتم سنگھ! سو کا تو دماغ چل گیا ہے۔ بھلا یہ کوئی ذنب ہے ڈرن کھیڑے جانے کا۔ ایسے میں تو میں تجھے کبھی نہیں جانے دونگی چاہے کچھ ہو۔ رات کو تجھے کھیتوں کو پانی بھی لگانا ہے نہ بھاڑ میں سویرے آپ ہی چلی جاؤں گی۔ ویر میرا بیمار ہے اور پھر راہ اس قدر خراب ہے۔ سپاہی وندڑ کے پاس سے تو رات کے وقت مدیں ہو گیا میں بہیں گندی، نہ بھاڑ میں نے تجھے نہیں جانے دینا۔"

بابو نے بھی ضد نہ کی۔ وہ گھوڑے کو حویلی لے گیا اور درختوں کے پتے اس کے پیچھے گلیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔

ہوہ کی اس رات میں نے دادی سے کہانی سنانے کی ضد کی تو اس نے ٹھنڈی سانس

بھر کر کہا ــــ" کاکا کہانیاں تو مجھے بہت یاد ہیں پر ساری کہانیاں آپس میں مل گئی ہیں گڑبڑا گئی ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کون کہانی کس جگہ سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہو گئی۔ سوت کی انٹی میں پڑی گرہوں کی طرح ساری کہانیوں کے تاگے ایک دوسرے سے الجھ گئے ہیں"۔

اور جنتی نے بھولے پن سے کہا ــــ" دادی تیرا لیٹرن مجھے پتہ ہے کہاں پڑا ہے میں اندھیرے میں بھی ٹٹول کر اسے لا سکتی ہوں۔ کیوں دادی میں تجھے لیٹرن لادوں"۔

دادی نے بہت ہولے سے ٹھنڈی سانس بھری یا۔ میرا وہم ہے۔ ان دنوں ٹھنڈی سانسوں کا کیا پتہ تھا۔ پوہ کی راتوں میں دادی اور ماں کے ساتھ چمٹ کر سوتے تو سردی کا بھی پتہ نہیں چلتا تھا مگر وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس نے جنتی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر میں نے کہا ــــ" دادی کہانی سنا نہیں تو میں نے تیرے ساتھ نہیں بولنا۔"

جنتی نے کہا ــــ" دادی کہانی سنا، نہیں تو میں نے تیرے ساتھ نہیں بولنا۔ دادی وہ بادشاہ کی بات تو تجھے یاد ہوگی نا جس کے سات بیٹے تھے اور جو پھول شہزادی کی تلاش میں گئے تھے اور پتھر ہو گئے تھے۔"

دادی نے ہولے ہولے کہا ــــ" آج میں ایک سچی کہانی سناتی ہوں۔ پر کہانی بڑی لمبی ہے۔ بہت ہی لمبی، اگر تم سو گئے تو پھر میں کبھی نہیں سناؤں گی۔ کبھی نہیں۔"

اس نے رضائی ہمارے گرد لپیٹ دی۔ آج رضائی اپنے گرد لپیٹتا ہوں تو بھی ٹھنڈ نہیں رکتی۔ سامنے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے جو ستارے دکھائی دیتے ہیں وہ پھیکے لگتے ہیں۔ آسمان کی نیلاہٹ میں ایک پیلاہٹ ہے۔ چاند نکلا ہوگا۔ کہتے ہیں سردیوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی یونہی بیت جاتی ہے۔ جب پوہ کی ٹھنڈی راتوں میں ہم پانی لگاتے تھے تو خون آپ سے آپ گرم ہو جاتا تھا۔ اور بہتے پانی کے ساتھ دل کس طرح سے ناچتا تھا۔ پھر میں اور روپو درختوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ مجھے آسمان کی نیلاہٹ میں سے اترا ہوا چاند کا ایک ٹکڑا لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ رات

لی سی کالی ہتیں اور اس کے بدن سے ویسی ہی خوشبو ہوتی تھی جیسے اناج کے کھیت اور آموں کے بور سے نکلتی ہے۔ ننگے پاؤں صرف ایک کرتا پہنے اور سر پر کھدر کی موٹی سرخ رنگ کی چنری اوڑھے نہ جانے وہ اتنی دور سے آیا کرتی تھی۔ وہ لمبی تاریک اور سرد راتوں میں اسے کھیتوں کی طرف آتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ پر میں بھی کیسی کیسی باتیں سوچنے لگا ہوں۔ اگر اس رات مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کہانیاں نہ کسی اور کی ہیں نہ کہیں سے آئی ہیں۔ کسی سہرائے اور اور راجے مہاراجے کسی سوئمبر کی نہیں ہماری اپنی ہیں جو ہمارے خون میں پلتی بڑھتی ہیں اور پھر آکاس بیل کی طرح ہمارے ہی جسموں کی گرمی سے ہری بھری رہتی ہیں تو میں دادی سے بہت کچھ پوچھتا۔ مگر دادی تو بس کہانی سنا رہی تھی اور ہم بچے تھے جو اس کی بات سنے بنا سو گئے تھے۔ اس رات یوں لگتا تھا جیسے ساری رات میں کہانی سنتا رہا تھا۔

دادی نے اور راتوں کی طرح اس رات کہانی یوں نہیں شروع کی تھی — "تمہارا ہمارا خدا بادشاہ، کسی دور کے دیس کی بات ہے وہاں ایک راجہ تھا جس کی سات رانیاں تھیں۔ ساتوں کے مکھ جیسے چندرما ہو۔ پر ساتویں سب سے چھوٹی رانی بڑی ہی سندر تھی بڑی چنچل ہوا کی طرح اسے چین نہ تھا۔ سارے راج بھون میں کانتی پھرتی جیسے چڑیا ہو۔"

چھوٹی رانی کہانیوں میں سدا سب سے سندر ہوتی ہے اور پیاری، راجہ کو سب سے اچھی لگنے والی اور اس لئے راجہ اس کی بات بہت مانتا ہے۔

دادی نے جو کہانی سنائی اس میں کوئی راجہ نہ تھا، کوئی رانی نہ تھی پر انوپ سنگھ کو بھاگو بہت اچھی لگتی تھی اور پھر بھی وہ اس کی کچھ نہ تھی۔ رانی ہونا بڑی بات ہے وہ ہمارے کھیتوں گھروں میں کام کرنے والی کمہاری تھی مجھے آج بھی یاد ہے دادی نے اس کے کمہاری ہونے پر زور دیا تھا۔ اس رات کھدر کی سرخ رنگ کے چھاپ سے ڈھکی رضائی میں دادی کے ساتھ لیٹا میں سوچ رہا تھا انوپ سنگھ بھی کمہار ہے اور اس کی چندھی آنکھوں والی بیوی سنتو تو ذرا بھی اچھی [illegible] جب آنکھوں سے سارا وقت پانی بہتا ہے اگر بھاگو اس طرح کی ہوتی تو انوپ سنگھ کو کیا اچھی لگی ہوگی۔ وہ دن بیت گئے بہت پیچھے رہ گئے۔ آج مجھے معلوم ہے

کہ اچھا لگنے کے لیے آنکھوں کی سیاہی، ورہ ریوں کی چال کچھ نہیں کرنی جو عورت اچھی لگنے لگی اس میں یہ ساری باتیں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔

" انوپ سنگھ کی ایک عورت تھی جس کے ساتھ گرنتھ کے سامنے اس کا بیاہ ہوا تھا پر وہ سارا وقت اس سے کھنچے رہتا۔ نہ بولتا اور نہ اچھا سلوک کرتا۔ گھر آتا تو یوں ہی بات بے بات اسے مارتا رہتا۔ اس کے اچھے گہنے کپڑے تک اس سے چھین کر لے گیا اور پوچھنے پر کہنے لگا۔

"میں نے کسی کا قرض دینا تھا، بیچ دیئے ہیں۔"

عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ ہر دکھ چپ چاپ سہہ لیتی ہے پر یہ نہیں سہہ سکتی کہ اس کا مرد کسی دوسری عورت سے اچھا سلوک کرے اور اس کے گہنے لے جا کر اسے دیا کرے۔"

جنتی نے جب آدھی سوئی ہوئی آواز میں کہا تھا "کیوں دادی جو انوپ سنگھ کو اچھی لگتی تھی اسے ہی تو وہ کپڑے لے جا کر دیتا تھا، اگر وہ اس طرح نہ کرتا تو کیسے پتہ چلتا کہ وہ اسے اچھی لگتی بھی ہے یا نہیں۔"

دادی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

" انوپ سنگھ نے اب گھر سے بھی باہر رہنا شروع کر دیا۔ سارے گاؤں میں بھاگو اور انوپ کی باتیں ہوتیں۔ پر وہ بڑا اکھڑ تھا۔ کسی کی نہ سنتا اور نہ کسی کی پرواہ کرتا۔"

میں نے پوچھا "کیوں دادی انوپ سنگھ کوئی راجہ تھا جو کسی کی بات نہیں مانتا تھا؟"

دادی نے کہا "نہیں راجہ تو نہیں تھا پر پھر بھی کسی کی نہ سنتا اور نہ ہی بھاگو سے باز آتا۔ ہر رات وہ دونوں کہیں نہ کہیں ضرور ملتے۔ کبھی کھیتوں میں کبھی باجرے میں۔ کبھی مندر کے پچھواڑے۔ انوپ تو آدمی تھا مگر بھاگو کو ذرا شرم نہ آتی تھی۔"

" کیوں دادی کسی آدمی سے ملنا بری بات ہوتی ہے؟" جنتی نے ہولے سے پوچھا۔

"... ہولے ہولے رتیں بدلتی گئیں، سال بیتتے رہے اور انوپ سنگھ کا لڑکا بڑا ہوا۔"

مجھے نیند آنے لگی تھی۔ جنتی تو آدھی سو چکی تھی۔ دادی یہ پہر دامنگئی بنا کہہ ہونگا سے

نہیں بھرتے، مسلسل کہتی جارہی تھی۔ اس کی آواز کبھی تو چرخے کی گھوں گھوں میں کھو جاتی۔ کبھی ماں اور اس کی سہیلیوں کے گیتوں میں اور کبھی دروازے کے باہر شور مچاتی ہوا اور دروازے کی چرچراہٹ میں۔ اور جب بھی اس کی آواز ان ساری آوازوں سے اونچی ہوتی تو مجھے سمجھ نہ آتی کہ کہانی کس کی ہے۔ میں نے نیند میں سا جیسے خواب لے رہا ہوں۔ دادی کہہ رہی تھی "اور پھر گھوڑی پر سوار ہو کر اوپ سنگھ کا بیٹا دونوں کے پیچھے پیچھے گیا۔ گھوڑی بڑی جوان تھی اور اُس جیسا جوان ہی اس پر چڑھ سکتا تھا وہ کسی اور کو سوائے اوپ سنگھ کے .. پاس بھی پھٹکنے نہ دیتی تھی۔" میں ایک اور سپنا دیکھ رہا تھا۔ چاند سے بھی زیادہ خوبصورت ایک دلہن ہے جس کی آنکھیں گھونگھٹ کے پیچھے ستاروں کی طرح دمک رہی ہیں اور اس کی سرخ چنری میں کچھ دھبے لگے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا — "یہ کیسے دھبے ہیں ؟"

یکایک اس کا گھونگھٹ خود بخود ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے زور سے چیخ ماری۔ آنکھ کھلی ہے تو دادی مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہہ رہی تھی۔ —— "کیوں میرے لال کیا ڈر گیا ہے۔ کیوں میرے لال کیا بات ہے کیا تو نے ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے۔ کیسا سپنا تھا مجھے تو بتا۔ بی چنتی ذرا پرے ہٹ۔" وہ سوئی ہوئی چنتی کو ڈھکیل رہی تھی۔ "جگہ تنگ ہے نا۔ دل پہ بوجھ پڑ گیا ہوگا۔ کاکا دیکھ ہاتھ سینے پر نہ رکھ۔"

مگر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اُبلی ہوئی آنکھیں جو گھونگھٹ کے پیچھے پوہ کی رات میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ ساری رات دادی سو نہ سکی۔ میں گھڑی گھڑی چونک پڑتا اور ڈر جاتا۔ درختوں کی سائیں سائیں میں اُلوؤں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور بند دروازوں میں سے نہ جانے کس طرح ہوا تیر کی طرح میرے جسم پر لگتی تھی۔ پھر بھی اس میں ایسی سختی نہ تھی جیسی اس ہوا میں ہے جو ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سیدھی میرے منہ پر آ کر لگتی ہے۔

اور اس رات کے بعد میں نے سپنے دیکھنے شروع کر دیئے۔ سپنے کوئی دیکھ کر تھوڑی آتے ہیں۔ اچھے ہوں یا بُرے نہ تو سہانی راتوں کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ انسانوں کا۔ سپنے بڑے

ظالم ہوتے ہیں۔ دیپو کے خاوند سے بھی زیادہ ظالم۔ جس نے اسے سہاگ رات ہی میں مار دیا تھا
اگر دیپو کی یاد صرف اتنی ہی ہو کہ پریوں کی کہانی کی طرح وہ تھی وہ بیاہی گئی اور وہ مر گئی۔ تو
بات سننے کو کچھ بھی نہ بچے۔ میں جو ساری عمر ہر عورت کے چہرے کی طرف یوں دیکھتا رہا ہوں کہ اس
کی ایک ادا کی جھلک کہیں پا سکوں، یوں عمر نہ گنواتا۔ پر یہ تو ہونی کی بات ہے۔ جس کے نصیب
میں جو ہونا ہوتا ہے وہ کر رہتا ہے۔ انسان کے رستے کے آنے والے حالات تو گھٹتے ہیں اور نہ ہی
رُخ بدلتے ہیں۔ حالات تو سیلاب کا پانی ہے جدھر چاہے نکل جائے کوئی وقت اور جگہ کی تو
قید نہیں نا۔ کبھی کبھار میں نے چاہا ہے نہیں میں نے صرف سوچا ہے کیونکہ چاہنے سے کیا ہوا
کرتا ہے کہ اس شکتی سے جو نصیب بناتی ہے پوچھوں دیپو کو بنانے اور پھر اسے مٹی کی مورت
کی طرح مٹا دینے میں کیا راز ہے؟ اکثر سوچتا ہوں وہ تو تھی ہی نہیں وہ کوئی بھی نہ تھی۔ یہ
میرے اپنے سوچنے کی ہی بات ہے۔ انسان کو واہ گورو نے مہا شکتی بنایا ہے ایسا گرنتھ صاحب
میں بھی لکھا ہے اور چوپال میں بڑے بوڑھے بھی یہی کہتے تھے۔ گرنتھی گیر سنگھ بھی پاٹھ کے سمے
سدا کر یہی کہا کرتے تھے کہ انسان بہت بڑا بنایا گیا ہے۔ پھر دیپو کون تھی وہ کیا تھی اور
میں کیا ہوں۔ کہ ہم نہ مہا شکتی ہیں اور نہ بڑے۔ اب تو مجھے پورا وشواس ہے کہ ہم ان کیڑوں سے
بھی کم ہیں جو اپنی مرضی سے رینگ کر برکھا کے دنوں میں اپنے سوراخ میں گھس جاتے ہیں۔
پہلے پہل میں بحث کیا کرتا تھا۔ اب تو میں پھر بھی کہتا ہوں نہ گرنتھ صاحب پر یقین ہے اور نہ کسی
اور ستے پر۔ گرنتھی جو کچھ کہے وہ جھوٹ ہے جو گرنتھوں میں لکھا ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ سب
کچھ جھوٹ ہے۔ یہ سارا سنسار ہی کچھ نہیں۔ موتا سنگھ خود تو کبھی پاٹھ نہیں کرتا۔ پر اپنے گھر
میں اس نے میرے لئے ایک پوجا گھر بنا رکھا ہے جہاں روز سویرے گرنتھ صاحب پر پھول
چڑھتے ہیں۔ اسے کیا پتہ ہے کہ میں گرنتھ پر یقین رکھتا ہوں اور نہ گوردوں پر۔ وہ بھی ہماری
طرح بیچارے کمزور آدمی تھے جو دنیا کا نام جپتے اور اندھیرے میں راہ ٹٹولتے سرگباش ہو گئے
ساری چیزوں سے میرا وشواس اٹھ گیا۔ پر دیپو جی اس پر مجھے پکا وشواس ہے اگر وہ نہ ہوتی تو
پھر آج دل میں یہ جلن سی نہ ہوتی۔ یہ ساری عمر میلے ایک ایک عورت کے چہرے کو کیوں غور سے

دیکھا ہے کہ شاید کسی کی آنکھوں میں اس کی آنکھوں جیسی سیاہی ہو۔ کسی کے ہونٹوں پر ویسی مسکان ہو، کوئی بات کہتے ہوئے دیپو کی طرح تھوڑا تھوڑا مسکراتی ہو، کسی کے چہرے پر ویسا ہی سنہرا پن ہو اور ویسی ہی نرمی ہو جیسے چندا اور سورج کی روشنیاں دور دور سے ایک دوسرے کے گلے مل رہی ہوں، کسی کی چوٹی ویسی ہی چھوٹی ہو۔ کسی کا قد ویسا ہی لمبا ہو جو لمبا تو نہ لگے مگر میرے کندھوں تک پہونچتا ہو۔ اور جس سے بات کرتے ہوئے میرا دل یوں پھیلے مانو سینے کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ پوہ کی راتوں میں صرف یہ احساس کہ وہ میری طرف دیکھ لیتی ہے تیر کی طرح ہڈیوں کے اندر گھسنے والی سرد ہوائیں بھی گرم رکھتا ہے۔ اور دوست یا طعنے دیں کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے یہ بے پئے مست کیوں رہتا ہے۔

دیپو میری نہیں اس پر بھی مجھے پکا یقین ہے اس کے اور میرے درمیان ایک اوٹ سی ہو گئی ہے جو کھیتوں کے رستوں اور اونٹوں کے گلے میں بڑی گھنٹیوں نے کھڑی کی ہے جو جھنکاری ہوئی جوان چھوریوں نے رہٹ پہ ہے یا دن مار مار کر اور دیپ جلا کر ہلکی ہلکی گرد اڑا کر بنائی ہے جو گانے والوں نے اپنے سروں میں سر ملا کر کبھی ختم نہ ہونے والے راگوں سے اونچی کی ہے اتنی اونچی کہ اب آکاش بھی میری نظروں سے چھپ گیا ہے تارے بھی اور تارے جیسی آنکھیں بھی۔ ان راگوں میں چرخوں کی گھوں گھوں بھی ہے، پتوں کی ہلکی سرسراہٹ بھی ہے ماروں کی دیواروں پر پڑے اور پرماتوں کی رکھوالی میں مسلسل چلنے کی سٹر سٹر ہے۔ اور پہنے کنواریوں کی ہنسی بھی اس میں شامل ہے۔ پنگھٹ پر گاگریں۔ کھنے گھڑے اٹھانے سے لے کر مست کر دوں دوں، دودھ دوہنے اور دودھ بلونے ساری تانیں ہیں۔ تاروں کی چھاؤں تلے ہل چلانے اور میدوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹناہٹ تو اس کا اہم سبب ہے۔ کیا راگ کی دیواریں میرے اور اس کے درمیان سدا رہیں گی۔ میں یہ راگ سنتا ہوں پر دیپو کو بھولا ہیں۔ راگ کی دیوار کے دوسری طرف لاجونتی کی طرح سکڑی ہوئی وہ بنی ڈولی میں بیٹھی ہوگی۔ پر وہ تو رتھ میں چڑھ آئی تھی اور نارنگوری بیلوں نے اس رتھ کو کھینچا تھا اس سدا سہاگ رات میں بیتا رہا تھا اور مدہوش رہا تھا۔ میری نیندیں بہت سے رچ گئیں۔

میں اونچی اونچی لے میں ماہیا گاتا اپنے کھیتوں کے کنارے گھومتا رہا تھا۔ پھر سنا تھا بارات دیپو کو لے کر چلی بھی گئی۔ میری ماں کہہ رہی تھی — "واہ واہ بھئی ایسا بیاہ تو کبھی نہ دیکھا اور نہ سنا۔ چلے چلے بھئی۔ دھن سنگھ نے اپنی بیٹی کو کتنی دولت دی ہے اور گاؤں میں یوں سناٹا تھا جیسے گاؤں نہیں شمشان ہو۔"

چوپال میں اس دن بڑی بھیڑ تھی۔ سارا گاؤں ہی جمع تھا۔ میرے باپو کو اپنے باپ سرفا اوپ سنگھ اور بھاگو کو مار کر سر تن سے پھینک دینے اور پھر بڑے شہر کی عدالت میں جا کر اپنا قصور مان لینے کے الزام میں پھانسی کی سزا بول گئی تھی۔ سیشن جج نے موقعہ کا کوئی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے باپو کو معاف کر دیا۔ مگر ہمارے دشمنوں نے ہائیکورٹ کے سامنے سر مار دیا۔ بڑے شہر دور تھے بھاگ گئی۔ تب کو یونہی سہارا بنا کر ہم سے بدلہ لینے کی سوچ لی تھی۔ مجھے ان دنوں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ پھانسی کیا ہوتی ہے، عدالت کیا ہے، جج کیا ہے؟ اپنی بھینسوں گایوں کے پیچھے ننگے پاؤں جاتا اور انھیں چرنے کے لئے چھوڑ کر خود اپنے دوستوں اور ساتھ کے لڑکوں میں مل کر گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا۔ ایک دن کسی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی تو دیپو نے کہا — "چل چل تو ہمارے ساتھ نہ کھیل کر۔ تیرے باپ کو تو سزا ہو گئی ہے!"

پھر دوسرے لڑکے بھی دیپو کے ساتھ مل گئے اور سب مجھے چھیڑنے لگے۔ میں دوپہر کو روتا روتا بھینسوں کو ہانکتا اور کرتے سے اپنے آنسو پونچھتا گھر آ گیا۔ ماں بڑی اداس تھی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی چرخہ کات رہی تھی، دادی کپاس دب رہی تھی۔ بے وقت گلی میں ٹن ٹن کی آواز سن کر کئی عورتوں نے اپنے دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر دادی اٹھ کر آئی اور بولی — "کیوں کاکا دوپہر کے وقت ہی کیوں مال کو گھر لے آیا ہے۔ بھینسیں اس طرح گندی ہیں انھیں نہلایا بھی نہیں اور . . . "

پھر اس نے میری شکل کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئی۔ بھینسوں کو باندھ کر وہ میری طرف مڑی اور بولی — "کیوں کاکا کسی سے لڑائی ہو گئی کیا؟"

میرے آنسو راستے میں ہی خشک ہو گئے تھے مگر میں سوچ رہا تھا کئی مہینوں سے میں نے

باپو کو گھر میں نہیں دیکھا۔ آخر کوئی تو بات ہوگی ہی نا۔ دادی سے میں نے پوچھا ــــ" اسے کو تو نے کہاں بھیج دیا ہے۔ لڑکے کہتے ہیں اس نے اپنے باپ کو مار دیا تھا اور اسے سزا ہو گئی ہے اور وہ کہاں ہے۔ سزا کیا ہوتی ہے۔ میں اسے کو ساتھ لے جا کر لڑکوں کا خون پی جاؤں گا۔ لا مجھے اپنی کرپان دے ؟"

دادی دھوپ میں کھڑی تھی۔ آنکھیں ہیں گڑی ہوئی مورتی لگتی تھی۔ وہ نہ ہلتی تھی اور نہ ہی میری بات کا جواب دیتی تھی۔ اس کے سر پہ دوپٹہ نہ تھا اور سفید بال چمک رہے تھے جیسے ریشم کے لچھے ہوں۔ ماں چرخہ چھوڑ کر آ گئی اور میرے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ ایک لمحے میں میں بچپن سے بڑھاپے تک کا سارا راستہ پار کر گیا۔ دادی کی مورتی اور ماں کا ہوئے ہوئے رونا دونوں باتیں میری سمجھ سے باہر ہونے کے باوجود ایسی نقش جیسے میں بھلا سکتا۔ دونوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا پر مجھے معلوم ہو گیا کہ لڑکوں کا کوئی قصور نہیں۔ دیسو نے سچ کہا ہے۔ اسے نے اپنے باپ اور بھاگو کو مار دیا ہے اور بہت سالوں پہلے سنی ہوئی کہانی میرے ذہن میں جھٹکوں سے آگے بڑھنے لگی۔ مجھے وہ سیاہ رات یاد آ گئی۔ اس رات دادی کی اداسی یاد آ گئی جیتی مجھ سے ایک سال ہی بڑی تھی۔ بے ست الٹھ باہر سے کھیلتی ہوئی آئی۔ ایک ہاتھ میں اپنی گڑیا کی چوٹی تھی اور دوسرے میں اس کے کپڑے۔ ہمیں روتا دیکھ کر وہ بھی یونہی زور زور سے چیخنے اور رونے لگی اور ماں مجھے چھوڑ کر اسے بازو سے پکڑے گھسیٹتی ہوئی اندر کوٹھڑی میں لے گئی۔ خالی ناندیں بھینسیں یوں ہی منہ مارتیں اور پھر اندر کی طرف تکنے لگتیں۔ گوبر اور اُپلوں کی بو کی سڑاند بادل کی لو میں ملی ہوئی تھی اور آسمان پر کوئی چیل زور زور سے کیں کیں کرتی اور جا کر بوڑھے پیپل پر بیٹھ جاتی۔ پتوں کے سرسرانے کی آواز آتی پھر کوے کائیں کائیں کرتے زرد آسمان کے نیچے پر پھیلائے ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتے۔ سارا گاؤں بے حد چپ تھا، موت کی طرح اداس اور خاموش۔ پھر دادی اندر آ گئی اور بولی ــــ" دیکھ دلدار سنگھ اس بات کا بدلہ تجھے لینا ہوگا اسے نے اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لیا اور تجھے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا ہوگا۔ یہ اسی طرح سے ہوتا آیا ہے۔ نہ کوئی بے گناہ ہوتا ہے اور نہ

کوئی گناہگار۔ یہ ماجھا ہے اور یہاں سرداروں کے خاندانوں میں پشتوں سے یہ دستور ہے۔ جس کی آن ہے، اس کا سب کچھ ہے۔ اتنے نے باپ کو مار کر کوئی قصور نہیں کیا تھا اور نہ ہی تو کوئی قصور کرے گا۔ یہ پاپ نہیں۔"

دادی کی شکل اب اس گھڑی بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ پر یوں نہیں جیسے وہ ماں کو گالیاں دیتے سمے اپنی شکل پر لے آتی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہر لفظ اس کے منہ سے یوں نکل رہا تھا جیسے روح کی گہرائیوں سے آیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک روشنی تھی جو بس اندر سے ہی نکل سکتی تھی اور باہر کی ساری روشنیوں سے الگ تھی۔ کبھی کبھار آکاش پر چاند کے حسن میں مجھے وہ روشنی جان پڑتا ہے دکھائی دی تھی۔

ماں بھی چپ چاپ کھڑی تھی اور جنتی سہمی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ کوٹھڑی میں ہم چاروں تھے۔ میں اور ماں، دادی اور جیتی۔

پھر دادی نے کہا "اس کرپان پر ہاتھ رکھ کر سوں کھا کہ تو اپنے باپ کا بدلہ ضرور لے گا۔ کیوں کہ سردار مہر سنگھ نے ناحق اس معاملے میں ٹھاگو اور اس کے باپ کی طرفداری کی ہے اسے معلوم ہے انوپ سنگھ اس کا دشمن تھا مگر وہ چاہتا ہے کہ ہمارے خاندان کا نام مٹا دے وہ صرف مجھے دکھ دینا اور تڑپا کر مارنا چاہتے ہیں کیوں کہ میں نے کبھی ان کی اور ان کی عورتوں کی پرواہ نہیں کی پانچ گاؤں کے مالک ہونا اور بات ہے اور بہت اونچے ہونا دوسری بات ہے۔"

اس کے باوجود کہ دادی کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ اونچے ہونے اور نہ ہونے کی بات بھی بہت مشکل تھی۔ پر میں نے کرپان پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں اپنے باپو اتم سنگھ کی موت کا بدلہ مہر سنگھ کے خاندان سے ضرور لوں گا۔

پھر دادی ماں کی طرف منہ کر کے بولی — "کٹنیے تو کہے گی کہ میں نے تیرا سہاگ برباد کیا ہے اور اب میں تیرے لڑکے سے بھی ایسی قسم اٹھوا رہی ہوں جس میں

اس کی جان کا خطرہ ہے۔ پھر تو یہ سوچ خاندان کی آن بھی کوئی شے ہے۔ دلدار سنگھ اگر سر اونچا کر کے لاڑاں کی گلیوں میں چل نہ سکا تو پھر ایسے جینے کا کیا فائدہ؟"

میں نے کہا۔" لا مجھے ابھی کرپان دے میں جا کر سردار دھرم سنگھ کو مار دوں جس نے میرے باپو کو گھر سے دور قید میں رکھا ہوا ہے؟"

دادی میرے اس بھولے پن پر بڑے دکھ سے مسکرا پڑی پھر اس نے اٹھا کر میرا منہ سر چوم لیا اور بولی۔" بس میرے لال ابھی وقت نہیں آیا۔ کبھی نہیں آیا وہ دیلا۔ میں زندہ رہوں گی اور جس دن تو دھرم سنگھ سے بلے عزتی کا بدلہ لیگا میں ان سنگھ شانتی سے مر جاؤنگی بسنگھ شانتی سے بھی مروں تو بھی کوئی بات نہیں پر سر سے کندھوں سے ایک بوجھ سا اتر جائے گا۔"

ماں نے جالی میں سے لا کر ملائی والا گرم گرم دودھ کا گلاس مجھے دیا اور میں چوپال کی طرف چلا گیا جہاں ایک میلہ سا تھا۔ سارے بڑے بوڑھے اکٹھے تھے اس دن سویرے ہی باپو کی پھانسی کا حکم ہوا تھا اور سارے گاؤں میں لوگ ہولے ہولے واہ گرو کا نام جپتے لمبی اونچی گلیوں میں دھوپ کی وجہ سے سائے سائے چوپال کی طرف جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سے پہلے کبھی اس گاؤں میں ایسا کام نہ ہوا ہو۔ اور نہ ہی کسی نے کبھی کسی کو مارا ہو۔ عورتیں چھپ چھپ کر ہی ایک دوسرے کے گھر آ جا رہی تھیں۔ سارے گاؤں میں یہی چرچا تھا۔ کہار بیٹھنے والوں کو پانی پلا رہے تھے۔ چار گھوڑیوں پر آنے والوں کی باگیں پکڑ کر انھیں گھوڑیوں سے اتار رہے تھے اور پلنگ بچھا کر دے رہے تھے۔ اونچے قدوں والے ڈراؤنی سرخ آنکھوں والے، لال پگڑیوں والے سردار گلے میں کارتوسوں کی پیٹیاں پہنے کندھوں سے رائفلیں اتار کر رکھ رہے تھے۔ ان کے تہبند پیچھے سے زمین پر گھسٹتے تھے اور ان کے کرتے لمبے لمبے کرتوں سے بھی نیچے لٹک رہے تھے۔ گھوڑیاں ہانپ رہی تھیں اور ان کے نتھنے سورج کی روشنی میں گلابی لگتے تھے جیسے کسی کنواری کے لالی سے سرخ ہونٹ۔ کہار جھولوں سے

شراب کی بوتلیں نکال کر چارپائیوں پر رکھتے جوانی چڑھتے لڑکے ذرا پرے ہٹ کر گاؤں کی مٹیاروں کی، اپنے کتوں کی اور شراب کے مزے کی باتیں کر رہے تھے جو بیٹھے ہوئے سرداروں کے لئے پرانی ہو چکی تھیں مگر کوئی بھی زور زور سے بات نہیں کرتا تھا۔ نئے آئینوالے کی گونج وارست سری اکال سنائی دیتی اور پھر وہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ شروع ہو جاتی۔ گھوڑیاں زمین پر سُم مارتیں اور ہنہنا کر اپنے مالکوں کو دیکھتیں اور دانہ کھانے لگتیں جو حویلی نا ندوں میں پڑا تھا۔

پھر جب گیانی جی بھی آ گئے اور سردار مہر سنگھ کی ست سری اکال کی آواز بھی تھم گئی۔ فصلوں اور مربعوں، زمین اور نئے شہر اور لاد دانشاں جی بیاہو۔ انگریزوں اور ان کی میموں کی باتیں ہو چکیں تو گیانی جی نے بات شروع کی ―"ہم کو یہ سن کر بڑی چنتا ہوئی ہے کہ اتم سنگھ کو پھانسی کی سزا ولایت کی عدالت سے بولی گئی ہے پر جیسی واہ گرو کی مرضی کیا کہا جا سکتا ہے!"

لڑکوں کے پلنگ پر ایک طرف میں بھی بیٹھا تھا انھیں میرا پتہ نہیں تھا۔ وہ مجھے گاؤں کا ایک لڑکا یا بس یونہی کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ سب اپنی باتوں میں مگن تھے۔ بڑوں کی باتوں میں ذرا سی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ان کے پاس سے عطر چنبیلی کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی اور کبھی کبھار تو ان کی کھی کھی کی وجہ سے مجھے بڑوں کی باتیں بھی سنائی نہیں دیتی تھیں۔

سردار مہر سنگھ نے کہا ―"گیانی جی، جو ہونی ہو اس کو روکا نہیں جا سکتا اور سرکار دربار سے ہمیشہ انصاف ہوتا ہے ہمیں کیا کہنا ہے۔ مگر ایک بات ہے اتم سنگھ نے انوپ سنگھ کو مار کر اچھا نہیں کیا تھا آخر واہ گرو نے عورت کو اسی لئے ہی تو بنایا ہے کہ مرد اس سے دو گھڑی کھیل کر جی خوش کرے۔ ہمیں تو اس گھڑی پتہ چلا ہے جب انوپ سنگھ کے ساتھ بھاگو بھی ماری گئی ہے۔ واہ گرو کی قسم مجھے تو کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ انوپ سنگھ اور بھاگو میں کوئی بات تھی۔ ویسے عورت طرحدار تھی۔ پر اب ماری گئی سو ماری گئی۔ میری تو انوپ سنگھ سے

بول چال بند تھی۔ پھر بھی ناخنوں سے ماس تو الگ نہیں کیا جا سکتا نا۔ ہم سارے سرداروں کی برادری ایک ہی ہے نا۔ میں نے تو کوشش کی تھی۔ پر جو ہونا تھا ہو چکا۔ دس دن بعد اتم سنگھ کو پھانسی ہوگی۔ بیچارہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔"

گیانی جی نے کہا۔" سدا ہر ایک مصیبت کے پیچھے عورت ہی ہوتی ہے ویسے بھاگو اوپ سنگھ کی جوتی کی برابری بھی نہ کر سکتی تھی۔ مگر ماری جو گئی اور سب سے زیادہ بڑی بات تو اتم سنگھ نے یہ کی کہ جا کر خود عدالت میں کہہ دیا کہ میں نے مارا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کسی کو بھی پتہ نہ چلتا اور وہ بچ جاتا۔"

دھرم سنگھ نے کہا۔" سارا قصور اس کی ماں کا ہے جیسے عزت کا اتنا خیال رہتا ہے اب دیکھو کھیتوں میں آپ کام کرتی ہے۔ پر برادری والوں میں سے کسی کا احسان نہیں اٹھاتی۔ نہ ہی اپنے مائکے والوں میں سے کسی کی منت کرتی ہے۔ دھیان پور والوں کی بیٹی ہو کر کھیت میں کام کرے مگر اسے تو کسی کی پرواہ نہیں۔ واہ گرو کی قسم میرا تو بس خون کھول جاتا ہے۔ جب اسے کام کرتے دیکھتا ہوں اور ایک ہماری سوانیاں ہیں جنہیں کسی نے کبھی رتھ کے بنا آتے جاتے نہیں دیکھا۔"

اور بہت سے لوگ باتیں کرنے لگے۔ پلنگوں پر بیٹھے سردار اب اونچی آواز سے میری دادی کی، بھاگو کی، میرے بابو اتم سنگھ کی فصلوں کی اور شرابوں کی ہر طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ لڑکے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ میرے جی میں آگ لگی ہوئی تھی۔

گیانی جی نے کہا۔" سردار جی سب ٹھیک ہے پر اتم سنگھ کی ماں سیدھی اور آن پر جان دینے والی بہادر عورت ہے اس میں رانیوں کی سی شان ہے اس سے آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیئے۔"

تھوڑی دیر چپ رہ کر دھرم سنگھ نے کہا۔" ٹھیک ہے گیانی جی پر آخر سوانیوں کو پردے میں رہنا چاہیئے گھر میں لاکھوں کام ہیں۔ باہر مرد ہیں کس لئے۔ پہلے گھر کا سائیں اٹھ گیا۔ اب جوان بیٹا۔ پھانسی لگنے والا ہے۔ پھر بے سمجھ پوتے کو قربان کرے گی۔"

اور مجھے یوں لگا جیسے شام کے گہرے ہوتے سائے میں اس نے لمحے کے لئے میری طرف بھی دیکھا پر میں تو بڑے لڑکوں کی اوٹ میں تھا۔

پھر ان کی باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ شراب پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے اور شام کے سایوں میں اور بھی بڑے بڑے دیو لگ رہے تھے میں چپکے سے وہاں سے کھسک آیا۔

رات ہو گئی تو دادی نے کہا — "کڑیئے تیرا خیال ہے گھر میں کوئی جوان نہیں اور تو نے روٹی نہیں پکائی۔ اٹھ تنور گرم کر اور دلدار سنگھ کو روٹی پکا کر دے۔ نی جنتی پانی لا کر ویر کا منہ ہاتھ دھلا۔"

اور اس رات کے بعد سے دادی نے پھر مجھے کاکا نہیں کہا۔ میری ماں نے تنور میں اُپلے ڈالے، پہلے نیلا دھواں نکلا اور آگ کے شعلے زبانیں نکالے کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے، جیسے بھتنے ہمارا سر چڑا کر بھاگ رہے ہوں۔ ہمسائے میں تیر سنگھ کی بیوی نے دیوار کے اوپر سے منہ نکال کر کہا — "کیوں بہن تنور گرم کر لیا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی کہ جا کر پوچھوں۔"

پھر سلطان سنگھ کی بہن اور پڑوس کی دوسری عورتیں اپنے اپنے آٹوں کی پراتیں اٹھائے ہمارے آنگن میں آ گئیں اور روز کی طرح بھیڑ لگ گئی جنتی نے پانی کا کرمنڈل لا کر میرے قریب رکھ دیا اور کہنے لگی — "کاکا منہ دھو لے۔"

دادی نے دیئے کی مدھم روشنی میں پہلے اس کی طرف بڑے غصے سے دیکھا اور پھر اسے قریب بُلا کر کہنے لگی — "دیکھ نی جنتی آج سے پیچھے اسے کسی نے کاکا نہیں کہنا۔ اس کا نام بلایا کر پورا نام دلدار سنگھ۔"

جنتی نے جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا اپنی کندھوں پر پڑی چھوٹی سی چنری کو درست کر کے سر پر اوڑھ لیا اور پھر کہنے لگی — "دلدار سنگھ

دیر منہ دھولے۔"

اور دادی نے خاموشی سے اسے اپنی طرف کھینچ کر گلے سے لگا کر کہا۔" ہاں آج سے پیچھے اسی طرح کہا کر۔"

ساری عورتیں اپنی اپنی روٹیاں لکا کر چلی گئیں۔ دادی نے بھینسوں کا دودھ نکال کر ماں کو دے دیا جس نے اسے صبح کے دودھ میں الٹا دیا۔ دیئے کی روشنی میں ماں کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اداس لگتی تھیں وہ شاید اس وقت بھی رو رہی تھی مگر دادی کے ڈر سے آواز نہ نکالتی تھی۔ پھر اس نے دودھ کو جمنے کے لئے رکھ دیا۔ جنتی کو روٹی دی مجھے مکھن کی پیالی اور دودھ دے کر چوکے میں جا بیٹھی اور راکھ سے رگڑ رگڑ کر برتنوں کو چمکانے لگی۔ شاید چودھویں تاریخ تھی کہ سورج کی سرخی میں چاند کی زردی مل رہی تھی اور دیئے کی روشنی پر ایک بیمار سی دھند تھی جیسے بس دیا بجھنے ہی والا ہو۔

پھر گلی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ہمارے بڑے سے دروازے میں ذرا جھک کر گھوڑی پر چڑھا چڑھا ہی دادی کا بھائی چانن سنگھ اندر آ گیا۔ وہ آنگن میں آ کر گھوڑی سے اتر پڑا اور دادی بڑی بیماری اٹھ کر اس سے ملنے کے لئے چارپائی چھوڑ کر آنگن میں آ گئی۔ ماما چانن سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے یوں لگا جیسے دادی کی چیخ نکل گئی ہو۔ اس نے کہا۔" حوصلہ کر کاکی حوصلہ کر۔"

پر اس کی آواز خود آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی اور بڑی مشکل سے نکل رہی تھی جیسے اس کے گلے میں پھندا ہو اور بولا نہ جاتا ہو۔ آخر مقدر اور تقدیر کے سامنے کوئی کیا کر سکتا ہے کتنا بے بس ہے انسان!

ماں چوکے میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ کا برتن ہاتھ میں تھا اور وہ اپنا گھونگھٹ بھی کاڑھنا بھول گئی تھی۔ ماما چانن سنگھ نے دو ایک بار کھنکھار کر گلا صاف کیا اور دادی نے کہا۔" کرتیئے ویر چانن سنگھ آیا ہے۔"

تب جیسے ماں کو ہوش آیا اور اس نے گھونگھٹ کھینچا۔ دادی نے ماما کو میرے پاس

بٹھاکر کہا ــ" ویر تو میرے دلدار سنگھ سے باتیں کر۔ میں پانی روٹی لاؤں۔"

مگر مامے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــ" نہیں کاکی، میں نے نہ پانی پینا ہے اور نہ روٹی کھانی ہے۔ میں تو بس تجھے دیکھنے اور یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ ساری شرارت مہر سنگھ کی ہے۔ اس نے پورے دو مربعے بیچ کر رشوت دی ہے اور اتم سنگھ کے لئے ولایت جا کر خود پھانسی کا حکم لے کر آیا ہے۔ بس اب ان لوگوں سے خبردار رہنا۔"

دادی نے بڑی بے بسی سے کہا ــ" کیوں ویر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری ساری زمین بیچ دے۔ میرا پوت چھوٹ جائے۔ میرے اتے کو گھر واپس لادے۔"

وہ ہاتھ ملنے لگی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں اس نے خشک نہیں کیا۔ پلو اس کے گلے میں پڑا تھا۔ اس کا سر ننگا تھا اور چاند کی روشنی اس کے بالوں کو بھی سفید کئے دیتی تھی۔ دیئے کی لو بار بار ہوا کے جھونکوں سے کبھی ایک طرف جھکتی اور کبھی دوسری طرف۔ زمان کی طرح وہ ان دیکھی چیزوں کو چاٹ رہی تھی۔ جنتی پیچھے کھڑی مامے کو ہولے ہولے پنکھا جھل رہی تھی اور میری طرف ماں اور دادی کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

مامے نے کہا ــ" کاکی صبر کر! تیرا تو دل دریا تھا تجھ میں تو پہاڑوں کا حوصلہ ہے دشمنوں نے بڑا مارا ہے۔ اگر پتہ ہوتا کہ مہر سنگھ اس طرح زہری سانپ بن کر ڈسے گا تو ہم پہلے ہی ہوشیار ہو جاتے۔ تیرا خیال ہے اتم سنگھ مجھے کم پیارا ہے۔ میں آج سارا دن عدالت کچہری میں مارا مارا پھرتا آیا ہوں اب پھر شہر جا رہا ہوں۔"

پھر وہ جانے کے لئے اٹھا تو دادی نے کہا ــ" تجھے میری قسم اس وقت جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں چلے جانا۔ چاندنی ہو یا اندھیری رات، سیاہ دنڈ تو موت کا گھر ہے۔"

مامے نے کہا ــ" کاکی تو ناحق ڈرتی ہے۔ میں پہلے کانیال جاؤں گا وہاں سے دوسرے راستے جانا ہے۔ مجھے یہاں سے کئی اور آدمیوں کو بھی ساتھ لینا ہے دعا کر شاید وہ گردھی کرتار سوہنی کرے۔ ناامید کیوں ہوں وہ تو ڈوبتے بیڑے تیرا دیتا ہے۔ تو نے کیا قصور کیا ہے"

پھر میں نے ماما چانن سنگھ کو اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے اور دروازے سے باہر جاتے دیکھا۔ دادی وہیں آنگن میں کھڑی تھی۔ دھیان پور والوں کی بیٹی لائلپور والوں کی برادری کی عورت جس نے رو رو کر اور زاری کر کے اپنے ویر سے التجا نہیں کی تھی۔ دادی کے بعد میں نے اس شان کی کوئی اور عورت کبھی نہیں دیکھی۔

ان دس دنوں میں میں دس عمریں پار کر گیا۔ دس زندگیاں جس میں میں نے زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی سے لے کر موت تک کا چہرہ دیکھ لیا۔ مایوسی اور امیدیں دیکھ لیں آنے والی زندگی کی شفقتیں اور محبتیں، دشمنیاں اور بدلے سب صف باندھے میرے سامنے کھڑے ہو گئے گویا میں راجہ ہوں اور یہ مجھے سلام کر رہا ہے۔ پرے باندھے، اچھے برے چہرے، مکروہ شکلیں، اداس اور بیگناہ، خوش گناہگار، موت سے ڈرنے والے اور ہنس کر موت کا سواگت کرنیوالے سبھی دیکھ لئے۔ وہ دس دن ایسے کٹھن تھے کہ پہاڑوں کی بلندیاں ان کے سامنے کچھ نہیں اور پھر بھی میں سوچتا ہوں انسان جب تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا سانس چلتا ہے وہ دنیا کے نئے پن میں کوئی نہ کوئی ایسی کشش تو پاتا ہی ہے نا۔ ورنہ ایک لمحے کے بعد جب زندگی سے زیادہ موت پیاری لگتی ہے انسان جئے کیونکر؟

مہاراج پور سے میری ماں کے بھائی آئے، بھابیاں آئیں اس کی روتی ہوئی ماں آئی تو دادی نے آنگن میں کھڑے ہو کر کہا ــــ "دیکھو سردارنی جی سکھ سے میرا پوت زندہ ہے۔ واہ گرو جی کرے میں کسی کو اس کی زندگی میں رونے نہیں دوں گی اور موت پر تو کسی کا زور نہیں۔"

اور نانی نے اپنی آنکھیں پونچھ کر کہا ــــ "ٹھیک ہے بہن جی، سب ٹھیک ہے پر مجھے تو اپنی بیٹی کے سہاگ کا رونا ہے۔ جوجوان جہان ہی اجڑ گئی۔"

دادی نے چیخ کر کہا ــــ "میں اپنے گھر میں کسی سے اُجڑنے بسنے کی باتیں نہیں سننا چاہتی جس کا جی چاہتا ہے نہ آئے۔ ایسی باتیں کرنے اور کہنے کے لئے ایک عمر پڑی ہے جو ہوگا سو تو ہوگا ہی پر میں اتم سنگھ کے جیتے جی ایسی باتیں نہیں کرنے دوں گی۔"

پھر دیواروں پر لٹکی، دروازوں میں جھانکتی اور بڑے دروازے میں کھڑی عورتیں خاموشی سے پلٹ گئیں۔ نانی اور ماں کی بھابیاں اندر بیٹھ گئیں۔ دادی نے انھیں نئے جھالروں والے پنکھے نکال کر دیئے اور پھر کہاری سے ٹھنڈے کھوہ سے پانی منگوا کر انھیں شربت بنا کر دیا۔ نانی نے جب کہا کہ ہمیں پیاس نہیں تو دادی کہنے لگی۔ " سردارنی جی میرا بستا گھر ہے میرا بیٹا ابھی زندہ ہے مصیبت کس پر نہیں آتی، کیوں میرے گھر سے کوئی بھوکا پیاسا جائے "!

پھر ماں نے آٹا گوندھ کر تنور گرم کیا اور بھاجی پکا کر سارے ننھیال والوں کو کھلائی۔ ماں کی بھابیوں کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ نانی آنسو بھری آنکھیں پلو سے پونچھتی ہوئے ہولے نوالے کھاتی اور دادی سے اتم سنگھ کے دشمنوں کی باتیں کر رہی تھی۔

دادی انھیں ساری باتیں سمجھا رہی تھی۔ پھر ہم نے آنگن میں گھوڑیوں کے رکنے کی آواز سنی۔ ماں کے ویر گھوڑیوں سے اتر رہے تھے۔ دادی بھی وہیں آ گئی۔ شمشیر سنگھ ماما نے جھولا کھول کر دادی کو سرخ سرخ پونڈ دکھائے اور بولا — " میں اپنی بہن پر سے اپنی ساری دولت وار دوں اگر کوئی اتم سنگھ کو بچانے کی راہ مجھے دکھا دے "!

اور دادی نے بڑی آن سے کہا — " بھاؤ دا مگر دیجھ کو اپنی دولت آپ برتنا نصیب کرے تو اپنی جوانی آپ جیئے اور یہ دولت برتنے کو کوشش کر دیکھ "۔ اور پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولی — " آ کڑیئے اندر کیا بیٹھی ہے آ کر اپنے ویر سے مل "!

ماں دروازے کی دہلیز سے لگی بیٹھی تھی اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی پر چیخ نہ سکتی تھی۔ صبر کے سارے بندھن ٹوٹ رہے تھے اس کی بھابیاں اسے سہارا دے رہی تھیں اور خود بھی اپنے پلو سے آنکھیں ڈھانپے ہوئے تھیں کوئی زور سے رو نہیں رہا تھا جیسے چیخیں سینے میں گھٹ رہی ہوں اور دادی خشک آنکھوں سے بہت قہر بھری نظروں سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھر میں ابھی بیٹے کی زندگی میں لوگ رو کیوں رہے تھے؟

دادی اگر دکھ کے سامنے چٹان نہ بنتی تو مٹی کے تودے کی طرح ڈھے جاتی۔

دھیان پور والوں کی سردارنی بیٹی نے دشمنوں اور رشتہ داروں کے سامنے جس شان اور جس دل گردے کا ثبوت دیا اس پر سارے اپنے بیگانے حیران رہ گئے۔ دم دم مہر سنگھ کے گھر کی کماریاں اور چمارنیں لگی تے گزرتیں۔ شاید بین کرنے کی آواز آئے شاید سردارنی کرتار کور انوپ سنگھ کی موت پر آنسو پی جانے والی اب بیٹے کی موت کی خبر سن کر پلو پھیلا پھیلا کر روئے اور دشمنوں کو بد دعائیں دے۔

برادری والے آتے اور لالڑاں کی لڑکیاں، بہوئیں، عورتیں، سرداریاں، کماریاں، ان دنوں گھر میں آنتا بندھا جا رہا تھا۔ ماسے چانن سنگھ نے اپنے کام کرنے والوں کو ہمارے کھیتوں کی رکھوالی کے لئے بھیج دیا تھا پھر بھی دادی روز سویرے آپ کھیتوں پر جاتی، بھینسوں کی سانی کرتی، دودھ دوہتی اور آنے والوں کی خاطر داری کرتی۔ عورتیں شربت پی کر جاتیں تو کہتیں ــــ " عورت نہیں پتھر ہے اتنا سخت دل واہ گرو تو کسی کا نہ کرے ڈائن ہے ڈائن! خصم مرا تب نہ روئی اور اب اتم سنگھ کو پھانسی ہو نیوالی ہے پر اس کی آنکھوں میں ایک آنسو نہیں۔ ہر ایک کو پانی پلاتی ہے خاطر کرتی ہو جیسے اس کے گھر بدھائی دینے گئے ہوں اور کل پرسوں برات آنے والی ہو"

اور چوپال کی بھیڑ بھاڑ میں بیٹھا سردار مہر سنگھ کہتا ــــ " بلے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے بھی زیادہ حوصلے والی، دھیان پور والے ہی ایسی شیرنی پیدا کر سکتے تھے۔ ہمارے گھر کی سوانیاں تو چوہے سے بھی ڈر جائیں۔ پردوں میں بیٹھنے والیاں جو ہوئیں۔ بھئی ہم ہم سردارنی کرتار کور کا مقابلہ کر سکتے ہیں بھلا؟"

پھر وہ طنز سے ہنستا اور سارے بیٹھنے والے یا تو اس کا ساتھ دیتے یا چپ کر کے منہ پھیر لیتے۔ اور رفتہ رفتہ چوپال میں وہ جوش اور ولولے کی باتیں نہ ہوتیں۔ صرف مہر سنگھ کہتا ــــ " بھئی انوپ سنگھ کو مارا تھا تو بھاگو کو رہنے دیتا۔ اتم سنگھ، ہمارے کام آتی۔ آخر اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ جب انوپ سنگھ نے اسے اپنی سوانی سے

نیاؤ درجہ دے رکھا تھا تو اس نے تو سر چڑھنا ہی تھا۔"

دو چار دنوں کے اندر اتم سنگھ کے پھانسی پانے کی بات چوپال میں پرانی ہو گئی لالڑاں کی لڑکیاں، بہوئیں اب شام کو گاؤں کے باہر ناچتی اور گاتی ہوئی اگر میری ماں اور دادی کو دیکھ لیتیں تو ناچتی رہتیں اور لحاظ کے مارے چپ نہ کر جاتیں۔ دادی کہتی ۔۔۔ "کڑیو ناچو بھی تو ہنسنے کے دن ہیں۔ پھر نہ جانے سسرال کے گھر میں کیا کیا سہنے کو ہو۔ پرواہ گرو ہر ایک نصیب اچھے ہی کرے کرتار چنگی کرے۔"

دادی کے بھائی ماسے چانن سنگھ نے شمشیر سنگھ کی ساری دوڑ دھوپ فضول گئی۔ ولایت سے آیا ہوا حکم دس دنوں میں کیسے بدل سکتا ہے۔ شرنج پونڈوں سے بھرے جھولے سفارشیں، روپے زمین سب مل کر بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے باپو اتم سنگھ کی زندگی کوئی شے دے کر خریدی جا سکتی تو دادی ضرور اپنے آپ کو اس پہ سے قربان کر دیتی۔

جس دن جیل میں، میں، ماں، دادی اور جنتی اسے ملنے گئے اس دن دادی نے گڑ والی میٹھی روٹیاں پکائی تھیں وہ روز کی طرح تاروں کی چھاؤں میں اٹھی۔ پھر سب سے پہلے اس نے جنتی کو نہلا کر وہ جوڑا پہنایا جو شادی بیاہوں اور کسی کے ہاں مہمان بن کر جانے کے لئے پہنا جاتا تھا۔ جنتی بہت خوش تھی اور ماں سے سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "ماں یہ پوشاک تو دھیان پور جانے کے لئے رکھی تھی۔ ہم دھیان پور جا رہے ہیں کیا؟" جوتا پہنتے ہوئے وہ بولی ۔۔۔ "ماں بس میں تو اب ہر وقت یہی جوتی پہنا کروں گی چاہے تو مجھے مارے چاہے چھوڑے۔"

پھر دادی نے لسی بنا کر مکھن نکالا اور اسے ایک مٹی کے رنگین کٹورے میں ڈھانپ کے لسی کے برتن کے اوپر رکھ لیا۔

مجھے کپڑے پہناتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔ "دلدار سنگھ ہم آتے کو ملنے جا رہے ہیں پر دیکھ......"

وہ چپ ہو گئی تو میں نے کہا ــــ" دادی تو نے کیا کہنا تھا؟"

بولی ــــ نہیں کچھ نہیں کہنا۔ تو بھی اپنی جوتی پہن لے"

ماں کے چہرے پر ایسی زردی تھی اور وہ ایسی کمزور لگتی تھی جیسے مرنیوالی ہو۔ اس سے چلا نہیں جاتا تھا مگر پھر بھی دادی نے اسے سب سے اچھا جوڑا نکال کر دیا۔ جب ماں پلنگ پر پڑے جوڑے کی طرف دیکھتی رہی تو دادی نے کہا ــــ" پہن لے، پھر کون تجھے ان کپڑوں میں دیکھنے والا ہوگا اور دیکھ اپنے ہونٹوں پر ذرا سی لالی بھی لگا لے۔ آنکھوں میں کاجل لگانا نہ بھولنا۔ چل میری بیٹی بس اب جلدی سے تیار ہو جا۔ جانن سنگھ آنے والا ہوگا"

دادی کی آواز میں اتنی نرمی مجھے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ایسی نرمی جسے محسوس کر کے بے اختیار رونے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب سورج سپاری ونڈ کے گھنے باغ میں راہ تلاش کرنے نکلا ہے اور بڑی نہر کی لہریں سرخ اناروں کی طرح لگتی تھیں، ہم لالرس سے چار بیل نکل آئے تھے۔ دادی کی سب سے جی دار اور منہ زور گھوڑی پر دادی بیٹھی تھی اس کے بعد میں اور جنتی ایک بڑی غریب طبیعت گھوڑی پر آگے پیچھے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھے۔ جنتی نے پیچھے سے زور سے میرا کرتا پکڑ رکھا تھا اور بار بار ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جاتی تھی۔ چمار ہمارے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ماں تھی جو جہیز میں ملی گھوڑی پر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی اور لگامیں تھامے ہوئے اپنے خیالوں میں نہ ہنستی نہ بولتی تھی۔ اس کی نئی گلابی شلوار کے پائنچے سورج کی کرنوں میں جگ مگ کرتے چمک رہے تھے۔ دو ایک دفعہ جنتی نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے اتنا ڈر لگا کہ وہ چیخ پڑی اور میں گرتے گرتے بچا۔ سب سے آخر میں ماجانن سنگھ تھا جس کی شکل مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب میں نے اپنے باپو کو دیکھا تو میرا دل اچھل کر منہ میں آ گیا۔ اسے کو پہلے دادی نے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے منہ سر کو چوما۔ پھر ماے جانن سنگھ نے اس کو گلے لگایا ماں کو دیکھ کر

باپو نے کہا ــــ "جیتو بیٹھ جا، کیا حال ہے؟"

مگر ماں کچھ نہ بولی۔ جتنی دیر ہم وہاں بیٹھے رہے جنتی باپو کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی رہی دادی نے میٹھی روٹیاں نکال کر اسے دیں تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا اور بڑے بڑے نوالے کر کے کھانے لگا۔ مکھن سے گیلے ہاتھوں کو اس نے اپنی مونچھوں اور داڑھی پر مل لیا۔ زور سے ڈکار لے کر بولا ــــ "ماں واہگرو کی قسم تیری طرح میٹھی روٹیاں ساری دنیا میں کوئی نہیں پکا سکتا۔ ہاں میری بھوری بھینس کا کیا حال ہے۔ وہ مجھے بہت پیاری ہے دیکھ اس کا خیال رکھا کرنا جیتو۔ تو بولتی نہیں، کتنی پیلی ہو رہی ہے۔ ماں تو اسے پیٹ بھر کر روٹی نہیں دیا کرتی کیا؟ جیتو بھی خوش رہا کرنا۔ گرنتھ صاحب کے سامنے تیرے میرے پھیرے ہوئے تھے اور میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے خوش رکھا کروں گا۔ مجھے مہاراج پور والوں سے شرمندہ نہ کروانا۔ میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔"

دادی نے جیسے کوئی پوری سنی کہے۔ کہا ــــ "اتم سنگھ پوت اور روٹی کھالے۔ واہگرو تیری عمر دراز کرے۔"

اور اتمے نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ میں ڈر گیا اور جنتی پرے ہٹ کر اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ دادی بولی ــــ "کیا تجھے گرنتھ صاحب پر پورا یقین نہیں کیا تو نے گردوارے میں بہتیں کھنا کہ . . . ."

اور پھر اس کی ہمت جواب دے گئی وہ اپنے منہ پر پلو ڈال کر ہائے ہائے کرنے لگی۔ ماسے چانن سنگھ نے اسے کہا ــــ "کاکی ہمت کر، صبر کر۔" وہ خود رو رہا تھا۔

اُتمے کے چہرے پر اُداسی جیسے بادلوں کا سایہ ہو ایک لمحے آئی۔ پھر اس نے کہا۔ "دلدار سنگھ ادھر آ۔ تو جوان پوت ہے اور اس بے عزتی کا بدلہ تجھے لینا ہوگا۔ عورت کے بدلے عورت ہی ہوگی۔ دیکھ یہاں میرے سر پہ ہاتھ رکھ اور واہگرو کی قسم کھا کہ تو سردار مہر سنگھ سے بدلہ لے گا۔ بس عورت کا بدلہ عورت ہوگی۔ انھوں نے بھاگو کے بدلے اپنی ساری دولت لگا دی ہے۔ حالانکہ بھاگو اس کی کچھ نہ لگتی تھی اور دیکھ جنتی تیری بہن ہے اس نے ابھی کچھ

سلوک کرنا اگر یہ کبھی کوئی غلطی کرے تو اسے معاف کر دیا کرنا۔ یہ سوچ کر کہ اس کا باپو اس کے سر پر نہیں۔ اسے اچھی جگہ بیاہنا جس گھر میں رزق کافی ہو اور آدمی کی عادت ذرا ذرا سی بات میں میخ نکالنے والی نہ ہو۔ دلدار سنگھ میری جنتی تیرے سپرد ہے"۔

پھر دادی کی طرف مڑ کر بولا ــــ "ماں میں نے جتنا مجھ سے ہو سکا تیری خدمت کی پر کبھی بڑے پیر نہ دبا سکا تیری سیوا جی بھر کر پھر بھی نہ کر سکا"۔

دادی ماں چانن سنگھ کے سنبھالتے سنبھالتے گر گئی۔ باپو نے دادی کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور اسے چادر سے ہوا کرنے لگا۔

پھر جانے کا وقت ہو گیا اور دروازے پر کھڑے سنتری نے ہمیں اطلاع دی "جیتو"! اتے نے کہا ــــ "میں تیرا قرضدار ہوں۔ پر تو مجھے معاف کر دے۔ ماں کا تیرے اور دلدار سنگھ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کی بیٹوں کی طرح خدمت کرنا۔۔۔ زندگی میں نہ سہی موت کے بعد ہم ضرور ملیں گے۔ اپنی عزت کی حفاظت کرنا۔ تم جوان ہو۔ پر دیکھ دلدار سنگھ تو اب بڑا ہو گیا ہے نا!"

ماں نے روتے روتے جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

مجھے آج بھی اپنے باپو کی صورت اسی طرح دکھائی دیتی ہے جب ہم اسے چھوڑ کر آ رہے تھے اور وہ جنتی کو بار بار گلے سے لگا رہا تھا ماں کے چرن چھو رہا تھا مجھے پیار کر رہا تھا اور ماں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس میں ساری زندگی اور ساری محبتیں وہ کس حسرت سے ہمیں سدا کے لئے وداع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم لائلپور لوٹ آئے۔

اور زندگی کا نیلی دھول میں چھپا ہوا سنہرا راج بھون دھم سے گر گیا اور پھر آہستہ آہستہ بیٹھی ہوئی دھول مٹی میں مل گئی۔

سیندوری پرچھائیں

جب لالڑاں کی گلیوں میں اپنے پرائے اتم سنگھ کا ماتم کر رہے تھے اور آس پاس کے دس گاؤں کے لوگ میری بیوہ ماں اور میری بیوہ دادی پر افسوس کر رہے تھے۔ عورتیں گھگھرے پہنے، چھاتیاں ننگی کئے کھڑی کھڑی باپو کا سیاپا کر رہی تھیں اور ان کے گھونگھٹ درد بھرے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے، تب میں نے مہر سنگھ کی بیوی کو اپنی کہاریوں اور نائنوں کے ساتھ چادر اوڑھے بڑے دروازے میں داخل ہوتے اور آنگن میں آکر ایک طرف کھڑے ہوتے دیکھا، پھر تھوڑی دیر بعد اس نے چادر اتار دی اور گھونگھٹ کھینچ کر سیاپا کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ باپو کو ایک چادر دے کر سر سے پاؤں تک ڈھانپا ہوا تھا اور مراثن درد بھری آواز میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی کہ ساری عورتیں بہت زور زور سے اپنے ہاتھ چھاتیوں پر مارتیں اور رو دی جاتی تھیں۔ میری ماں کے مائکے سے اس کی بھائیوں اور ماں کے ساتھ سارا جھاراج پور ہی آگیا تھا۔ دھیان پور اور ساری ونڈ کے سرداروں کی بہوئیں اور سردانیاں، کہارنیاں، مہریاں کوئی عورت ایسی نہ تھی جو آنسو نہ بہا رہی ہو جبتی کو ہم نے دیسو کے گھر اس کی چھوٹی بہن سے کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا دادی کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں تھا وہ صبح سے اتے کے پاس بیٹھی گھڑی گھڑی ہاتھ ملتی اور کہتی تھی ــــ "اتم سنگھ سوہنا اب میں کہاں جاؤں؟" وہ عورتوں کی طرف دیکھتی اور بار بار ہاتھ مل کر کہتی ــــ "اتم سنگھ پوتے میں کہاں جاؤں؟" کبھی کبھار چیخ کر کہتی ــــ "میرے گھر میں تم رو کیوں رہی ہو۔ شور کیوں کر رہی ہو

میرے بیٹے کو سونے دو۔"

میری ماں نے سویرے سے آنکھ نہ کھولی تھی اس کے ہونٹ سفید تھے اور باپو کی لاش کے پیروں کی طرف جہاں سویرے گری تھی وہیں پڑی تھی کسی نے اسے ہوش میں لانے اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کی کوشش نہ کی تھی۔ میری نانی نے اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر لہولہان کر لی تھی مگر کوئی اس کے ہاتھ روکتا اور اُسے منع نہیں کرتا تھا۔ دکھ کی شدت میں کمی یا زیادتی رشتے کی دوری اور نزدیکی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نانی کو جوان بیٹی کے ودھوا ہو جانے کا افسوس تھا اور یوں بھی باپو کی موت پر کسی کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے سوائے دادی کے۔

پھر باہر سے میگے سر ماما چانن سنگھ آیا اور میرا ماما شمشیر سنگھ۔ دوپہر ڈھل گئی تھی اور اتم سنگھ کو شمشان لے جانا تھا۔

اور پھر وہ میرے شیر جیسے باپو کو بے بس جان کر اپنے کندھوں پہ اٹھا کر شمشان لے گئے میرا جی چاہتا تھا ایک بار اس کا چہرہ دیکھوں۔ وہ شکل جو پھر کبھی مجھے نظر نہ آئی۔ وہ آنکھیں، جن کا پیار اور نرمی پھر کسی آنکھ میں میں نے نہ دیکھی۔ عورتیں چھاتیاں پیٹ رہی تھیں۔ گلیوں میں دو دو چار چار کھڑی ٹوری تھیں یہ ساری رونق میرے باپو کے لئے تھی جس کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ جس دن اسے سشن کی عدالت سے رہائی کا حکم ملا ہو گا ہم دادی اور دھیان کو لے سارے گاؤں سے باہر اُسے لینے گئے تھے۔ اور گلیوں میں ایسی چہل پہل تھی۔ میری دادی کی کرپان لگتا تھا اور بھی لمبی ہو گئی ہے اور اس کا قد بڑھ گیا ہے۔ اس کے چہرے پر جلال تھا اور باپو کا گلا ہاروں میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی مونچھیں اکڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں غرور کا نشہ تھا اس دن تو مہر سنگھ کی بیوی ہمارے گھر مٹھائی دینے بھی آئی تھی اور سردار مہر سنگھ کی بیٹھک میں لالہ لوں کے کئی سردار برادری کے کچھ لوگ اور بھاگو کا باپ یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے گھر میں کوئی مر گیا ہو۔ اس دن سرداروں کے گھر کی مہریاں گھڑی گھڑی ہماری گلی کے پھیرے نہیں کرتی تھیں۔

پھر مہر سنگھ نے اپنی سفید گھوڑی پر چڑھ کر بڑے شہر کے پھیرے کرنے شروع کئے ہیں تو راہ کی گرد بھی تھک گئی اور آخر میں اس راہ سے جو نہر کے ساتھ ساتھ ہو کر لالہ کی گلیوں میں ختم ہوتا ہے لوگ میرے باپو کو کندھوں پر اٹھا کر میری دادی کے آنگن میں لے آئے جس آنگن میں اتم سنگھ کے لوٹ نہ دینے میں وہ روشنی رہی اور نہ ہی گلیوں میں وہ رونق۔

ٹھیک ہی تو ہے سنگھ میں برادری والے ساتھ نہ دیں پر دکھ میں تو ہر کسی کو آنا پڑتا ہے برادری جو ہوئی اور پھر کونسی اتم سنگھ کی شادی ہو رہی تھی کہ بلانے پر ہی جایا جاتا اور یہی سوچ کر جس دن مجھے پگڑی باندھی گئی ہے سردار مہر سنگھ بھی آیا ہوا تھا۔ میرے ماتھے اور دھیان والے سردار مالڑاں کے سارے لوگ اُسے قہر بھری نظروں سے گھور رہے تھے دانت پیس رہے تھے مگر کوئی اُسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس جگہ تمہارا کیا کام ہے۔ یہاں تک کہ مامے چانن سنگھ نے بھی دادی سے کہا ـــ "کاکی جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ جب تیرا بدلہ لینے والا ابھی کوئی نہیں تو تو ناحق برادری والوں سے خفا ہوتی ہے۔ ہر بات وقت پر اچھی لگتی ہے۔ میں نہیں کہتا یہ بات جانے دے پر کم از کم دلدار سنگھ کے جوان ہونے تک کا تو انتظار تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ دشمن اگر گھر دینے سے مر جائے تو زہر کیوں دیا جائے۔ مہر سنگھ اندر آ کر اتم سنگھ کا افسوس تجھ سے کرنا چاہتا ہے۔"

دادی نے مامے چانن سنگھ کی بات کاٹ کر کہا تھا ـــ "چانن ویر یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ میں تو راکھ بھی ہو جاؤں میری ہڈیاں بھی کوئی سرمہ بنا کر ہوا میں اڑا دے پر میں مہر سنگھ سے بدلہ ضرور لوں گی۔ اسے یہ ترس نہ آیا کہ انوپ سنگھ نے مجھے کون سا سکھ دیا تھا جو اتم سنگھ کو پھانسی دلا کر اس نے کمی پوری کر دی۔ میرے ہاتھ پیر سلامت ہیں مجھے کسی برادری کی ضرورت نہیں۔"

اور مامے چانن سنگھ نے دادی کے سر پر ہاتھ دھر کر ہولے ہولے کچھ باتیں کی تھیں جس پر دادی نے سر ہلا کر کہا تھا ـــ "اچھا تو میں صلح کر لیتی ہوں۔"

اور یوں ہمارے گھروں کا پھر میل ہوگیا۔ آہستہ آہستہ ہم لوگ سردار مہرسنگھ کے گھر آنے جانے لگے۔ کلدیپ کور مہرسنگھ کی چھوٹی بیٹی اور جنتی میری بہن بہت پکی سہیلیاں بن گئیں۔

اسے گھر میں سب دیپو کہتے تھے۔ وہ اپنے بھائیوں کی بڑی لاڈلی اور باپ کی سر چڑھی تھی۔ مگر بڑے گھروں کی لڑکیوں میں جو ایک خواہ مخواہ کی اکڑ ہوتی ہے وہ اس میں نہ تھی۔ ہولے بات کرنے والی، لمبے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی لال لال گلابی دیپو جب جنتی کے گڈے سے اپنی گڑیا کا بیاہ رچاتی تو میں ہی اس کی گڑیا اپنے کندھوں پر اٹھا کر اپنے گھر لاتا۔ ڈولی پر سے میں ہی روپے پھینکتا۔ میں سدا اس کی گڑیا کا باپو بنتا۔ میں عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا تھا اور وہ جنتی کے برابر تھی۔ مہرسنگھ کی بیوی مجھے کاکا کہتی۔ اور جب جنتی نے کہا ــــ " تائی جی یہ دلدار سنگھ ویر ہے "

تو سب مہریاں اور کماریاں زور سے ہنسنے لگیں اور دیپو نے اپنی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کر جیسے چڑانے کے لئے کہا ــــ " کیسے دلدار سنگھ ویر کہا "

اور جنتی روہانسی ہوگئی۔ پر وہ بیاہ شادیوں اور گڑیا کی بارات کے اور وقت کہاں ملتا تھا کہ دیپو اور جنتی کے کھیلوں میں شریک ہوتا۔ تاروں کی چھاؤں میں دادی اور میں گھر سے نکلتے اور سانجھ کو جب گھر آتے تو تھکن سے میں اس قدر چور ہوتا کہ روٹی کھائے بنا سو جاتا اور ماں بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر جگاتی اور مشکل سے دودھ کا گلاس پلاتی۔ اب وہ نیندیں کہاں گئیں۔

ایک ساون خوب کھل کر لگا تھا۔ روز گھٹائیں جھوم کر آتی تھیں اور بارشوں سے پنڈ کے کچی دیواریں ڈھے گئیں، اور بڑی نہر کناروں سے اچھلنے لگی۔ لڑکیوں نے دالانوں میں پینگیں ڈالی تھیں اور آنگن میں نیم کے سایوں تلے مست کرنے والی ہوا چل رہی تھی۔ جنتی نے اپنے پیپل کے بڑے ڈال کے ساتھ پینگ ڈالی تھی۔ محلے کی لڑکیاں اس کی سہیلیاں اور مہرسنگھ کی دیپو، سب باری باری جھول رہی تھیں۔ دیپو نے گہری پینگ والا

لال اور ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بالوں کی گندھی ہوئی چوٹی پلنگ بڑھاتے میں نہ جانے کس طرح رسّے کے ساتھ بل کھا گئی تھی۔ جب اس نے نیچے اترنا چاہا تو گرہیں نہیں کھلتی تھیں۔ پہلے جنتی نے پھر ایشر سنگھ کی بلبیر نے اور یہاں تک کہ میری ماں نے بھی کوشش کی۔ مگر دیپو کی چوٹی کھل نہ سکی۔

اس دن میں تہبند اونچا کئے گلیوں کے کیچڑ سے لتھڑے پاؤں جھاڑتا دادی کے بھیجنے پر گھر آیا تھا۔

کوئی کام تھا۔ اتنے دنوں کے بعد یاد نہیں پڑتا کہ کیا بات تھی مگر دادی نے کہا تھا "دلدار سنگھ بس لڈی کی طرح جا اور آندھی کی طرح واپس آ۔ میں یہاں انتظار کرتی ہوں۔"

گھر آیا ہوں تو سب سے پہلے میری نظر دیپو پر پڑی۔ جو بڑی بے بسی سے پلنگ کے رسّے کے ساتھ لگی رو رہی تھی اور باقی لڑکیاں حیران تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں۔ جنتی چپ کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی "ویر میرے سوہنے ویر ذرا ادھر آکر دیپو کا پراندہ تو کھول دے۔ بیچاری نہ جانے کس طرح پلنگ کے ساتھ لپٹی گئی ہے۔"

دیپو نے بھی آنکھیں اٹھا کر بڑی منت اور التجا سے میری طرف دیکھا۔ ماں مکھن کر کے گھی بنا رہی تھی۔ دور سے بولی "دے دلدار سنگھ ذرا لڑکی کی چوٹی تو کھول، کس طرح رسّے سے لپٹ گئی ہے کھلتی ہی نہیں۔ میرے ہاتھوں میں تو ذرا بھی سکت نہیں۔ میں تو ہار گئی ہوں۔"

میں اور دیپو اتنے پاس پاس کھڑے تھے کہ میں اس کے سانس کو اپنے منہ پر لگتے محسوس کر رہا تھا۔ دھرتی میں سے بارش کے بعد ایک سوندھی اور میٹھی سی خوشبو نکلا کرتی تھی یہ شگفتہ تو ویسی بھی نہ تھی اناج کی بہتی ہوئی اور کھیت سے کھیت تک پھیلی ہوئی مہک تھی، گنوں کے تازہ رس اور پکتے گڑ، کسی میں ایسی مٹھاس ہوتی تھی یا نوکھی خوشبو میرے سانس میں رچ گئی۔ میرے خون میں ایک گرم دھارا سا مل گیا۔ مگر میں نے دیپو کی طرف نہیں دیکھا مجھے معلوم تھا، وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور یوں بل اس کی اداسی خوشی میں بدلتی گئی ہوگی۔

پہلے اس نے سکھ کا سانس لیا ہوگا پھر اس کی آنکھوں سے وہ مایوسی اور منت چھپی ہوئی ہنسی میں ڈھل گئی ہوگی۔ ہر کھلتی گرہ کے ساتھ اس کے سانس میں خوشبو اور زیادہ بڑھتی گئی اور وہ ٹھگ دُور ہوتی گئی۔ آخری گرہ کھلنے پر اس نے زور سے کہا ـــــ "شکر ہے"
اس کے لال لال پاؤں زمین پر آ لگے۔

اور آج بھی مجھے پکا یقین ہے کہ عورت میں ایک خوشبو ہوتی ہے جو بس ایک مرد ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ایک ایسی خوبصورتی جسے صرف ایک مرد کی آنکھیں زندگی میں صرف ایک بار دیکھ سکتی ہیں۔ اور پھر وہ ساری لالی جو لڑکے گاؤں میں ہوتی ہے، وہ سیاہی جو اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ چمک جو اس کے پاؤں میں ہوتی ہے اس ایک گھڑی میں گھل مل کر اس دوسری زندگی کو اتنا بے چین کر دیتی ہے اور اتنا دھیما کہ نہ تو وہ درد کبھی بھولتا ہے اور نہ وہ دکھ بھی کم ہوتا ہے بلکہ رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ تب لاکھ جتن کرو، لاکھ اپنے آپ کو کام میں لگانے کی کوشش کرو، خاندان کی آن، بدلے کا خیال، اپنی قسم کی یاد اور دادی کی مجبوری، ماں کی بے بسی یہاں تک کہ اپنا اکیلا پن بھی سامنے ہو پھر بھی وہ خوشبو بھلائے نہیں بھول سکتی اور آسیب بن کر تن من کی آگ تک، یہاں تک کہ موت کے بعد بھی پیچھا کرتی ہے۔

میں واپس لوٹا ہوں تو میرے قدم یوں ہلکے پڑ رہے تھے جیسے میں کیچڑ بھری گلیوں میں نہیں پھولوں کی سیج پر چلتا آتا ہوں۔ میں گاؤں سے نکل کر تیز بھاگ رہا تھا جیسے میرے کندھوں پر پنکھ لگ گئے ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا زور زور سے گانے لگوں اور اتنا ہنسوں کہ پیٹ دُکھنے لگے۔

جب بتیاں لگی تھیں تو جنتی اور دیپو ایک ہی رنگ کی چنریاں اوڑھے رنگین چڑیوں کی طرح خوش خوش گاتی اور ناچتی پھر رہی تھیں۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں اور برادری کی جوان بہوئیں نئے نئے کپڑے رنگ برنگ جوڑے پہنے گھوم رہی تھیں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، دوپٹوں میں گہرے رنگ ڈالے انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے آکاش سے

سات رنگوں والی پتنگ اتر کر چل پھر رہی ہے۔ لالٹین کے سرداروں کی بڑی بڑی آنکھوں اور اونچے قد والی بہوئیں ذرا منہ دبا کر ہنستی تھیں، دلہنیں لال جوڑے پہنے تھوڑے تھوڑے گھونگھٹ ماتھے تک کھسکائے اپنی نتھوں کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹا کر دوسرے ہاتھ سے مٹھی والے امرود اور تیل میں تلی مرچ مصالحے والی چیزیں کھا رہی تھیں اور عورتوں کی طرح اٹھلا کر چلتی تھیں۔ مائکے میں آئی ہوئی لڑکیاں دوپٹوں سے بے خبر آزاد اور بے فکر چلیں۔ گوری سہیلیوں کے گلوں میں بانہیں ڈالے اپنے اپنے سسرال اور سرداروں کی باتیں کرتی ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں کیسی کیسی لہریاں اور لمبا بیاں سرداریوں کے دیئے ہوئے کپڑے پہنے ڈھولک بجاتی گیت گاتی پھرتی تھیں، چھوٹے چھوٹے بڑے سنوں کے پلو پیچھے سے پکڑے گوری گوری ضد کرکے چیزیں مانگ رہے تھے آدمی تو اس طرف سے گزر نہیں سکتے تھے مگر ہری ہری دوب پر چرتی بھینسوں کے پیچھے پیچھے چھوٹے چھوٹے رکھوالے لڑکے آج بھینسوں کو بھول کر اونچے ٹیلوں پر چڑھے دور ہی سے میلے کی بہار دیکھ رہے تھے۔ کئی سوائیاں گھر سے میٹھی روٹیاں پکا کر لائی تھیں اور اس میلے میں بیٹھی کھا رہی تھیں۔

ہوسلے ہولے بادلوں کے پیچھے سے سورج نکل آیا اور برساتوں کی چاشنی کی دھوپ ٹک کر پڑنے لگی بھاری جوڑوں میں مٹیاروں کو پسینے آنے لگے اور وہ لال رومال نکال کر سر سے دوپٹوں کو ہٹا کر پسینہ پونچھتیں اور ایک دوسری سے گھنگرو لگے پنکھے مانگ کر جھل رہی تھیں۔ ناچنے والی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی چوٹیاں کھل گئی تھیں اور دھوپ کے باوجود پھوپھرا اور پھر تالیوں کی زور زور سے ہنسنے کی آوازیں جانے کا ارادہ کرنے والوں کے دل پھیر دیتیں۔ کالے بادل دھوئیں کی طرح اوپر ہی اوپر چکروں میں اڑنے لگے اور ٹھنڈی ہوا ایسی لالٹین سے اڑا کر کہیں اور لے گئی۔

جنتی گھر آئی ہے تو بڑی اداس تھی۔ اس دن میرے پاؤں میں لمبا سا کانٹا چبھ گیا تھا اور دادی نے مجھے کہا تھا کہ میں گھر پر ہی رہوں۔ جنتی کے ساتھ اس کی لوتی بہو

نہ بھی۔ دیپو بھی نہ تھی اور الیسٹرے کی بلیر بھی نہیں۔ ماں نے پوچھا ”چنتی تجھے کیا ہوا ہے۔ میلے میں کسی سے لڑائی ہوئی، کہ دیپو سے خفا ہو گئی ہے تو؟“

پر اس نے ماں کی کسی بات کا بھی جواب نہ دیا۔ میری طرف منہ کرکے بولی ”ویر کیا ہمارے باپو کو دیپو کے باپو نے پھانسی پر چڑھوایا تھا؟“

میرا سانس سینے میں رکنے لگا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں بولی۔ ”کس نے یہ بات کہی ہے تجھ سے؟“

کہنے لگی ”آج میری اور بلو کی لڑائی ہو گئی“ میں نے کہا ”بس تو چھت اور دیپو سے نہ بولا کر“

اس نے کہا ”بڑی آئی دیپو کی سہیلی، بے شرم کہیں کی، تجھے اتنا نہیں پتہ کہ تیرے باپو کو دیپو کے باپو نے پھانسی پر لٹکوایا ہے۔ بہت سہیلی بنتی ہے دیپو کی بے شرم ...“ ویر سچ سچ اگر اس کے باپو نے میرے باپو کو مروایا تھا تو میں اس سے کبھی نہیں بولوں گی۔ میں اس کی سہیلی نہیں رہوں گی۔ چاہے ہم نے کتنی ہی پکی قسمیں کیوں نہ کھائی ہوں کہ ہم ساری عمر ایک دوسرے کو نہیں چھوڑیں گی پر میں اس سے کبھی نہیں بولوں گی کبھی بھی نہیں!“

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نظر پر بس دیپو کی صورت ابھر رہی تھی۔ پھر دور جیسے کوئی شے دھندلی سی نظر آئے مجھے بلو یاد آ رہا تھا جیسے ہم جیل خانے جا کر سدا کے لئے وداع کر آئے تھے، تین سال پہلے کا اپنے آنگن میں سیاپا یاد آ رہا تھا اور دادی کی شکل میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی جس نے کہا تھا ”چاہے میری ہڈیاں بھی سر مہر بار ہوا میں اڑا دو مگر میں دھرم سنگھ سے بدلہ ضرور لوں گی“

اور باپو کی بات جب اس نے کہا ”عورت کا بدلہ عورت ہو گی“

چنتی پھر بولی ”ماں تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ ویر دلدار سنگھ کچھ تو بول۔ یہ بات

یہ سچ ہے کیا کہ دیپو کے باپ مہر سنگھ نے میرے باپو کو پھانسی پر لٹکوایا تھا؟"

ماں رونے لگی اور زور زور سے بین کرنے لگی۔ میں پریشان ہو گیا اور جنتی گھبرا کر گھر کے دالانوں میں پھرنے اور چیزیں سنبھالنے لگی اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے

بہت دنوں کے بعد دیپو ہمارے گھر آئی۔ بڑی اداس اور بہت ڈری ہوئی کہنے لگی ــــ "جنتی تو میرے ساتھ کیوں نہیں بولتی۔ بلو کی باتیں سب جھوٹ ہیں۔ تو میری پیاری سہیلی ہے میرے ساتھ بول۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

مگر جنتی تو جیسے پتھر کی ہو، ذرا بھی تو نہ ہلی اس نے اٹھ کر دیپو کے گلے میں بانہیں نہیں ڈالیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا کہ آخر دیپو نے کیا قصور کیا ہے کہ جنتی اس سے نہیں بولتی۔ جنتی نے سدا کی طرح اسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا اور نہ ہی ہنس کر دوہری ہوتی ہوئی اسے اندر کوٹھری میں لے گئی۔

پھر دادی نے جیسے اس کی آواز پتھر کے اندر سے نکل رہی ہو کہا "کلدیپ کور کوئے بیٹھ جا۔ نی جنتی سہیلی کے ساتھ بول۔"

اور جنتی نے دادی کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے کھا ہی تو جائے گی اور پھر دیپو کا ہاتھ پکڑ کر اسے دالان میں لے گئی۔ پر اس بات کے بعد سے جنتی کا دل دیپو میں کبھی نہ لگا۔ ان کی ہنسی جو دالان میں گونجا کرتی تھی اب مدھم پڑنے لگی۔ میری بہن اب گھر ہی میں رہتی اور ماں کے برابر چرخہ رکھ کر سوت کاتتی یا جب دادی فارغ ہوتی تو اس کے سر سے جوئیں نکالتی۔ اس کی باتیں اب بہت کم سنائی دیتیں۔ وہ یکایک بڑی ہو گئی تھی دیپو آتی تو چار گھڑی بیٹھ کر چلی جاتی اور جنتی سے بہت بہت تاکید کرتی کہ ــــ "تو ضرور ہمارے گھر آنا، تجھے میری قسم ضرور آنا۔"

مگر جنتی ہنس کر رہ جاتی اور ماں کے کہنے کے باوجود کبھی ان کے ہاں نہ جاتی، پھر دیپو بھی کم ہی آنے لگی، ور اگر آتی تو میں کھیتوں پر ہوتا اور رات کو کبھی ماں اور کبھی جنتی بتاتیں کہ آج دیپو آئی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمارے ہاں کم ہی آیا کرتی تھی

دادی بہت شوق سے اس کا ذکر کرتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کے ذکر میں دلچسپی ظاہر کروں کہ نا۔ ورنہ میرا خون تو تیزی سے دل کی طرف جانے لگتا تھا اور کان سُرخ ہو جاتے تھے جب کبھی میں دیپو کی بات سنتا۔

پھر ہم نے سنا کہ دیپو کے ویر جو بڑے شہر کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں سردار مہر سنگھ پر زور دے رہے ہیں کہ دیپو کو بھی اسکول میں داخل کر دیا جائے وہ بھی میموں سے پڑھے گی اور کتابوں میں سے نئی نئی باتیں سیکھے گی۔ یہ بات سن کر سوائے چنتی کے سب نے کچھ نہ کہا۔ دادی بولی ــــ "بس اسی بات کی کمی رہ گئی تھی۔ سرداروں کی شان لڑکی کے اَن پڑھ رہنے بھلا کہیں پوری ہوتی ہے۔"

ماں نے کہا ــــ "لالڑاں کی لڑکیاں میمیں نہ بنیں گی تو سردار مہر سنگھ کس طرح مونچھیں مروڑ کر بیٹھک میں بیٹھے گا؟"

پھر سنا بڑے شہر سے ایک میم مہر سنگھ کے گھر پر رہنے اور دیپو کو پڑھانے آنے والی ہے۔ تب برادری کے اور پرائے سب لوگ کہنے لگے ــــ "سردارنی کردار کور دھیان پور والوں کی بیٹی تھی ماں۔ اور یہ سنگھ کا دیا ہوا دکھ پی گئی۔ مگر سردارنی پرائی عورت کا دکھ کس طرح سہہ سکے گی۔ ولایت کی میمیں عورتیں نہیں ڈائنیں ہوتی ہیں اور چٹکیوں میں مردوں کا اپنے ہاتھ میں کر لیتی ہیں۔"

سر روز سی نئی باتیں سننے میں آتیں۔ کبھی برادری کی کوئی عورت گھر آ کر ماں سے قصّہ کہہ جاتی، کبھی پھوپھی . . . سردراتوں کو مل کر چرخہ کاتتے میں سو بیٹیاں ایک دوسرے سے باتیں کرتیں پر پورا گاؤں دل تھامے اس میم کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ پھاگن آ گیا۔

میں اور دادی یوں بھی سارا وقت کام میں لگے رہتے تھے کھیتوں میں ہر طرف ہریالی تھی۔ فصلیں لہرا دیتی ہو گئیں اور درخت آدھے آدھے اس ہریالی میں ڈوب گئے۔ میں رہٹ چلاتے گاڑی پر بیٹھا عجیب عجیب سپنے دیکھتا ایسی باتیں جو

نہ ہو سکتی تھیں اور جو کبھی میرے نصیب میں نہ تھیں ۔ بیل تھک جاتے اور کھڑے ہو جاتے مگر مجھے خبر نہ ہوتی ۔ دادی اگر قریب ہوتی تو آواز دے کر کہتی ــــ "دلدار سنگھا! بیٹ کیوں نہیں چلاتا۔ کیا سوچ رہا ہے ؟" اور اگر وہ دُور ہوتی تو بیلوں کی دُمیں مجھے لگتیں، جو وہ مکھیوں کو اڑانے کے لئے اپنے گرد مارتے ، نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا ۔

پھر ایک دن شام کو جب دادی دیے میں تیل ڈال کر بتی بٹ رہی تھی ، ماں چولہے میں میٹھی اپلوں کی آگ پر روٹیاں پکا رہی تھی اور سیلے اپلوں کے دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا جیتی چاٹی میں سے ملائی ہٹا کر دودھ کا گلاس نکال رہی تھی کہ گیانی جی کے گھر سے آنے تو ہماری سفید بطخیں کٹ کٹ کرکے بھاگیں اور دروازے میں کسی کے ہائے ہائے کرنے کی آواز سنائی دی تو میں نے توکے کو ہاتھ سے رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا ۔ دیپو بطخوں سے ڈرتی سہمی کھڑی تھی نہ آگے جاتی تھی اور نہ ہی پیچھے اور بطخیں لمبے سفید پر پھیلائے گردنیں بچھی کئے اسے کاٹنے دوڑ رہی تھیں ۔ ہمارے آنگن میں دن کی بارش کی وجہ سے پانی ، دھرگوبر اور گائیوں کے موت کی سڑاند بھرا کیچڑ پھیلا تھا ، صرف پاؤں دھونے کی جگہ تھی جو شام کے دھندلکے میں دکھائی نہ دیتی تھی ۔ دیپو نے باریک ململ کا جسے دادی سندر کی ململ کہا کرتی تھی ، دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس کے کنارے گہرے سبز رنگ کے تھے جیسے پھاگن کی ساری بہار نے مل کر اسے رنگا ہو ۔ میں نے اسے ایک سال بعد دیکھا تھا اور اس ایک سال میں اس نے کتنا رنگ نکالا تھا جیسے آم کے جوان پودے کی نرم چکیلی سرخ ہو ۔ مجھے دیکھ کر وہ شرم سے سرخ ہو گئی یا یہ شام کی سرخی تھی جو اندھیرے میں بادلوں کے رنگ میں گھلی ابتک آسمان پر کھڑی بھیگی ہوئی زمین دیکھ رہی تھی میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا ۔

پھر دادی کی آواز آئی ــــ "دلدار سنگھ ! بی بی کلدیپ کور کو اندر لے آ ! ذرا پیر سنبھال کر رکھنا بیٹی ۔ کہیں گارے میں پھنس نہ جائے ۔ یہ خصم کھانے بادل بھی کیا بے وقت آئے بھلا ۔ سال کے ان دنوں بھی کبھی برکھا ہوتی ہے ؟"

میں کلدیپ کو راہ بتانے لگا اور کیچڑ میں ڈسے وہ ذرا ذرا سے قدموں کے نشان دکھائی نہ دیئے جہاں جگہ سوکھی تھی۔ جب اس کا ایک پاؤں غلط جگہ پڑ گیا تو اس نے سِیر ہائے کی اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دالان میں لاکر جنتی سے کہا — "لے بھئی جیت کو تیری سہیلی اُدھر کیچڑ میں پھنس گئی تھی میں اسے بڑی مشکلوں سے کھینچ کر نکال کے لایا ہوں۔"

دیپو نے مجھے نیچی نگاہ سے ہی دیکھا۔ ان آنکھوں میں بجلی کی چمک تھی اور مسکان تھی جس کا میٹھا پن نہ جانے کیوں میرے جی کو اُداس کر گیا۔ میں اپنی جگہ پر جاکر اسی طرح ٹوکے سے چارہ کترنے لگا۔ ٹوکے کے شور میں مجھے کوئی آواز بھی نہ سنائی دی۔ شام کے پہلے پن میں سُرخی اور اندھیرا ڈوب چکے تھے۔ پچھم کی طرف اکیلا تارہ جگمگ کر رہا تھا اور اس کے بعد کئی اور تارے نکل آئے جیسے کسی نے کھیت میں موتی بو دیئے ہوں۔

جب دادی نے مجھے آواز دی کہ آکر روٹی کھا لوں تب بھی دیپو جنتی کے پاس اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکائے دیئے کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی۔ لو کا کانپتا ہوا عکس اس کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا اور اس کے بال سونے کے لگتے تھے۔ اس کے چہرے پر خوشبو سے بوجھل ایک خوشی تھی جو ہونٹوں کے کناروں سے سُرخ گالوں کی طرف ہولے ہولے پھیلتی اور سمٹ جاتی۔

میں اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ ماں نے میرے ہاتھ دھلائے اور روٹی کا تھال اٹھا کر بھاجی والی کٹوری مجھے پکڑا دی مجھے لگتا تھا پشت پر اس کی نگاہیں دہکتے لوہے کی طرح سُرخ ہیں جیسے وہ مہارانی ہو اور مجھے داغ دے رہی ہو کہ عمر بھر اس کا چاکر رہو۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی وہ جنتی سے کہہ رہی تھی — "اچھا جنتی پھر میں چلتی ہوں سویرے ہی سویرے میں اپنے بڑے ویر کے ساتھ شہر چلی جاؤں گی۔"

دادی نے کہا — "اچھا بی بی واہ گرو نصیب چنگا کرے۔ پڑھنا کوئی بُری بات تو نہیں نا۔ گرنتھ صاحب سمجھنا آجائے گا۔ شبد آپ گا سکے گی۔" اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی — "اگر اس کا بابو زندہ ہوتا تو میں بھی جنتی کو کچھ خط پتر لکھنے کے قابل کر دیتی پر اس کے سر پہ تو بس اس چھوٹے سے ویر کا سایہ ہے۔ واہگرو کرے یہ خیر خیر سے اٹھ کر اپنی

سسرال جائے۔"

میرے منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا اور بھاجی کا کٹورہ میرے ہاتھ میں آگ کا انگارہ بن گیا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے باپو کی صورت دکھائی دی جو کہہ رہی تھی "عورت کا بدلہ عورت ہو گی اور جنتی تیری بہن ہے اس کا خیال رکھنا۔ اس کو کسی اچھے گھر بیاہنا۔ میری جنتی تیرے سپرد ہے۔"

اور تب مجھے پتہ لگا کہ جنتی بیاہنے کے قابل ہو گئی ہو۔ میں دلدار سنگھ ویر ہی نہیں اس کے باپ کی جگہ بھی ہوں۔ مجھے ابھی زندگی بھر ان فرضوں کو نبھانا ہے جو باپ کے مرنے سے میرے ذمہ لگ گئے ہیں۔ میں نے لمبے گلاس میں سے دو تین گھونٹ کر کے پانی پیا اور روٹی رکھ کر کسی طرف دیکھے بنا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دادی پیچھے سے آواز دیتی رہی۔

"—— دلدار سنگھ، دے دلدار، پوت بات تو سن۔ روٹی تو تو نے کھائی ہی نہیں۔"

ماں کی آواز مجھے گلی میں سنائی دیتی رہی —— "پتہ نہیں کہاں گیا ہے۔ روٹی تو دو نوالے کھائے ہیں اس نے۔"

دوسرے دن میں نے سنا دیبو اپنے سنت سے بڑے ویر گجندر سنگھ کے ساتھ شہر چلی گئی اور یہ پتہ نہیں کب واپس آئے گی۔ لائلپور کے سرداروں کی یہ پہلی لڑکی تھی جو بڑی نہر کے ساتھ والے راہ پر اپنے ویر کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ کر اور پھر وہاں سے گاڑی میں بڑے شہر گئی تھی۔ عورتیں کہتیں —— "سردار دھر سنگھ نے اپنی دیبو کو شہر بھیج دیا ہے وہاں میموں کے ساتھ رہے گی اور ان کی بات کیا کرے گی۔"

کماریاں دھریاں کہتیں —— "واہگرو جانے کپڑے کس طرح کے پہنے گی۔ میں نے تو سنا ہے میمیں توبہ توبہ ننگی رہتی ہیں۔ بس صرف ایک کرتا پہنتی ہیں جیسے ہمارے یہاں سو دائی مائی پہنتی ہیں۔ ہائے ہائے کیا مت ماری گئی ہے جو گجندر سنگھ کی۔ بھلا آدمی تو پڑھیں پر یہ لڑکیوں کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ گیانی جی سے کچھ سبدھ بدھ کر دو لیتے اتنا ہی شوق تھا لڑکی کو پڑھانے کا تو میموں سے پڑھانا کیا ضروری تھا۔"

پھر جب ہم گندم کاٹ رہے تھے اور میں اور دادی سارا سارا دن کھیتوں میں مصروف رہتے تھے۔ ماں کام کرنے والوں اور دوسرے مدد کرنے والے چاکروں اور مزدوری پر کام کرنے والے چاروں کماروں کے لئے روٹیاں پکا کر لاتی اور ہماری دو ہی بھینس، سفید گائے اور دونوں کالی بھینسوں کے دودھ کی لسی بھی کم پڑ جاتی، شہر سے ڈیپو کا خط میری بہن چنتی کے نام آیا۔

چنتی نے مارچ میں آٹھویں پاس کی تھی اور ریوپیال رکھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے پیارے خواب بُن رہی تھی جب گاؤں کے مدرسے کا ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا ـــ "یہ خط منشی جی نے دیا ہے۔"

چنتی بار بار الٹ پلٹ کر کاغذ کو دیکھتی اور رکھ دیتی۔ پھر شام ہو گئی۔ میں اور دادی تھکے ہارے گھر آئے۔ ہمارے ایک بیل کے پاؤں میں ورم ہو گیا تھا ماں اس کے لئے دوائی گھوٹ رہی تھی۔ جب چنتی نے ہولے سے میرے پاس آ کر کہا ـــ "ویر دلدار سنگھ پتہ نہیں یہ کیسا کاغذ ہے۔ مدرسے کے منشی نے بھیجا ہے ایک لڑکا دے گیا ہے۔"

میں نے کاغذ ہاتھ میں لیا تو میرا دل زور سے دھڑک اٹھا اندر سے کسی نے کہا یہ اسی بھارتی کا ہے جس کے تم چاکر ہو۔ میری کمر پر اس کی نگاہیں میٹھی چبھن سے تیر رہی تھیں۔ مجھے شام کے اس پیلے دھندلکے میں نہ جانے ڈیپو کیوں یاد آ رہی تھی۔

میں روز کی طرح دودھ کا گلاس لئے گیانی جی کے گھر پہنچا ہوں تو وہ شبد پڑھ کر دو چار آدمیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ دودھ اندر پکڑا کر میں بھی وہیں بیٹھا۔

پھر ان آدمیوں نے ست سری اکال کیا۔ جانے لگے تو مجھ پہ بھی نظر پڑی کہنے لگے ـــ "یہ اپنے اتم سنگھ کا لڑکا دلدار سنگھ تو نہیں؟" گیانی جی بولے ـــ "بالکل بالکل!"

انہوں نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولے ـــ "سکھ سے جوان ہو گیا ہے یہ تو۔ بیچاری دادی کے ساتھ اب کچھ نہ کچھ تو مدد کرتا ہی ہو گا نا۔"

اور گیانی جی بولے ـــ "جی دلدار سنگھ جیسے پوت تو واہگرو ہر ایک کو دے اس نے

دادی اور ماں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دی کبھی ہشیر پوت ہے شیر۔"
اور انھوں نے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔ اور پھر جانے والوں نے کہا — "بھئی دلدار سنگھ سردار جی کرتار کور کو ہمارا ست سری اکال کہہ دینا۔ ہم کسی دن پھر آئیں گے۔"
اور وہ چلے گئے۔ میں نے کہا — "گیانی جی یہ کاغذ کیسا ہے پڑھ تو دیں۔" گیانی جی نے مجھے اور عینک پہننے کے لئے بھیجا پھر دیا منگوایا اور بولے — "بھئی یہ کنہیا کور کا پتر ہے جسونت کور کے نام، کہ وہ سکھ شانتی سے ہے اور چھٹیاں ہونے والی ہیں وہ جلدی ہی گھر آئے گی۔ پھر اس نے سب گھر والوں کو ست سری اکال لکھا ہے۔"
مجھے لگا دئے کی روشنی بڑھ کر چاند بن گئی ہے۔ ایسے دلیسوں کے سپنے میرے دماغ میں گھوم گئے جو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ خون پھر سے رگوں میں تیر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے گیانی جی سے کاغذ لے لیا اور گلیوں میں تقریباً بھاگتا ہوا جب اپنے دروازے میں گھسا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں دھپ سے پلنگ پر گر پڑا اور زور سے بولا — "جیتی یہ تو دیپو کا خط ہے، بڑے شہر سے آیا ہے۔"
دادی نے کہا — "کیوں دلدار سنگھ، تجھے سانس کیوں چڑھی ہوئی ہے۔ کیا بھاگ کر آیا ہے؟"
میں نے کہا — "دادی وہاں پچھلی گلی سے ایک کتا میرے پیچھے بھاگا تھا۔"
جیتی زور زور سے ہنسنے لگی اور بولی — "واہ ویر بس کتے سے ڈر گئے۔"
اور ماں بولی — "نہ جانے کیسا کتا ہو۔ کس زور سے ہنس رہی ہے گھوڑی کی طرح، چپ کر۔"
اس دن لگا ہے کے بعد ہم گیہوں کے وہل لگا رہے تھے جب دور نہر کی راہ پر دو چمکتے جسموں والی گھوڑیوں کے ساتھ ساتھ چھار دوڑ رہے تھے۔ دادی نے کام

کرنے کرتے ہاتھ ماتھے کے اُوپر رکھ کر آنکھوں پر پردہ دے کر اُدھر دیکھا اور کہنے لگی ــــ "یہ ضرور مہر سنگھ کے گھوڑ سواریاں ہیں۔ سفید گھوڑیاں سارے لالڑاں میں کیا سارے ماجھے میں انوپ سنگھ کے پاس تھیں یا مہر سنگھ کے پاس"۔

اور پھر اس نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے دل کے اندر کوئی شے ٹٹول رہی ہو۔ میں نے گھبرا کر نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ اور دادی بھی یوں کام پر لگ گئی جیسے دیہات کے گاؤں میں آنا معمولی بات ہو۔

ہوا میں آم کے درختوں کے بور کی خوشبو تھی اور بوہڑ کی تازہ تازہ سوندھی باس تھی اور پھر بیرے سے بھرے پانی کی ذرا سی نمی تھی۔ رہٹ چل رہا تھا اور اس کی روں روں میں مجھے دنیا کے سارے راگوں کے سُر ملے ہوئے جان پڑتے تھے۔ راستے میں غبار اُڑ رہا تھا جو ڈوبتے سورج کی کرنوں میں سنہرا لگتا تھا۔ لوگ اپنے ڈھور ڈنگر ہانکتے سروں پر چارے کے گٹھے لادے یا بھینسوں کی پیٹھ پر رکھے ہوئے ہوئے گھروں کو جا رہے تھے اور راستے میں ماہیا گاتے جاتے تھے۔ ان کی آوازیں شام کے دھندلکے اور سنہرے غبار میں لپٹی بادلوں کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی لگتی تھیں اور رات کا سونا پن سورج کی لالی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس وقت جب ہم روٹی کھا کر دیا بجھا چکے تو دادی نے کہا ــــ "کیوں دلدار سنگھ پھر وہ بات کس طرح ہو گی؟"

"کون سی بات دادی؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی مہر سنگھ سے بدلہ لینے کی، تو اب جبر سے جوان ہو گیا ہے۔ میں لالڑاں میں کب تک سر نیچا کر کے چلوں گی اور لوگوں کے طعنے برداشت کروں۔ کوئی راہ سوچ"۔

"اچھا دادی"۔ اور پھر ساری رات میں برے برے سپنے دیکھتا رہا۔ میری آتما نہ جانے کیوں اتنی بے چین تھی۔ دیوالی آ گئی تھی، اور پھر بھی میرا جی اداس تھا۔ آخر کیا ہو رہا تھا مجھے۔

دوسرے دن دادی کھیت پر کسی بیوپاری سے بھاؤ کر رہی تھی، جب میں اسے چھوڑ کر کسی بہانے گھر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا دیپو آئی ہے تو جینتی سے ملنے دوپہر سے پہلے ہی آئے گی۔ راہ میں ماں مجھے... روٹی لے جاتی ملی۔ اس نے درخت کے سائے میں بیٹھ کر مجھے لسی کا گلاس پلایا اور پوچھنے لگی ـــ "کیوں دلدار سنگھ گھر کس لئے جا رہا ہے ؟"

میں نے بہانہ کر کے اسے بھی ٹال دیا۔ گھر میں گھسا تو دیپو اکیلی دالان میں بیٹھی تھی۔ میں نے کہا ـــ "ست سری اکال، جینتی کہاں ہے ؟" بولی ـــ "میں نے مہری کو اسے بلانے کے لئے بھیجا ہے، میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ ادھر بلو کے گھر سے اس کی آواز آ رہی ہے اکیلی ہو گی نا۔ بلو کے پاس چلی گئی ہو گی۔"

میں نے کہا ـــ "تمھاری اور بلو کی تو لڑائی ہو گئی تھی۔ کہو اب صلح ہوئی کہ نہیں؟"

وہ شرم سے سرخ ہو گئی اور بولی ـــ "وہ تو کئی سال پہلے کی بات ہے کہیں سہیلیاں بھی لڑا کرتی ہیں کبھی ؟"

پھر میں نے بلو کو اور جینتی کو مہری کے آگے آگے آنگن میں گھستے دیکھا۔ وہ تیزی سے آ کر دیپو سے لپٹ گئیں۔ جینتی نے ہنستے ہوئے گھوم کر مجھے پوچھا ـــ "کیوں ویر اس وقت تو کس طرح آیا ہے کوئی کام ہے کیا ؟" میں نے کہا ـــ "مجھے باپو والی درانتی لا کر دے۔" جینتی ہنستے ہنستے چپ ہو گئی۔ اور دیپو اتنی زرد ہو گئی مانو اس میں لہو کی ایک بوند بھی نہ ہو۔

پھر بلو نے کہا ـــ "دلدار سنگھ فصلیں تو کاٹی گئیں میرے باپو نے درانتیاں لا کر کوٹھی میں رکھ دی ہیں۔ تو کس لئے درانتی مانگ رہا ہے ؟" پھر جینتی اور بلو جلدی جلدی درانتی ڈھونڈنے لگیں، مہری واپس چلی گئی۔ میں اور دیپو دالان میں اکیلے رہ گئے۔

اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سفید تھے۔ وہ پلنگ پر یوں بیٹھی تھی جیسے اب گری کہ گری۔ ان دو تین مہینوں کے عرصے میں اس کی آنکھیں اور بڑی ہو گئی تھیں

اور بالوں میں چمک اور زیادہ آگئی تھی جیسے پکنے پر رستے ہوئے آم کی ہوتی ہے اس نے بڑی خوبصورت جوتی پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے سفید پاؤں اور سرخ ایڑیاں اور اچھی لگتی تھیں۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا پلکیں آنکھوں پر جھکائے وہ دوپٹہ کو نامر وڑ رہی تھی اور کوٹھری کی طرف دیکھ رہی تھی پلکوں کی جھالر اس کے زرد چہرے پر بادل کی سیاہی کا ذرا سا ٹکڑا لگتی تھی۔

میں نے زور سے کہا ـــــ "جنتی مجھے جلدی جانا ہے۔ درانتی لا کر دے۔"

انسان کتنا بہروپیا ہے حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ وہاں سے کبھی نہ جاؤں۔ دیپو نے وہ سیاہ جھالر اٹھا کر میری طرف جھانکا جیسے کوئی بہارانی اپنے جھروکے میں سے کسی چاکر کی طرف دیکھے۔ پھر اس نے بھی بلو کی طرح پوچھا ـــــ "آج کل تو بول لگ رہے ہیں تجھے کیوں درانتی کی ضرورت آپڑی؟"

میں نے کہا ـــ "ہماری درانتیوں کے دندانے تیز نہیں ہیں۔ میں نے کل شام کھوہ سے آتے ہوئے ماشے کیشو کی دوکان پر دے دی تھیں۔"

اندر سے جنتی اور بلو آئیں۔ جنتی کے ہاتھ میں درانتی تھی اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اس نے دیپو کی طرف دیکھے بنا مجھے کہا ـــــ "دیر لے یہ باپو کی درانتی ہے۔" اور پھر اس کی آنکھوں میں غصے اور دکھ کے آنسو آگئے۔

اس کے بعد جنتی نے دیپو سے بولنا بالکل چھوڑ دیا۔ جس دکھ کو ہم پہلے برداشت کر چکے تھے وہ اب اس کے لئے نیا ہو کر جاگ رہا تھا۔ وہ کسی سے بھی نہ بولتی۔ مٹی کی مورت بنی چرخہ کاتتی یا نالے کی پٹاریاں بناتی رہتی یا چپ چاپ بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ اگر اس کی سہیلیاں اسے کھینچ کر لے جائیں تو بے بسوں کی طرح کھنچتی چلی جاتی پر وہاں بھی ہنستی بولتی کم ہی تھی۔ رات کو گاؤں سے باہر ساری بہو بیٹیاں ناچتیں اور اُدھم مچاتیں اور یہی بات کرتیں کہ ـــ "دیپو میموں کے سکول میں پڑھتی رہی ہے نا اس لئے جنتی سے نہیں بولتی۔"

ایک کہتی —— "پڑھی لکھی ہے نا مزاج بڑے ہوئے ہیں۔"

پھر ہولے ہولے لڑکیاں کہتیں —— "اسے پتا ہے کہ اس کے باپو کو سردار مہر سنگھ نے پھانسی کروائی ہے۔ اب پتہ چلا ہو گا۔ بس دیپو سے دلنا چھوڑ دیا ہے۔" چھنتی سے پوچھتیں تو وہ کہتی —— "کوئی بات نہیں۔ نہ اس کے مزاج ہو گئے ہیں نہ مجھے کسی بات کا دکھ ہے۔ بس چھوٹی ذرا سی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی تھی۔ تم لوگوں کو کیا؟"

رات کو دیپو بھی باہر آتی اور چھنتی بھی۔ مگر دونوں دور دور رہتیں جیسے ایک دوسرے کے دل کے چور کو جانتی ہوں۔ اور ایسے دنوں سردار —— سے پہلے دادی کہتی —— "کیوں دلدار سنگھ کوئی بات سوچی تو نے؟"

اور میں کہتا —— "سوچ لیں گے۔"

دل ہی دل میں سوچتا ایک عمر پڑی ہے حساب کتاب چکانے کو۔ جب میں نے پوری چوری دیپو سے ملنا شروع کیا ہے تو بڑے اچھے دن بیت چلے تھے۔ اب میں شام پڑے گھر سے باہر نکل جاتا۔ میرے ہم عمر لڑکے ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے گھونٹ شراب چرا کر پیتے اور لڑکیوں کی باتیں کرتے۔ ایسی باتیں جن میں کچی املی کی کیریوں کا مزہ ہوا اور زیادہ کھانے سے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔

ان کے گھر کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا باغ تھا جس میں پیپل کے گھنے درخت کے پاس چھوٹے چھوٹے امرود کے درخت، آموں کے اچھے پودوں کے بوٹے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں جاتا تو سو طرح خوشبوئیں کس کس ڈھنگ کی نئی نئی باس میرے دماغ کو نشے سے بھر دیتیں۔ میں نے شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ صبح سے شام تک میں بہت محنت سے کام کیا کرتا تھا اور دادی کا سب کہا کرتا تھا۔ میں کبھی اماوس نہانے نہیں گیا۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ میں نے کبھی رات کو چوری چھپے اپنے ساتھیوں کو نہیں ڈرایا۔ مجھے باتوں کا ہوش کہاں تھا، میں تو دیپو کے

سپنے دکھا کرتا تھا ایسے میں بھلا ایک آدمی اور کیا کر سکتا ہے؟

اس گھر کے پچھواڑے باغ میں جا کر میں سے ملنا مجھے معلوم ہے موت تھی اگر کبھی سردار کو پتہ چل جاتا تو جھوسی سے بیراسر، دھر پڑا ہوتا ماں اور دادی کا کوئی سہارا نہ رہتا اور مجھے چنتی کو بیاہنا تھا اور ایک کا بدلہ لینا تھا تاکہ لالڑاں کی گلیوں میں ہمارا سر اونچا ہو سکے۔ سر اونچے ہونے کا بھی مطلب ہے ماں کو اور دادی کو اور سب سے زیادہ میری بہن چنتی کو میرے سور بیر بہادر ہونے میں یقین ہو جائے۔ مجھے اس یقین کو حاصل کرنا تھا اور دوسری طرف دیپو تھی۔ ان راتوں میں مجھے لگتا زندگی کی راہ پر صرف ایک دیا جل رہا ہے اور اگر یہ بجھ گیا تو سدا کے لئے اندھیرے میں رہوں گا موت سے بھی زیادہ تاریک خاموشی اور پر ہول اندھیرے میں۔

ان دنوں دادی کتنے غور سے میری شکل دیکھتی۔ میرے کیس، میرا کرتا سوکھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ ہولے ہولے میرے دل میں اترنا چاہتی ہے۔ اس کی نگاہ کوئی یقین، کوئی بات، کوئی سوچ ڈھونڈھنا چاہتی ہے۔ وہ کوئی امید، کوئی سہارا اور سر اونچا کر کے چلنے کا ذریعہ تلاش کر رہی ہے۔ دیپو سے مل کر آنے کے بعد مجھے نیند کہاں آیا کرتی تھی۔ ساری رات ہڈیوں میں درد ہوتا رہتا جیسے سرسر کر کے کوئی شے دل کے قریب سے چل کر ہر وقت جسم کے اندر رینگتی ہے۔ اس میٹھے درد سے میں بہت بے چین ہو جاتا۔

دیپو سندا سرخ کھدر کی چنری اوڑھ کر آتی۔ میں کہتا گلدیپ کور تو مدری کی ململ کے دوپٹے کیوں نہیں اوڑھتی تو وہ صرف مسکرا دیتی اور اپنی لمبی سیاہ پلکیں اٹھا کر آنکھوں میں چھپی ان بجلیوں کو مجھ پر چھوڑ دیتی۔ آج وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں یہ ہم باتیں کیا کرتے تھے؟

ننگے پیروں سے اونچی گھاس میں کھڑے ہم چنتی کی اور دادی کی باتیں کرتے وہ کہتی ــــ "چنتی مجھے بڑی پیاری ہے۔" میں کہتا ــــ "چنتی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے

اتنی پیاری کہ اگر میرے بس میں ہو تو اس کے لئے آکاش کے تارے بھی توڑ کر لے آؤں۔ تمھیں معلوم ہے نا کہ ایک طرح سے تو وہ میری بیٹی ہی ہے۔"

دیپو ہولے ہولے ہنس کر کہتی ـــ "اچھا تو تم جنتی کے باپو ہو۔" اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ـــ "بڑے اچھے نصیب ہیں اس کے۔"

میں کہتا "نہیں لالڑاں کی مہارانی، تم سے اچھے نصیب نہیں ہیں پر میں اس کے لئے جو کچھ کر سکا کروں گا۔"

اور دیپو دوبارہ کہتی ـــ "جس کے لئے تم کچھ کرو گے اس کے نصیب اچھے ہی ہوں گے نا!"

ایک دفعہ کہنے لگی ـــ "دلدار پڑھنا کیوں نہیں سیکھ لیتے۔" میں نے کہا ـــ "کیوں میں شہر کا بابو کیوں بن جاؤں۔"

کئی پوہ اور کئی لمبی چاندنی راتیں گئیں۔ جنتی کو بیاہ کر ہم لوگوں نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ دادی کا بوجھ کچھ کم ہوا۔ اس کی سسرال وڑن کھیڑے میں تھی۔ لڑکا کھاتا پیتا اور بڑی غریب طبیعت کا تھا۔ گھر میں جنتی کے نہ ہونے کے کارن ذرا بھی رونق نہ ہوتی اور ماں بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ میں دیکھتا اتنے کم سالوں میں اس سر سفید بالوں سے بھر گیا تھا اور چہرے پر وہ رونق نہیں رہی اور عورتوں کو دیکھتا جو ماں سے بڑی تھیں۔ پر کھر دکھوڑ کرتی کپاس کی طرح سفید اور کو نجوں کی طرح جوان تھیں دادی کے چہرے پر اتنے سالوں میں جھریاں لٹک آئی تھیں اور اتنے سالوں میں وہ بہت بوڑھی لگنے لگی تھی۔ لالڑاں کی گلیوں میں سے ہل لے کر گزرتی تو بس گزرتی چلی جاتی۔ رُک کر اور عورتوں کی طرح کبھی گلی میں باتیں نہ کرتی۔ جیسے جیسے میں جوان ہوتا گیا، دادی میرے چہرے، میری حرکتوں میں جیسے تسلی کے نشان ڈھونڈتی رہی۔ دن گزرتے راتیں گزرتیں، پر ہمارے گھر سے نہ کوئی گیت سنائی دیتا اور نہ ہی کوئی رونق میلہ ہوتا میرے بیاہ کی بات گھر میں نہ ہوتی۔ دادی نہ جانے کس بات کا انتظار کر رہی تھی۔ کیس

آسرے وقت گذار رہی تھی۔ کبھی کبھار میں اس کی طرف دیکھتا جیسے وہ مرنے والے کی طرح کسی خاص گھڑی کی راہ دیکھ رہی ہو اور پوہ کی لمبی راتوں میں کھیتوں کو پانی لگا کر جب میں پچھواڑے کے باغ میں جاتا تو دیپو اکیلی کھیتوں میں آ جاتی اور میرا سانس سینے میں گھٹنے لگتا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر گھڑی تیز ہوا میں صرف لکھدر کی ایک چنری اوڑھے جو کسی کہاری کی ہوتی وہ ہنس دیتی اور تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے دانتوں کی لڑیاں چمک اٹھتیں چاہے کتنی ہی اندھیری رات ہو، اس کی آنکھیں کسی اندرونی روشنی سے چمکتی رہتیں اور پھر میں حالات کے دھارے پر بے بس تنکے کی طرح بہنے لگا۔

میں نے اس سے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا کہ اب کیا ہوگا اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

ایک دوسرے میں وشواس ہی ہوتا ہے۔ پیار میں اور کیا بندھن ہو سکتا ہو بھلا مجھے یقین تھا کہ چاہے بارش اور ایسی تیز ہوا چلے وہ جب تک لالٹین میں ہے آئیگی ضرور۔

میں بات بے بات ہنس دیتا۔ میرا جی انجانے ہی ہوا پر خوشبو کی طرح اُڑتا رہتا میرے دوست پوچھتے ـــ "یار دلدار سنگھ کیا بات ہے؟"

ان دنوں اور راتوں میں میں نے دس دس آدمیوں کا کام کیا ہے۔ ڈر، خوف، شکل سب دکھ سے ڈرتے تھے۔ مجھ میں انجانے ہی طاقت آ گئی تھی۔ میری زندگی ایک گیت بن گئی تھی اور میری زندگی کی راتیں کبھی اندھیری نہ رہتیں۔ دیپو نے کبھی یہ شکایت نہ کی کہ میں کیوں اس کے باغ کے پچھواڑے نہیں آتا۔ ہم دونوں کنول میں بند راجکمار اور راجکماری تھے جن کے لئے ساری دنیا ایک کہانی تھی۔ پھول پر اڑنے والے دو بھونرے جو اچانک پھول کے اندر قید ہو گئے خوشبو میں اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے۔

پھر دیپو کے لئے پیغام آنے لگے اور دور دور تک پھیلے رستے والا، کانیاں سب جگہ کے سرداروں نے اس نور کو اپنے گھروں کی روشنی کے لئے لینے کی جدوجہد

شروع کی۔ دیپو شہر کے اسکول سے گھر آ گئی تھی اور دن کے وقت بہت کم آتی جاتی تھی مجھے اندیشے اپنے اپنے مقدر کا فیصلہ معلوم تھا اور کبھی کبھار اس سے باتیں کرتے، باپو کی صورت میری نظروں میں پھر جاتی۔ پر میری راہ الجھی ہوئی تھی۔ دادی کی منتظر نگاہوں اور ماں کی بے بسی کے باوجود مجھے کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ راستے پر دیپو بھی کھڑی تھی اور آگے پیچھے کی ساری دنیا ایک سپنے میں دیکھی بات لگتی تھی۔

اس رات بھی ہم دونوں ملے اور آموں کی خوشبو ہمارے گرد اڑتی رہی تھی۔ جس دن وڑن کھیڑے والوں کا پیغام مہر سنگھ نے قبول کر لیا تھا اور وڑن کھیڑے سے مٹھائی لے کر دیپو کی ہونے والی ساس رتو میں لالڑاں آئی تھی، اس نے وہ انگوٹھی پہن رکھی تھی جو ساس نے اسے پہنائی تھی۔ وہ خوش نہ تھی، اداس بھی نہ تھی۔ ہم روز کی طرح جنتی کی باتیں کر رہے تھے۔ جنتی کا بچہ بڑا پیارا تھا، ماں اسے دیکھ کر آئی تھی۔ درخت کے تنے سے لگی کھڑی وہ مجھے ایک بیل لگتی تھی۔ جس میں نہ کبھی پھول لگیں گے اور نہ کبھی اس سے آگے بڑھے گی۔

میں نے کہا ــــ "دیپو آج کے بعد ہم نہیں ملیں گے اب تمہارے اور میرے راستے الگ ہو گئے۔ سمجھ لو جیسے میں ریل کی پٹڑی سے اتر کر سپاری ونڈ کی طرف مڑ گیا ہوں اور تم لالڑاں میں آ گئی ہو۔"

دیپو نے پہلی اور آخری بار بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی ــــ "کیوں دلدار کیا بات ہو گئی ہے۔ ایک سندری کی کیا بات!" اور اس نے انگوٹھی اتار کر میرے پاؤں میں پھینک دی۔

میں نے انگوٹھی اٹھا کر اسے دے دی۔ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پوہ کی سرد راتوں اور چاندنی راتوں کے حسن، خوشبو سے بھرے ہوئے باغوں کے اندھیروں سے پرے میری اور اس کی انگلیاں چھو گئیں، اور اس گھڑی مجھے معلوم ہو گیا کہ

یہ آگ ساری عمر میری رگوں میں تیرتی رہے گی ۔

میں نے کہا ــــ" ایک انگوٹھی تو کچھ نہیں پر اس بول کی بات ہے تمھیں اس قول کا پالن کرنا ہے جو تمھارے لئے تمھارے باپو نے دیا ہے"۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا اپنے باپ کا قول اور اپنی قسم ۔

" ہے واہگرو ! " میں نے دل ہی دل میں دعا کی" مجھے ہمت دے کوئی راہ دکھا"۔ جتنی دیر ہم کھڑے رہے دیپو اپنی انگلی میں انگوٹھی گھماتی درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی رہی ۔ جاتے جاتے کہنے لگی ــــ" اچھا ولدار سنگھ میں اپنے باپو کے قول کا پالن کروں گی ۔ اب تو خوش ہے "۔

اور اس کے بعد میری زندگی کی راہ کا آخری دیا بھی بجھ گیا ۔ میرا سر اونچا تھا پر دل کی جگہ خالی تھی ۔ سردار بہر سنگھ کی حویلی کے سامنے سے گذرتا تو لگتا پیپل کے پتے ہولے ہولے رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ۔

" مسافر تھوڑی دیر تو ٹھہر جا ، ایسی کیا جلدی ہے "۔

گاؤں کی گلیوں میں شمسان کی سی خاموشی ہوتی ۔ جنتی آئی تو مجھے دیکھ کر بیچ آنگن میں کھڑی رہ گئی اور پھر مجھ سے لپٹ کر اتنا روئی کہ میں ڈر گیا ۔ اس کا گبھرو جوان خاوند نیچی آنکھیں کئے یوں کھڑا تھا گویا اس نے کوئی قصور کیا ہو ۔ ماں بولی ــــ" جنتی کوئی عقل کر دنیا کی ساری لڑکیاں ہی سسرال جاتی ہیں ۔ وداع ہوتی ہیں تجھے کیا ہو گیا ہے ۔ رب خیر کرے ، کڑیئے تو نے میرا دل دھڑکا دیا ہے کیا بات ہے ؟ "

پر جنتی روتی جاتی تھی اور دیپ سنگھ کبھی اپنے کنٹھے کی طرف دیکھتا کبھی ہاتھ میں پکڑی گٹھری کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدلتا تھا ۔ میں بھی حیران تھا ۔

بہت زور زور سے رونے لگی تو اس نے مجھے چھوڑا اور آنکھیں پونچھتی ہوئی دالان کی طرف چلی گئی جیسے بچپن سے جھڑکیاں کھانے کے بعد کبھی کبھی جا کر بیٹھ جاتی تھی ۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پھر رونے لگی اور ہچکیوں کے درمیان کہتی گئی ــــ" کیا

بات ہے دیر تو اتنا کمزور کیوں کمزور ہو گیا ہے؟"

ماں بڑی مُردہ سی ہنسی ہنس کر بولی ـــ " شاباش! بھلا یہ کوئی رونے کی بات ہے جو تو نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ اکیلا کام کرنے والا ہے گرمی سردی کا اثر ہوتا ہی ہے۔ آخر کوئی پتھر ہیں نا۔ پر یہ تو کوئی رونے کی بات نہ تھی۔"

پھر ماں نے دیپ سنگھ کو پھولوں والا کھیس نکال کر بچھا دیا اور اسے پنکھا جھلنے لگی۔

" اچھا ہوا جیتی تو آ گئی ہے کر دیئے آج سے تیسرے دن دیو کا بیاہ ہے تجھے بھی تو بلاوا گیا ہوگا ما؟"

اور جیتی نے پہلی بار کچھ سمجھتے ہوئے اسی گھری نگاہوں سے دیکھا کہ میں پریشان ہو گیا پھر دادی نے مالو بڑے ہی دکھی دل سے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور گڑ کا شربت بنانے لگی۔ ماں نے تنور میں اُپلے ڈالے اور دال میں گھی ڈال کر اسے گرم کیا۔ میرا دھیان بٹانے کے لئے جیتی کے بچے کو اٹھا لیا اور اسے سر سے اوپر ہوا میں اچھالنے لگا۔ بچہ زور زور سے ہنستا اور کھل کھل کرتا سب اس کی طرف دیکھتے۔

جس دن ورٹن کھیڑے سے بارات آنے والی تھی اس سے دو دن پہلے ہی برت گھر سجنا شروع ہو گیا مہر سنگھ اور برادری والے سارے سردار انتظام میں لگے تھے۔ حاکم سنگھ ورٹن کھیڑے میں سب سے تگڑا نوجوان اور ولایت کا پڑھا ہوا تھا اس کے کئی پڑھے لکھے دوست بھی آنے والے تھے۔ اس لئے بندوبست دوہرا تھا۔ پتلونیں پہننے والوں کے لئے میز کرسیاں بڑے شہر سے گڈوں پر لد کر آئیں۔ آس پاس کے شہروں سے ولائتی اچھی سے اچھی شراب لا کر رکھی گئی۔ دور دور سے اچھے سے اچھا کھانا پکانے والے بلا لئے گئے۔ سارے گاؤں کی گلیوں میں صفائی کی گئی۔ چھڑکاؤ کیا گیا۔ مہر سنگھ کی حویلی کی طرف آنے والی راہ پر جو گھر تھے

انھیں مہر سنگھ نے خود نئے سرے سے لپوایا۔ لالڑاں یوں لگتا تھا جیسے آکاش کا ایک خواب ہو جو دھرتی پر اترا ہے۔ حویلی میں سارا دن ڈھولک بجتی رہتی اور سارے گاؤں کی لڑکیاں دیپو کے بیاہ کی خوشی میں چڑیوں کی طرح چہکتی پھرتیں۔ کہاریاں بڑی شان سے نئے نئے کپڑے پہنے تھال لئے گاؤں میں بھاجی اور کھانڈ بانٹتی پھرتیں۔

پر جانے کیوں دادی ان دنوں اتنی بیمار ہو گئی کہ ہل بھی نہ سکتی تھی اور چنتی سنے اس کی پٹی جو پکڑی ہے تو دیپو کی برات آ گئی مگر وہ اس کے گھر نہ جا سکی۔

سویرے سویرے وڈن کھیڑے سے آنے والی راہ پر باجے کی آواز سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ آکاش سے اتری۔ اور پھر چھن چھن کرتی مورنیوں کی طرح اٹھلاتی اونٹنیاں، گھوڑیوں سے اونچی، رنگی سجائی بڑے ناز سے قدم دھرتیں باجے کی آواز پر مست اور ناچنے کو تیار قطار باندھے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے اس راہ پر آئیں اور ان پر سوار کنٹھوں والے مست آنکھوں والے بانکی پگڑیوں والے سردار تھے جو اونٹنیوں کے ہر قدم پر جھول جھول جاتے تھے۔ باجے کی آواز پر ان کے دل میں سپنے کروٹیں لیتے تھے۔ گھوڑیوں کے گلوں میں زیور سجے جو چڑھتی دھوپ میں چمک رہے تھے اور گھوڑیاں آنکھیں بند کر کر کے باجے سنتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک ایک قدم تول تول کر رکھتیں جیسے دریا کے پار اتر رہی ہوں اور پھر رتھوں کی قطاریں تھیں جن میں وڈن کھیڑے کی سردارنیاں تھیں جو گھنگھروٹ کے پردوں کو اٹھا اٹھا کر جھانکتی تھیں اور حیران ہو رہی تھیں کہ وہ کس گاؤں میں آئی ہیں۔ جہاں کی زمین پردھول جمی اور جس کی راہوں پر کیچڑ اور کھڈے ہی ہیں۔

مجھے یوں لگا جیسے کوئی دل کو دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے مل رہا ہو۔ میرے دل میں دیپو کا نام نہ تھا یہاں تک کہ کوئی یاد بھی نہ تھی کیوں کہ میں دیسی شراب کی بوتل لئے اپنے کھیت کے کنارے بیٹھا تھا۔ دور تک سرسوں کے کھیتوں کی زردی تھی

اور پھر وہی کمر کمر تک ڈوبے ہوئے درختوں کے پتوں پر کیڑے کی طرح رینگتے ہوا کے جھونکے تھے۔ اس لیے میرے جی میں آئی کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں پھاگن کی ہوا کا ایک جھونکا ہوتا۔ کسی کھیت کے کنارے ٹھہر کر وہاں گذر جاتا تو وہ درد سا جو رہ رہ میرے سینے میں اٹھ رہا ہے اور کڑوی شراب کی تلخی جو میرے حلق میں کانٹے چبھو رہی ہے جیسے کیکر کا سخت اور تکلیف دینے والا کانٹا کہ نکالے نہیں نکلتا مجھے یوں تکلیف نہ دیتا۔

باجوں کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔ میں سارا دن ایک پیپل کی چھاؤں میں بیٹھا شراب پیتا رہا۔ میرے دل سے سارے غم ڈھل گئے۔ صرف اتنا یاد رہا کہ گاؤں میں کوئی کسی قول کا پالن کر رہا ہے۔ آج چھوٹے چھوٹے رکھوالے لڑکے گائیں بھینسیں چھوڑ کر گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک لڑکا میرے پاس آ کر بولا ــــ "بھاؤ اگر تو نے سردار مہر سنگھ کی لڑکی کی برات نہ دیکھنی ہو تو ذرا میری گائیوں کا دھیان رکھنا۔ میں بھی جلد گھڑی رونق دیکھ آؤں"

اس قول کا پالن کرتا میں دن ڈھلے تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر راستے پر باجے اور نائینوں کے پاؤں کے گھنگرو بجنے۔ گھوڑیوں پر بیٹھے سرداروں کے کیتھے اور کنگن چمکتے تھے اور چمک یوں پڑتی تھی جیسے سورج ٹوٹ گیا ہو اور ذرا ذرا سی کرچوں میں بٹ کر ان کھیرے والوں کے کنگنوں میں آن لگا ہو۔ آگے آگے ایک رتھ تھا سرخ پردے ہلکے ہلکے اڑ رہے تھے اور جس کے آگے جتے سفید بیلوں کے سینگوں پر سنگوٹیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں جیسی پوہ کی اندھیری رات میں آسمان پر آنکھیں جھپکاتے تارے چھم چھم چھم روپوں پونڈوں کی بارش ہو رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں گاتی ہوئی پیچھے پیچھے آ رہی تھیں اور سرخ پردوں والی رتھ پر سے روشن کھیرے والے مینہ کی طرح پونڈوں کی بارش کر رہے تھے۔ پھر گڈوں کی قطاریں تھیں جن میں سامان تھا اور آخر میں مہر سنگھ سفید گھوڑیوں والے کی دی ہوئی گھوڑیاں اور گائیں بھینسیں تھیں اور ولایت سے منگوائی ہوئی حاکم سنگھ کے لئے ایک موٹر تھی جس کو کھلے گڈے پر

رکھا گیا تھا تاکہ راہ کی گرد سے خراب نہ ہو جائے۔

ہولے ہولے یہ قافلہ سر کے ساتھ ساتھ جانے والی راہ پر مڑ گیا۔ باجوں کی آواز اڑنے والے غبار میں مِل کر اور دور ہوتی گئی اور سیندوری پرچھاویں درختوں کے پیچھے پیچھے ہو کر اپنے گاؤں کو واپس آنے لگے۔ بچے، لڑکے، کہار، چمار ابھی تک راہ کی خاک میں دڑن کھیرنے والوں کے پونڈ ڈھونڈھ رہے تھے۔ سورج کی لالی ہوا کے ساتھ ساتھ تیزی سے چکروں میں گھوم رہی تھی۔ یہ ساری سُرخی اٹھی ہو کر جیسے نہر میں گھل گئی اور پانی اتنا سرخ ہو گیا جیسے کسی کا خون ہو۔

میں زور زور سے گیتوں کے آدھے آدھے ٹکڑے ایک ایک بول گا رہا تھا مجھے کچھ بھی تو ڈھنگ سے یاد نہیں آتا تھا مگر میں چپ نہیں ہوتا تھا۔ میرے گلے سے گیتوں کا راگوں کا وہ دھارا بہنے لگا جو برات والوں کے باجوں میں سے نہیں نکلا تھا۔ باجے بے سُرے تھے۔ اتم تار تو مانو میرے پاس تھا اور میں نے بڑی کنجوسی سے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ جب قافلہ شام کی سرخی میں بہت دور چلا گیا اور باجوں کی آواز، شنڈوں کی چرچر میں گم ہو گئی میں نے جی ہی جی میں ہنستے ہوئے وہ اتم تار نکالا اور اُس کی لے میں مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا آپ نعل جائے گا۔ میں اس سیلاب میں بہہ جاؤں گا۔ قدم ایک بار اکھڑ گئے تو پھر دیر ہی اور پر لہریں مجھے کسی ایک کنارے سے ٹکرا دیں گی اور کبھی دوسرے سے، مجھے کبھی ایک تنکے کا سہارا بھی نہ مل سکے گا کہ میں ڈوبنے سے بچ سکوں۔ لہریں مجھے کپاس کی طرح دُھنک کر رکھ دیں گی۔ میں جھاگ بن جاؤں گا۔ آگے ہی آگے نہ جانے کہاں سے کہاں چلا جاؤں۔ اس دیس میں جہاں سے سیندوری پرچھانویں آتے ہیں۔

پھر مجھے دلیپ سنگھ کی آواز اس سارے راگ کے ساتھ بہتی اپنی طرف کی سنائی دی جو کہہ رہا تھا ـــــ "بھاؤ دلدار سنگھ، بھاؤ دلدار سنگھ"

اس کی آواز میں کتنا ڈر تھا کہ میں ہنس پڑا۔ میں نے وہ اتم تار اپنے اندر چھپایا
اور ڈرتے ہوئے دلیپ سنگھ کو زور سے کہا — "کیوں بھاؤ کیا بات ہے؟"
جب پتھریلے تاروں کو سیندوری ساڑے نگل چکے تھے اور پھاگن کی ہوائیں
کھیتوں پر سے وداع ہو گئی تھیں، دادی نے مجھے گلے لگا لیا اور چنتی سیڑھی پر یوں
سہمی بیٹھی تھی گویا اسے مجھ سے ڈر آتا ہو۔ پھر دادی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی
اور ماں دیئے کی لو بڑھانے کے لئے بتی کو اونچا کرتے کرتے گر پڑی۔
مجھے سمجھ نہیں آتا تھا چنتی کو کیا ہوا ہے اور دلیپ سنگھ کیوں اداس ہے۔
دادی اور ماں کیوں اتنی پریشان ہیں۔ کیا انہیں دیپو کے وداع ہونے کا افسوس ہے
پھر چنتی کا بچہ رونے لگا اور میری آنکھوں میں اتنی دھند اتر آئی جیسے کچھ
دکھائی ہی نہ دے۔ جیسے دیا بجھ گیا ہو۔ میں نے چیخ کر کہا — "ماں دیا بجھ گیا ہے
اس کو پھر جلاؤ۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا کچھ نہیں .."

ڈونگے ہنیرے

دوسرے دن کے چڑھتے سورج نے سردار مہر سنگھ کو کھلے کیس بے سدھ کاکھی کے مزگھو جیسی بیٹھے اور وٹن کھیڑے کی طرف جاتے اور چیختے ہوئے پایا۔ اس کی وہ سونیاں بوریے دروں میں رہتی تھیں اور ننگے منہ کبھی باہر نہ نکلی تھیں، گلیوں میں بے پردہ روتی پیٹتی اور سر پر خاک ڈالتی ادھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ کل ڈوبتے سورج کے سیندوری پرچھائیوں نے لاڑاں کی ساری خوشیاں سمیٹ لی تھیں اور اب صرف گہرا اندھیرا تھا جس میں کسی کو راستہ نہ ملتا تھا اور ہر ایک ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ کھیتوں میں ہل چلاتے لوگ کام چھوڑ کر وٹن کھیڑے کو بھاگے جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا ختم ہونے کو ہے آسمان گر پڑا ہے اور ہر ایک اپنے بچاؤ کی فکر میں بھاگا جاتا ہے۔

بنتو بھی ہوتی آئی اور آنگن میں سے آوازیں دینے لگی: "نی جنتی، نی چنتی دیپو نے گلے میں پھانسی ڈال کر اپنے آپ کو مار لیا۔" اور پھر وہ کھڑی ڈھاڑیں مار مار کر یوں رونے لگی جیسے اس کا دل تو بس ٹوٹ ہی گیا ہو۔

چنی اپنے بچے کو چارپائی پر پٹخ کر جلدی سے باہر نکل آئی اور ہاتھ ملتی ہوئی بولی۔ "نی بنتو تجھے کس نے بتایا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات جھوٹ ہے۔ ہائے نی میری دیپو، میری سہیلی۔ نی میں تو اس کے بیاہ میں بھی نہ جا سکی۔ ہائے بنتو یہ بات جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔ ہائے نی میری ماں۔ دیپو کو کیا ہو گیا۔"

وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور بین کرنے لگی۔ دادی رات کو کتنی بیمار تھی، لگتا تھا سویرے بچے گی نہیں۔ مگر یہ سن کر اٹھ بیٹھی اور ماں سے کہنے لگی۔ "کرتیے اجیت کور کیا بات ہے، چنتی کیوں رو رہی ہے۔ دیپو کو کیا ہو گیا ہے؟"

ماں نے بہت ہولے سے کہا۔ "دیپو گلے میں پھندا ڈال کر مر گئی ہے۔"

دادی نے زور سے کہا۔ "لی کوا بیٹے، ٹھیک ٹھیک کہہ، سچ مچ؟"

اور ماں نے اسی دھیرج سے کہا۔ "ہاں۔"

ماں کو نہ رنج ہوا نہ بات عجیب لگی اور نہ اس نے کسی حیرت کا اظہار کیا۔

دادی پلنگ پر اوندھی گر گئی جیسے گرنتھ صاحب کو گوردوارے میں ماتھا ٹیک رہی ہو۔ نہ جانے وہ منہ ہی منہ میں کیا کہہ رہی تھی۔

دیپو کے دینگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ کماریاں، مہریاں جو ابھی رات کی چیزیں بھی سمیٹ کر فارغ نہ ہوئی تھیں، لال کپڑوں میں دہائیاں دیتی پھرتی تھیں۔

میں نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے، کسی بیری نے آکر سب کو پریشان کر دیا ہے۔ رات ہی کو تو دیپو سرخ پردوں والی رتھ میں بیٹھی پونڈوں کی بارش میں وڈن کھیڑے گئی ہے۔ وہاں اس کی ساس نے آسے اور حاکم سنگھ کو دہلیز کے باہر کھڑا کر کے دونوں پر سے پانی وار کر کے پیا ہوگا اور پھر رات پڑے انھیں گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے لے گئی ہوگی۔ وہ تو اپنے باپو کے قول کو پورا کرنے کی خاطر بہت تسلی سے وڈن کھیڑے میں رہنے اور وہاں نسلوں کو بدلے لینے، آن پر مرنے کا سبق دینے گئی تھی، بھلا وہ کہیں مر سکتی ہے؟"

آخری رات جب اس نے اپنی ساس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی میرے قدموں میں پھینک دی تھی تو مجھے لگا تھا کہ وہ دھرتی ہے، سارے دکھ سہنے والی اور چپ رہنے والی، بادلوں کی گھن گرج میں بھی اپنا سینہ کھول کر برکھا برداشت کرنے والی، اس رات اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو نہ سورج میں ہوتی ہے اور نہ چاند

ہیں۔ بس کبھی کبھار مانو پانی کے میٹھے ٹھنڈے دھارے سے نکلتی ہے اور پاگندم کی ہوا میں لہلہاتی بالیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس نے اپنے گھٹنوں کے نیچے تک لٹکتے بال کھول رکھے تھے جو سیاہ جال کی طرح اس کے گرد پھیلے تھے پھر اس کالے جال کی ڈوری آپ ہی اس کے گرد تنگ ہو گئی۔ مچھلی کی طرح وڑن کھیڑے کی ریت کے دریا کنارے دم توڑ دیا۔ مجھے آج بھی پکا یقین ہے کہ اس نے اپنے مانو کا نہیں بس اپنے قول کا پالن کیا تھا۔

سارا دن نہ کسی نے روٹی کھائی اور نہ پکائی۔ جنتی روتی ہوئی مہر سنگھ کے گھر گئی جہاں کھلے دروازوں کے آگے مہریاں کنجیاں کھڑکاتی پیڑھیوں پر بیٹھی دیبو کی باتیں کر رہی تھیں اور گھڑی گھڑی حویلی کے باہر جھانک لیتی تھیں۔ جنتی کو دیکھ کر انھوں نے سر ڈھانپ لئے اور اونچی آواز سے رونے لگیں۔ سب سے بوڑھی کہاری کہنے لگی۔ "جنتی بی بی تو اپنی سہیلی کے بیاہ میں بھی نہ آئی۔ ہائے اس کو کتنا روپ چڑھا تھا۔ بس مہارانی لگتی تھی۔ سرخ جوڑے میں لال کی طرح دگ دگ کرتی چمک رہی تھی۔ جب نائن نے اس کی چوٹی گوندھی ہے تو کہنے لگی ذرا زیادہ کس کے نہ کر ماسی میرا سر دکھنے لگے گا۔ ابھی تو خوشی کے پاؤں میں راہ کی دھول بھی نہ لگی تھی کہ صبح ہی صبح یہ خبر آگئی۔ رات جو نائن اس کے ساتھ گئی تھی سویرے سویرے روتی پیٹتی آگئی کہ بی بی دیبو گلے میں دوپٹہ ڈال کر مر گئی ہے۔ اس سے زیادہ ہمیں کوئی خبر نہیں جو وڑن کھیڑے جاتا ہے وہیں کا ہو رہتا ہے۔"

پھر جب دن ڈھلنے لگا اور راہ کی دھول ساری خوشبوؤں پر تہہ در تہہ جمع ہو گئی تو وڑن کھیڑے کے رتھ میں دیبو کی ڈولی لوٹ آئی۔

دادی نے مہر سنگھ کی بیوی کی طرح سفید چادر اوڑھی اور چپ چاپ جا کر سا... کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ اس نے سب سے بڑھ چڑھ کر سیاپا کیا۔ بیٹھ بیٹھ کر اپنی چھاتی لہولہان کر لی اور دیبو کی ماں، مہر سنگھ کی بیوی سردارنی، دیبو

کے پاس اس طرح بیٹھی تھی جیسے مر جائے گی۔ وہ دادی کی طرح ہر ایک کے مُنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میرا ماپو اتم سنگھ آنگن میں چادر سے مُنہ ڈھانپے لیٹا تھا اور اس گاؤں کے لوگ گلیوں میں روتے پھرتے تھے۔

تیسرے دن پولیس حاکم سنگھ کو ڈرن کھیڑے سے پکڑ کر لے گئی۔ اس نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا کہ دبیو کے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اور مروڑ کر اسی نے مارا ہے۔ اس لئے کہ دبیو نے اسے بتایا تھا کہ میں نے تو بس ماپو کے قول کا پالن کرنے کے لئے اس سے بیاہ کیا ہے ورنہ میں تمہارے ولایت پاس ہونے پر تو تھوکتی بھی نہیں۔"

ہائے دیو نے ذرا بھی شرم نہ کی۔ ذرا جھجک نہیں کی۔ وہ ہیروں کے زیور پہنے بیٹھی تھی اور اس نے ایک ایک زیور اُتار کر رکھ دیا تھا اور پھر کہا تھا۔۔۔۔۔
"میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ میرے جی کو کوئی اور اچھا لگتا ہے۔ تم مجھے یونہی رہنے دو۔ میں تمہاری نہیں ہوں۔"

اور حاکم سنگھ نے رنج، غصّے اور بے عزتی کے ملے جُلے جذبات کے تحت دوپٹہ ڈال کر اُسے مارنا چاہا تو دیو نے کہا۔" نہیں، میں نہیں چاہتی کہ تم یوں جوان موت مرو۔ میری گردن کا منکا توڑ دو پھر دوپٹہ ڈال کر مروڑ دینا، یوں لگے گا جیسے میں نے آپ ہی پھندا گلے میں ڈال کر اپنی جان لی ہے۔" حاکم سنگھ نے بتایا۔

"پھر وہ سکون سے گردن نیچے کر کے بیٹھ گئی، میں نے زور سے جھٹکا دے کر اس کی گردن کا منکا توڑ دیا اور اس کی سُرخ ستاروں بھری چُنری جس میں وہ سوئی ہوئی لگتی تھی اس کے گلے میں ڈال کر نیچے اُتر آیا اور یوں وہ سہاگ رات ختم ہو گئی۔"

دادی یہ ساری باتیں سُن کر آئی تو اس کے قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔ مجھے کہنے لگی۔" دلدار سنگھ پوت، بس میرا جو کام تھا وہ ختم ہو چکا۔ مہر سنگھ سے بدلہ لیا گیا۔ میری جان پر سے بوجھ اُتر گیا۔ واہ گرو تیری بڑی عمر کرے۔"

اور جس دن دیپو کو مرے ساتواں دن تھا چُپ چاپ دادی یوں مرگئی جیسے ہوا کا ایک جھونکا فصلوں میں کہیں سے آنکلے اور اَن دیکھے ہی نکل جائے۔

دھیان پور والے، مہاراج پور والے، لالڑاں والے سب دادی کی ہمت، بہادری، نیکی کی تعریف کر رہے تھے۔ مرنے کے بعد رہ جانے والوں کی ماتو نیکی مادرہ جاتی ہے اور یا بُرائی۔ ماں اُسکے کی موت پر ایسا چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ جیسا سیاپا اُس نے ساس کے مرنے پر کیا۔ سردارنی کرتار کور جس نے سیرنی کی طرح بے ڈر ہو کر ساری زندگی گزاری تھی، محنت کی تھی اور کسی کا احسان نہ اٹھایا تھا، چُپ چاپ اس جہان سے گزر چکی تھی۔

جب میں لالڑاں میں دادی کے کہے کے مطابق گردن اُٹھا کر چل سکتا تھا سردادی زندہ رہی کہ مجھے دیکھ سکے اور نہ ہی دیپو تھی جو اپنی سیاہ پلکوں کی جھالر اُٹھا کر مہارانی کی طرح اپنے جھروکے سے باہر جھانکے اور کہے۔

"یہ چاکر اچھا ہے، کتنا جوان ہے، کیسا اچھا نکلتا قد ہے، کیسی چمکتی آنکھیں ہیں۔ ہنستا یوں ہے جیسے کوئی جھرنا کل کل کرے اور کتنا اونچا ہے کہ کبھی مجھے ایک انگلی سے بھی نہیں چھوتا۔"

لالڑاں میں لوگ یہ باتیں سُنتے اور ہوتے ہوتے گلیوں میں جاتی عورتیں باتیں کرتیں "شہر سے پڑھ کر آئی تھی نا اسی لئے ایسی تھی۔"

"بھئی واہ گرو کی قسم ہمیں تو کبھی نہیں لگا کہ وہ اتنی خراب ہو گی۔"

اور تیسری کہتی "یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اگر کسی کے ساتھ تعلقات تھے تو آخر بڑھاپے میں باپو کی سفید داڑھی میں خاک ڈالنی کیا ضرور تھی، نہ تباتی حاکم سنگھ کو۔"

اور پھر نہ جانے اور کیا کیا باتوں کا چکر سا چلتا رہتا۔ اس کی چال سے لے کر بولنے اور بات کرنے کے طریقے پر ہزار ہزار باتیں ہوتیں اور ساری پھٹکاریں جو عورتوں نے کسی موقع کے لئے سنبھال کر رکھی تھیں، اس پر پڑتیں۔ آج بھی سوچتا ہوں

توسمجھ نہیں آتی کہ دیپو کے اور میرے درمیان کیا رشتہ تھا۔ وہ سب سے گرنتھ کی طرح متبرک تھی۔ وہ میرا ایمان تھی۔ اگر کوئی ان دنوں مجھے پوچھتا تو میں اسی کی سوگند اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی اس کے قریب ہونے اور اسے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ لینا اور دنیا کی نظروں سے دور کہانیوں کے راجکماروں کی طرح دیپو سے ملنا میری خوشی تھی۔ دادی نے کبھی اپنے جانوں یہی سوچا تھا کہ میں نے مہر سنگھ سے بدلہ لیا ہے۔ ماں بھی سوچتی رہی۔ اور جنتی کو مجھ پر اتنا وشواس تھا، اسے معلوم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو۔ چاہے باپو نے عورت کا بدلہ عورت ہی کیا ہو، پر دلدار سنگھ دیپو کے لئے کوئی بری بات اپنے جی میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ سب کہانیاں جو میرے ان کہے ہی ادھر ادھر سے سن کر اور جھوٹ کو چھان کر اس نے اپنے آپ سے بنائیں، ان میں کبھی یہ خیال نہ ہوگا کہ میں اور دیپو کوئی ایسا کام بھی کر سکتے ہیں جو دنیا میں برا سمجھا جائے۔

پھر ایک شام جب ماں ٹھنڈے کھوہ سے پانی لینے گئی تھی اور چوکے میں دیا دھیما دھیما جل رہا تھا اور جنتی کا بچہ سویا ہوا تھا تو اس نے پوچھا ——

"ویر دلدار سنگھ، دیپو نے ایسی غلط بات کیوں کہی تھی حاکم سنگھ سے؟"

میں چپ رہا تو اس نے کہا۔ "دلدار ویر، مہراجی بہت دکھتا ہے ایسی باتیں سن کر، دیپو میری سہیلی تھی۔ باپو کی بات تو اسی طرح رہی۔ پر یہ بوجھ تو نہیں ہے نا ہمارے کندھوں پر؟"

تب بہت ہی دنوں بعد میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کر دلیری سے بات کی اور جنتی کو کہا۔ "تو یہ بات سوچ سکتی ہے۔ وہ میرے لئے اتنی ہی پوتر تھی جتنی تو ہے، مجھے تیری قسم۔"

اور جنتی جیسے سکھ کا سانس لے کر بولی۔ "بدلہ لینے کو تو ایک عمر پڑی ہے۔ کون سی جلدی ہے ہمیں۔"

جب بڑے شہر میں مقدمہ چل پڑا اور حاکم سنگھ ضمانت پر چھوٹ کر وڈن کھیڑے آ گیا تو سردارنی دیپو کی ماں نے بہت پاٹھ کروائے اور روز روز گوردوارے میں جانے لگی۔ وہ اپنے آنگن میں ننگی زمین پر سوتی اور اس نے گرنتھ صاحب پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ جب تک حاکم سنگھ کے گلے میں بھی دیپو کی طرح رسّہ نہیں پڑے گا اور جب تک اس کی بھی بانکے کی گردن ادھر اُدھر نہیں جھولے گی وہ سردیاں گرمیاں مینہ آندھی میں اسی آنگن میں ننگی زمین پر سویا کرے گی۔ مہر سنگھ نے بہت کہا۔ "بھاگواں! پتہ نہیں کن کرموں کا پھل ہے۔ دیپو کی سی جوان بیٹی یوں مر گئی جیسے جیوتی بیر تلے آ کر کچلی جائے، تو کیوں ایسی قسمیں کھاتی ہے۔ ہماری لڑکی تو اب واپس نہیں آنے والی، تو چاہے تو ساری عمر بھی زمیں پہ سوئے اور گرنتھ صاحب کے اوپر ہاتھ رکھ کر قول کرے۔"

اور سردارنی نے جوگن کے سے کیس بکھیر کر، رو رو کر اپنا سر دیواروں سے مار مار کر کہا تھا: "ہائے تجھے کیا پتہ ہے کلیجے کو آگ کس طرح لگتی ہے۔ میری پھلتی کھلتی دھی مجھے کس طرح بھول سکتی ہے، تو تو بھولی باتیں کرتا ہے۔ یہ دولت کس کام کی ہے اب۔"

سردار مہر سنگھ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا اور اٹھ کر بیٹھک میں چلا گیا تھا۔

جنتی نے وڈن کھیڑے میں ایک لڑکی دیکھ لی تھی اور میری بات وہاں پکی کرنے کی صلاح لینے وہ جب واپس لالڑاں آئی ہے تو دادی کو مرے ایک سال ہو چکا تھا۔

میں نے کہا: "جنتی تو کیوں ایسی بات کے پیچھے پڑی ہے جس میں نہ میرا من لگے گا اور نہ چیت، دوسرے گاؤں کی بات ہے اور پھر پرائی لڑکی کو لا کر سکھی

نہ رکھنا مردوں کا کام نہیں۔"

ماں نے جب سُنا کہ میں انکار کر رہا ہوں تو وہ رو پڑی۔ "جینتی بیٹی اگر سُکھ میری قسمت میں ہوتا تو سر کا سائیں کیوں مرتا۔ سر ننگا ہوا تو میں نے اس امید میں دو سال گزار دیے کہ پوت جوان ہو گا، بہو گھر آئے گی، چولہا چوکا سنبھال لے گی تو میری بوڑھی ہڈیوں کو بھی چار دن آرام مل جائے گا۔ اب چار گھڑی رات گئے سو کر ایسے سانجھ سویرے اُٹھنا پڑتا ہے۔ بھلا اب میں ایسے کام کر سکتی ہوں۔ اس کا تو جی ہے کہ میں روتی، بین کرتی یونہی مر جاؤں۔ اکیلی سارا دن من ہی من میں جانے کیا کیا سوچتی ہوں اور یہ کہتا ہے اس کا من نہیں لگتا۔ بھلا اس سے پوچھ تو سہی کس سوانی کی راہ دیکھ رہا ہے جو آکاش سے اُترے گی۔ کوئی مہارانی ہو گی کہ کوئی پری۔"

اور میں نے جینتی سے کہہ دیا۔ "جو تیرا جی چاہے اس طرح کر میں ماں کا دُکھ نہیں دیکھ سکتا۔"

ماں نے جانے کب کب کے کپڑے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے کہ گھر میں گانے والیوں کو بٹھا کر ڈھولک بجاتی اور کپڑوں میں گوٹے اور ستارے لگاتی رہتی۔ ان دنوں ہمارا آنگن مدھائی دینے والیوں سے بھرا رہتا۔ اپنے اپنے سسرال سے جینتی کی سہیلیاں سدرہ دن پہلے ہی آگئیں۔ گھر میں ہر وقت جھانجھروں والے پاؤں کے گت گونجتے رہتے۔ روٹے چُونیں اور دوسرے شور و غل کے درمیان بڑے بڑے نودوں پر نائنیں روٹیاں پکاتیں۔ تو تبو والی باسمتی کے چاولوں پر گھی کی باس ہوتی۔ میں باہر حویلی میں پڑا رہتا یا چوپال میں دوستوں یاروں کے ساتھ مل کر شراب پیتا اور دل کا دُکھ بہلانے کے لئے کھیتوں کے کنارے گھومتا رہتا یا درختوں کے تنوں پر ہاتھ رکھے چپ چاپ آکاش کو تکتا رہتا۔ زندگی کتنی کٹھور ہے اور انسان کتنا بے بس!

میری بیوی سروپ کور اُس رات وڑن کھیڑے والے سرداروں کے ہاں

آئی ہوئی تھی جس دن دیپو بیاہ کر وہاں گئی ہے اور صبح جب نائن روتی بیٹی نیچے اُتری ہے اور دُہائی دیتی ہوئی سیڑھیوں میں گھرنے سے بچی ہے تو سروپ کور کو پہلے سے پتہ تھا کہ دیپو مر چکی ہے۔

اور میں نے بہت حیران ہو کر پوچھا۔"کیوں تم کو کیسے معلوم تھا ؟"

"اس لئے کہ رات کے پہلے پہر ہی حاکم سنگھ نے چوبارے میں سے اتر کر مایو کو بتا دیا تھا کہ اس کی بہو نے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی جان لے لی ہے۔ مگر گاؤں کے خوف اور بدنامی کے ڈر کی وجہ سے کسی نے شور نہیں مچایا تھا۔ سارے دم سادھے سورج نکلنے کا انتظار کرتے رہے تھے تاکہ نائن خود ہی دیپو کو دیکھ لے۔ دیپو کی طرح میں نے پہلے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ بعد میں دیکھوں گی۔ اس کے سر کے بالوں میں پڑے سونے کے پھول ہیروں سے جڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کی چمک کے ساتھ ساتھ زیادہ روشن لگتے تھے۔ وہ بہو تھی پر سب کے چہروں کو ایسی لگتی تھی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ کاجل کی وجہ سے پلکیں ریشمی جھالر لگتی تھیں اور وہ اس جھالر کے نیچے سے ہر ایک کو پرکھ رہی۔ ۔ ۔ ساری رسمیں ہو چکیں تو اس نے کلائیوں تک بھرے سُرخ چوڑے میں سے کلیرے نکال کر رکھ دئے۔"

نائن نے کہا۔"بی بی ابھی نہیں! ابھی نہیں !"

تو اس نے ذرا مسکرا کر کہا تھا۔"یہ بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے میری باہیں دُکھنے لگی ہیں۔"

"پھر اُنھوں نے اُسے سُرخ رنگ کے کسی قیمتی ریشم کا گھگرا اور ستاروں بھری چولی پہنائی اور کتنی ہی خوشبوؤں کی دھونی اس کے کمرے میں اور اس کے گرد پھیلائی، یہاں تک کہ ہر شے مہک گئی پھر آنکھیں بند کرنے کو کہا گیا۔ جب آنکھیں بند کر کے دیپو بیٹھی تھی تو تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی اور گھگھرے کی گوٹ کے اندر کھسکا کر رکھے ہوئے خوشبوؤں کے کٹورے میں سے خوشبو

اس کی انگلیوں کے ناخنوں تک میں رچ گئی تھی۔ پھر دیپو کا شنگار کیا گیا۔ اس کی سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح جھول رہی تھی اور اس میں سرخ ریشم کا گچھا پڑا تھا۔ مہندی سے سرخ ہاتھوں میں ایسی لالی تھی جس سے نہ جانے کیوں ڈر آتا تھا۔ بادلے کے جھم جھم ستاروں بھرے دوپٹے کو اوڑھ کر جب اس نے اپنی شکل دیکھی تو حیران رہ گئی ہوگی۔ کیوں کہ پاس کھڑی نائن سے اس نے پوچھا تھا "ماسی میرا شنگار کیسا اترا ہے۔"

"اور نائن نے جھٹ پٹ اسے چوم لیا تھا۔ اسے دعائیں دینے لگی تو وہ سسرال والیوں کا لحاظ کئے بنا زور سے ہنس پڑی اور اس کی کمر بل کھا گئی۔ بالکل کومل نرم نئی نویلی شاخ کی طرح۔

"ہم سب نے سوچا پڑھی لکھی ہے نا اس لئے ہنستی ہے۔ جب ہم اسے اوپر چوبارے میں چھوڑ کر نیچے آرہے تھے تو اس کے چہرے پر کتنا سکون تھا۔ ایسی نرمی اور ایسی سندرتا جو بس مہارانیوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس زمین پر رہنے والی کسی لڑکی میں نہیں۔ اور میں نے واپس جا کر سیڑھیوں پر سے لوٹ کر اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کے کنوارے بھولے اور بے پناہ حسن کو دیکھا۔ نہ جانے کس نے میرے دل میں چپکے سے کہا "دیکھ لے، دیکھ لے، جی بھر کر دیکھ لے تو اس شکل کو، پھر نہ دیکھ سکے گی۔"

"اور پھر جب میں نے کتنی دیر گھونگھٹ اٹھائے رکھا تو اس نے کہا "آپی بی بیٹھ جا۔ دو گھڑی بات کر۔"

"کمرے میں دھواں نہیں تھا خوشبو کی نیلاہٹ تھی جیسے موم بتیوں کے اوپر شام کی دھند پھیلی ہو اور اس نیلے دھوئیں کے اندر موم بتیوں کی روشنی سے زیادہ چمکیلی دیپو مجھے یوں لگی تھی جیسے وہ کمرے میں نہیں آکاش پر بیٹھی ہو پھر مجھے شرم آگئی اور میری ساتھ والیاں آوازیں دینے لگیں تو میں تیزی سے بھاگ آئی۔"

"حاکم سنگھ بہت خوش تھا۔ ہم سب اس کے گرد ہو گئیں اور اسے بتانے لگیں

کہ اس کی بیوی کتنی خوب صورت ہے۔ جب ہم نے کہا کہ وہ ولایت کی میموں سے بھی زیادہ خوب صورت ہے تو ہنس کر بولا "تم لوگوں کا خیال ہے، وہاں کی عورتیں اپنے دیس کی عورتوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ بھئی وہ تو تمہاری جوتی کی برابری نہیں کرسکتیں۔"

"ہم سب زور سے کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور ڈھولک بہت تیزی سے بجنے لگی۔ اتنی زور سے کہ ہماری ہنسی کی آواز دب کر رہ گئی۔ ویسے ہمیں یہ بھی خوشی تھی کہ ولایت سے آئے ہوئے حاکم سنگھ سے جو ہماری برادری کا سب سے اونچا اور اچھا سندر جوان ہے ہم باتیں کر رہی تھیں۔

"حاکم سنگھ چلا گیا تو ہم سب گھڑی دو گھڑی ناچیں۔ تماشا کرتی رہیں اور پھر رات نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

"کوئی دو پہر رات بیتی ہوگی جو میں پانی پینے اُٹھی۔ ایک کوٹھری میں بیس بیس لوگ گھسے سو رہے تھے۔ سردی تو کیا لگتی تھی۔ بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ننگے پاؤں ہی دروازے کی طرف گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے معلوم تھا۔ دیپو کو کچھ ہو گیا ہوگا۔ میری ٹانگوں میں سے جان نکل گئی۔ حاکم سنگھ گھبرایا ہوا ننگے سر کھڑا تھا۔ اس کی ماں ہاتھ مل رہی تھی اور باپ رہن ہر بیٹھا کہہ رہا تھا "یہ کیا ہو گیا میرے گھر میں یہ کیا ہو گیا۔ ارے اتنی سندر بہو کو کس کی نظر کھا گئی۔ کیا آئی اس کے جی میں۔ ایسے نہیں، جا کر تو دیکھو، یونہی بے ہوش ہو گئی ہو گی۔"

"مگر حاکم سنگھ نے کہا "میں کس جگہ سے آیا ہوں جو غلط کہوں گا۔"

"اور باپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "سچ سچ کہہ تو نے تو نہیں اُسے مار ڈالا۔ کہیں تو نے آج شراب تو زیادہ نہیں پی لی تھی۔ حاکم سنگھ تو ہوش میں تو ہے۔"

اور حاکم سنگھ نے بہت دھیرج سے کہا "میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ جو ہونا تھا

سو ہو چکا ہے۔"

'پھر ماں بڑے دکھ سے رونے لگی اور آواز کو دبانے کے لئے ہونٹوں کو اندر سے کاٹنے لگی۔ باپ بے قرار زخمی جانور کی طرح بیٹھک میں پھرنے لگا جیسے خود اس کی جان نکلنے والی ہو۔ حاکم سنگھ نے کہا "میں ذرا کھیتوں کی طرف جاتا ہوں، اپنے آپ کو سنبھالو۔ سویرے تو خود بخود پتہ لگ جائے گا۔ اس وقت سارا جگ سو رہا ہے، رونے اور واویلا کرنے سے فایدہ ؟"

"وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نکل گیا۔ وہ صرف ایک ریشمی قمیص پہنے تھا۔

"اور پھر سویرے ڈھن کھیڑے میں اتنا شور ہوا ہے کہ کسی گرو کے شہید ہو جانے پر بھی نہیں ہو سکتا۔

"نائن نے آتے ہی سب سے پہلے کہا کہ دیو کو مارا گیا ہے، وہ خود نہیں مری۔ مہندی والے ہاتھوں سے ڈھولک پھینک کر پاؤں میں جھانجھروں کی پرواہ کئے بغیر عورتیں ادھر اُدھر بھاگتی اور بین کرتی پھرتی تھیں۔"

میں نے پوچھا "یہ سر دیپ تمہیں تو پتہ تھا، تم نے بھی نہیں بتایا کسی کو ؟"

"میں پانی پیئے سا اپنی ٹانگیں گھسیٹتی کسی نہ کسی طرح کوٹھری میں پہنچی اور لیٹ گئی۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا۔ دیو کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی اور مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی کہ وہ کیوں سب کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی۔ اور جب اس کا شنگار کیا گیا تو چپ چاپ اپنی صورت شیشے میں دیکھ کر بھولے بھولے ہنستی رہی تھی۔"

میرا جی چاہتا تھا میں حاکم سنگھ سے ملوں۔ پر جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے، یہ نہیں کہ میں موت سے ڈرتا تھا۔ پر ایسی بات کہنے کا فائدہ مجھے سمجھ نہیں آتا جو دیر بہنوں کو مار دیتے ہیں، بیویوں کے گلے پر چھری چلا دیتے ہیں۔ ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ورا توں میں کیوں اپنی مٹی خود اڑاتے ہیں اور رجال ہے اپنے

خاطر اس عزت کو دُنیا کے سامنے نیلام کرتے ہیں اُنھیں بھلا اس سے کیا فائدہ ہوتا
گا۔ وہ عزت جس کو بچانے کی خاطر وہ ایک ہنستی کھیلتی پھول کی طرح کی بہن یا
بی کو اپنی راہ سے ہٹا دیتے ہیں پھر راستوں کی خاک میں مل جاتی ہے اور گاؤں
وں اس کا چرچا ہوتا ہے۔

دیپو میرے لئے پو تو رات کی سیاہی بن گئی جو آکاش کے قریب اور تاروں سے
نیچے کہیں ڈولتی ہے اور جسے کوئی چھو نہیں سکتا مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ دیپو
ایسا کیوں کیا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو میں اس سے پوچھتا۔ مگر پھر ایسی بات کہنے
نے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ باپو کا قول نبھائے
اور وہ وڑن کھیڑے چلی گئی پھر ایک رات میں نے اپنے باپو کو سپنے میں دیکھا۔
نے لگا" دلدار سنگھ ماں یہ کہتی ہے کہ تو نے اپنا بچن پورا کیا ہے اور میں کہتا ہوں
بن کیا۔ میں بھوت بن کر پیچھا کروں گا۔ اگر تو اپنا کہا پورا نہ کرے' تو مہر سنگھ کو مار
دوں نہیں دیتا۔"

اور سپنے میں ہی نے کہا تھا" باپو مہر سنگھ تو پہلے ہی مرا ہوا ہے۔ میں اسے
ر کیا ماروں اگر تو آئے تو دیکھے کہ اس کی کالی داڑھی ایک دم سفید ہو گئی ہے۔
ہ گھوڑی پر اکڑ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہی گاؤں کی گلیوں میں اسے دوڑاتا ہے۔
میں نیچی کر کے چلتا ہے اور گوردوارے میں اپنی سوانی کے ساتھ ہر روز جاتا
ہے۔ اب وہ اور کیا مرے گا۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہے وہ۔ تو تو مر کر اب
م چین سے ہے پر اسے روز مرنا ہے۔ بتا کیا وہ بھوت نہیں لگتا۔"

اور باپو نے زور سے ہنس کر کہا" پر تیرا قول' میں پوچھتا ہوں تیرا قول۔"
میں نے کہا" آگے سُن وہاں کہیں دیپو بھی ہو گی اس سے پوچھ لینا کبھی کبھار
لینا دشمن کو معاف کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ میں نے مہر سنگھ کو معاف کر دیا تھا۔
تے تیری مرضی ہے۔ اگر تو بھوت بن کر میرے پیچھے آنا چاہے تو آجانا۔"

اور اتم سنگھ نے کہا۔ "جب تک مہر سنگھ زندہ ہے میں کس طرح چین سے
رہ سکتا ہوں۔"

اگلے دن سویرے حاکم سنگھ کے مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا۔ جب رات کو آنگن میں درخت کے نیچے سوئی سردارنی کو کسی شے نے کاٹ لیا۔ وہ ہائے ہائے کرتی رہی اور سردی کی اس ٹھنڈی رات میں کالا ناگ اس کے پاس ہی کنڈلی مارے کھڑا تھا ——

جوگندر سنگھ ماں کے سرہانے اور سردار مہر سنگھ اکڑی ہوئی سردارنی کی طرف ایک نظر دیکھ کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس نے کسی کہار کو اپنے ساتھ نہیں لیا اور نہ ہی برادری کے کسی آدمی کو۔ سارے لوگ اس سے پہلے ہی شہر پہنچ چکے تھے، اس کا سر جھکا ہوا تھا اور باگیں ڈھیلی تھیں۔ گھوڑی کبھی ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھی اور پھر مڑ کر سردارنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ پہلے ان راہوں پر اسے سرپٹ دوڑایا جاتا تھا، اور راہ اس کے قدموں کے نیچے دھول بن جاتی تھی۔ مہر سنگھ رو رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے جن کو وہ پونچھ بھی نہیں رہا تھا اور گھوڑی بڑی بے چین ہوتی، اپنے مالک کی ایک ایک رمز پہچاننے والی، ایک ایک اشارے کو جاننے والی ٹھہر ٹھہر جاتی اور ہنہناتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔

"کیوں مالک کیا بات ہے، کیوں سردار کیا بات ہے۔"

سردار نے گھوڑی بڑھ کے ایک اونچے درخت کے نیچے ٹھہرا لی۔ یہ بڑ بہت پرانا تھا اور نہر کے کنارے سے لے کر ہمارے کھوہ تک شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ گھوڑی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ درخت کے نیچے ایک چبوترہ تھا جہاں سدو دل کا ایک بت تھا۔ پھر مورتی ٹوٹ گئی اور چبوترہ ویران ہو گیا جس پر کبھی کبھار دوسری طرف سے آنے والے انجان راہی ٹھنڈے سائے میں دو گھڑی آرام کرنے کو لیٹ جایا کرتے تھے۔ پر گاؤں والوں میں سے کوئی کبھی یہاں قدم نہ دھرتا۔ سنا تھا جو کوئی اس پر قدم دھرتا ہے اس کا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔

کی خاطر اس عزت کو دُنیا کے سامنے نیلام کرتے ہیں' انھیں بھلا اس سے کیا فائدہ ہوتا ہوگا۔ وہ عزت جس کو بچانے کی خاطر وہ ایک ہنستی کھیلتی پھول کی طرح کی بہن یا بیوی کو اپنی راہ سے ہٹا دیتے ہیں پھر راستوں کی خاک میں مل جاتی ہے اور گاؤں گاؤں اس کا چرچا ہوتا ہے۔

دیپو میرے لئے پوتر رات کی سیاہی بن گئی جو آکاش کے قریب اور تاروں سے ذرا نیچے کہیں ڈولتی ہے اور جسے کوئی چھو نہیں سکتا مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ دیپو نے ایسا کیوں کیا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو میں اس سے پوچھتا۔ مگر پھر ایسی بات کہنے سننے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ باپو کا قول نبھائے گی اور وہ وڑن کھیڑے چلی گئی پھر ایک رات میں نے اپنے باپو کو سپنے میں دیکھا۔ کہنے لگا" دلدار سنگھ ماں یہ کہتی ہے کہ تو نے اپنا بچن پورا کیا ہے اور میں کہتا ہوں نہیں کیا۔ میں بھوت بن کر پیچھا کروں گا۔ اگر تو اپنا کہا پورا نہ کرے' تو مہر سنگھ کو مار کیوں نہیں دیتا۔"

اور سپنے میں ہی نے کہا تھا" باپو مہر سنگھ تو پہلے ہی مرا ہوا ہے۔ میں اسے اور کیا ماروں اگر تو آئے تو دیکھے کہ اس کی کالی ڈاڑھی ایک دم سفید ہو گئی ہے۔ وہ گھوڑی پر اکڑ کر نہیں بیٹھتا اور نہ ہی گاؤں کی گلیوں میں اسے دوڑاتا ہے۔ آنکھیں نیچی کرکے چلتا ہے اور گوردوارے میں اپنی سوانی کے ساتھ ہر روز جاتا ہے۔ اب وہ اور کیا مرے گا۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہے وہ۔ تُو تو مرکر اب سُکھ چین سے ہے پر اسے روز مرنا ہے۔ بتا کیا وہ بھوت نہیں لگتا۔"

اور باپو نے زور سے ہنس کر کہا" پر تیرا قول' میں پوچھتا ہوں تیرا قول۔"

میں نے کہا" اُتے سُن وہاں کہیں دیپو بھی ہوگی اس سے پوچھ لینا کبھی کبھار بدلہ لینا دشمن کو معاف کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ میں نے مہر سنگھ کو معاف کردیا تھا۔ آگے تیری مرضی ہے۔ اگر تو بھوت بن کر میرے پیچھے آنا چاہے تو آجا نا۔"

اور رام سنگھ نے کہا۔ "جب تک مہر سنگھ زندہ ہے میں کس طرح چین سے رہ سکتا ہوں۔"

اگلے دن سویرے حاکم سنگھ کے مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا۔ جب رات کو آنگن میں درخت کے نیچے سوئی سردارنی کو کسی شے نے کاٹ لیا۔ وہ ہائے ہائے کرتی رہی اور سردی کی اس ٹھنڈی رات میں کالا ناگ اس کے پاس ہی کنڈلی مارے کھڑا تھا۔۔۔۔

جو گیندر سنگھ ماں کے سرہانے اور سردار مہر سنگھ اکڑی ہوئی سردارنی کی طرف ایک نظر دیکھ کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس نے کسی کہار کو اپنے ساتھ نہیں لیا اور نہ ہی برادری کے کسی آدمی کو۔ سارے لوگ اس سے پہلے ہی شہر پہنچ چکے تھے، اس کا سر جھکا ہوا تھا اور باگیں ڈھیلی تھیں۔ گھوڑی بھی ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھی اور پھر مڑ کر سردارنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ پہلے ان راہوں پر اسے سرپٹ دوڑایا جاتا تھا، اور راہ اس کے قدموں کے نیچے دھول بن جاتی تھی۔ مہر سنگھ رو رہا تھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے جن کو وہ پونچھ بھی نہیں رہا تھا اور گھوڑی بڑی بے چین ہوتی، اپنے مالک کی ایک ایک رمز پہچاننے والی، ایک ایک اشارے کو جاننے والی ٹھہر ٹھہر جاتی اور ہنہناتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔

"کیوں مالک کیا بات ہے، کیوں سردار کیا بات ہے۔"

سردار نے گھوڑی بڑ کے ایک اونچے درخت کے نیچے ٹھہرالی۔ یہ بڑ بہت پرانا تھا اور نہر کے کنارے سے لے کر ہمارے کھوہ تک شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ گھوڑی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ درخت کے نیچے ایک چبوترہ تھا جہاں ہندوؤں کا ایک بت تھا۔ پھر مورتی ٹوٹ گئی اور چبوترہ ویران ہو گیا جس پر کبھی کبھار دوسری طرف سے آنے والے انجان راہی ٹھنڈے سائے میں دو گھڑی آرام کرنے کو لیٹ جایا کرتے تھے۔ پر گاؤں والوں میں سے کوئی کبھی یہاں قدم نہ دھرتا۔ سنا تھا جو کوئی اس پر قدم دھرتا ہے اس کا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔

بال بچے ڈھور ڈنگر مر جاتے ہیں فصل سوکھ جاتی ہے اور خاندان تک باقی نہیں رہتا۔ سردار کا سر جھکا ہوا تھا اور گھوڑی اس کے پاس کھڑی تھی کبھی ہنہناتی اور کبھی آگے منہ کر کے سردار کے سر کو سونگھتی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نہ جانے اُسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی جب میں گاؤں کے سیدھے راستے نہیں بلکہ اپنے کھوہ کی طرف ہو کر نکلا ہوں۔ سردار کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میرا دل ٹھہرنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا اگر سرپٹ گھوڑی کو دوڑاؤں تو ایک گھنٹے میں شہر پہنچ جاؤں گا اور عدالت میں مقدمہ کا فیصلہ سُن لوں گا۔

قریب جا کر میں نے گھوڑی کو ٹھہرا لیا۔

اور وہ نگاہیں میرے دل میں گڑ گئیں۔ سردار نے ہولے ہولے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارہ سے کہا کہ میں چلا جاؤں۔

میں گھوڑی سے اُتر پڑا اور قریب ہی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سردار نے کہا۔

"دلدار سنگھ اور یہ بیٹھ، تو ابھی جوان ہے، تجھے زندہ رہنا ہے، میں نے دونوں ہاتھوں سے عیش لوٹا ہے، اتنا کہ اس مٹھاس نے مجھے اُوب دیا ہے تو مجھ اکیلے کو اس پر بیٹھنے دے۔"

اور اس نے ہاتھ سے مجھے پکڑ کر چبوترے سے یوں ہٹا دیا جیسے میں ایک بچہ ہوں تیتی کے کاکے جیسا۔

جب میں اپنی گھوڑی ایک درخت کی شاخ سے باندھ کر پھر وہاں آ بیٹھا تو سردار نے کہا۔ "تو اپنے راستے پر جا، تیرا کیا کام ہے یہاں؟ عدالت کھل گئی ہو گی اور یہاں سے اگر گھوڑی کو سرپٹ دوڑائے تو تب کہیں تو اس وقت پہنچے گا۔"

"اور تم نہیں چلو گے کیا؟"

"نہیں۔"

"پر کیوں؟ آج مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا۔ میری دیپو واپس تو نہیں آسکتی نا۔ اگر میں حاکم سنگھ کے خلاف بھی فیصلہ سُن لوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا بھلا۔"

"زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے کے آگے دوڑنے سے یا پیچھے رہ جانے سے فائدہ تو کوئی نہیں ہوتا سردار، بس تھوڑی دیر کے لئے ایک خوشی ہوتی ہے۔"

"میری خوشیاں ختم ہو گئی ہیں دلدار سنگھ۔ آج ہوئے جب سردارنی کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی اور میں دیپو کے مقدمے کا فیصلہ سُننے باہر نکلا تھا تو مجھے پتہ تھا کہ دل سے اندر کوئی شے مرگئی ہے جو زندہ نہیں ہوسکتی۔ تم جوان ہو اور خوشیاں جوانی کے ساتھ ہو ہیں۔ مقدمے جیتنے ہارنے کی خوشی بھی تمھاری عمر کا ایک حصّہ ہے۔ ہم نے پوری زند اسی طرح ہارنے اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اس بازی کو جیتنے میں بتائی ہے۔ اب آ میں اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"فرق!"

میں نے حیرت سے کہا۔ وٹن کھیڑے کے سرداروں کے اُڑے ہوئے چہرے زرد رنگ اور حاکم سنگھ کی خشک ہونٹوں پر پھیرتی زبان، اس کی بے آس آنکھیں ا ایسی نظریں جیسے دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔

"میں نے دوسروں کو سدا ایسا ہی دیکھا ہے دلدار سنگھ۔ اب میری باری ہے کیا تجھے پتہ نہیں کہ میں نے تیرے بابو اُتم سنگھ کو پھانسی پر چڑھانے کے لئے کتنی دولت لگا کر خوشی حاصل کی تھی۔ ہولے ہولے یہ خوشیاں میرے خون میں زہر بن کر رچ گئیں اور میرا پاسہ پلٹتا گیا۔ تیری دادی سردارنی کرتار کور جب رات دن کھیتوں میں محنت کرتی اور ہل چلاتی تھی تو میں خوشی سے سینہ پھلا کر اپنی جیت کو محسوس کرتا تھا جب تو پو کی لمبی راتوں میں کانپتا کھیتوں کو پانی دیا کرتا تھا تو مجھے کتنی تسلی ہوتی تھی۔ اب میں یہاں بیٹھا ہوں، اگر تو چاہے تو اپنی دادی کی محنتوں کا، اپنے باپ کی موت کا بدلہ مجھ سے لے۔ میں تیرا دین دار ہوں دلدار سنگھ، تو مجھے اس گھڑی مار نہیں سکتا؟"

پھر اس نے ایسے دیکھا جیسے مجھ سے التجا کر رہا ہو۔ میرا ہاتھ اپنی کرپان پر پڑا۔ میری نگاہوں میں باپو کی صورت گھوم گئی۔ مجھے اپنی دادی کا جھریوں پڑا چہرہ یاد آ گیا۔ تاروں کی چھاؤں سے لے کر شام تک اس کا کھیتوں میں محنت کرنا یاد آ گیا۔ پر میں نے کہا ابھی وقت نہیں آیا۔

سردار نے سر جھکا لیا تھا اور آنسوؤں کے قطرے موتیوں کی طرح اس کی داڑھی سے گر رہے تھے۔ وہ دونوں گھٹنوں پہ کہنیاں ٹکائے ہاتھوں کو آپس میں جوڑے بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا اور اس کا تہبند میلا تھا۔ پگڑی کے پیچ ڈھیلے تھے۔

میں نے کہا: "سردار جی! میرے حساب کا وقت ابھی نہیں آیا۔ پر یہ کہاں کی مردانگی ہے کہ ذرا سے دکھ سے پریشان ہو جاؤ۔ کیا دیپو کی اور سردارنی کی موت سے ایسے گھبرا گئے ہو، تمہیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کیا تم سردارنی کرتار کور سے بھی کم حوصلہ ہو جس نے انوپ سنگھ، میرے دادے کی موت کے بعد اُتم سنگھ، اپنے جوان بیٹے کا غم بھی سہا اور پھر بھی محنت کرتی رہی۔"

"والدار سنگھ! اس کے سامنے مجھ سے اپنا بدلہ لینے کا ارادہ تھا۔ وہ غم کو جوان کر رہی تھی، وہ اپنا نام نہیں مٹانا چاہتی تھی۔ میرے بیٹے اپنی الگ راہوں پر ہیں، جو نہ کسی راستے میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی بدلوں میں۔ میں ان کے لئے ایک گزری بات ہوں، بیتی کہانی ہوں بس چوپال سجنے کے لئے۔"

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ تم اس راہ میں یقین کرنے لگو۔"

میں نے بھولے سے کہا۔ "جس ڈگر پہ سدا چلتے آئے ہو اس پر چل کر تمہیں نہ مکتی ملے گی اور نہ شانتی۔ بس اپنے قول کو نبھانا، اپنے وچن کا پالن کرنا ہی زندگی میں ایک کام ہے۔"

سردار نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اپنے کو سہارا دیا اور جھٹکے سے کھڑا

ہو کر اپنی گھوڑی کی لگام پکڑ کر بولا" ہاں دلدار سنگھ! زندگی کے آخر میں چاہے شاہی اور مکتی نہ بھی ملے پر ڈگر سے کہاں جاؤں۔ آؤ چلو۔"

ہم دونوں عدالت میں پہنچے تو آخری بیان ہو رہے تھے۔ حاکم سنگھ کے وکیل نے عدالت میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ حاکم سنگھ شراب کی وجہ سے اندھا ہو رہا تھا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا اس لئے اس پر دیدہ دانستہ کلدیپ کور کو قتل کرنے کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا اور اس بات کا ثبوت اس کا تین دن بعد خود اقبال جرم کر لینا ہے۔ چونکہ فاضل جج کو ولایت جانے کی جلدی تھی اس لئے مقدمے کا فیصلہ اسی وقت سُنا دیا گیا۔

حاکم سنگھ کو عدالت نے باعزت بری کر دیا تھا۔ دیپو کی گردن میں جو ہیرا تھا اس کی قیمت ایک مٹی کے ٹوٹے پیالے کے برابر بھی نہ پڑی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مہر سنگھ کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور اس کے ماتھے پر ایک رگ بار بار جیسے سانپ اُٹھتی تھی، پھڑک رہی تھی۔

سردارنی کے مرنے کے بعد ان بڑی بڑی بیٹھکوں میں کتنی بے رونقی ہو تی تھی۔ سردار مہر سنگھ اکثر شہر جاتا رہتا۔ وہ اپنی زمین بیچ کر ڈٹن کھیڑے والوں کے خلاف نئے سرے سے مقدمہ دائر کر رہا تھا۔ اس کی گھوڑی بڑے شہر سے لالڑاں آتی رہتی اور پھر واپس۔ پرانے دنوں کی طرح اب اس کے پیچھے چار نہ دوڑتے۔ وہ باگیں ڈھیلی چھوڑے گھوڑی پر بیٹھا رہتا اور سوچتا رہتا۔ اس کی مونچھیں بھی داڑھی کے ساتھ ساتھ ملی ہوئی نیچے ڈھلکی رہتیں اور پگڑی کے پیچ بہت بے ترتیب ہوتے۔ مجھے اس گلی میں جاتے ہول آتا تھا۔ جہاں کبھی مہریاں کہاریاں جھپ جھپ کرتی اندر جاتی اور باہر آتی تھیں اور دروازے کے سامنے اناجوں سے بھرے گڈے آتے رہتے تھے۔ کام کرنے والے، اناج اُتارنے والے، بوریاں بھرنے والے، وہاں پھاٹک کے

سامنے بیل پر صرف سٹے ستور کیا کرتے۔ جوگندر سنگھ کسی سرکاری عہدے پر تھا اور پھر یوں بھی ماں کے مرنے کے بعد اس نے کبھی لالڑاں کا رُخ نہ کیا۔ بند کھڑکیاں گرد سے اٹی ہوتیں، جیسے برسوں سے کھولا نہ گیا ہو اور باہر کی دیواروں پر کائی نہ جانے کیوں خود بخود جمنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری دیوار سبز ہو گئی۔

مہر سنگھ گاؤں آتا تو سرکاری کاغذوں پر جھکا رہتا اور اپنے منشی سے حساب کتاب کرواتا۔ اس نے کافی زمین بیچ دی۔ کبھی کبھار گاؤں میں کوئی جھگڑا ہو جاتا تو لوگوں کو کئی کئی دنوں مہر سنگھ کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ گاؤں کا سرپنچ تھا اور اہم فیصلے اس کے بنا ہو نہیں سکتے تھے۔ اس نے سرکاری سفید پوشی سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا۔ چوپال میں جب سردیوں کی اداس شاموں کو سب اکٹھے ہوتے تو اس مقدمے کا ہی ذکر کرتے تھے جو لالڑاں والوں نے وڑن کھیڑے والوں پر کیا تھا۔

مہر سنگھ سے کوئی پوچھتا "سناؤ سردار جی کیا حال ہے مقدمے کی؟" تو وہ پہلے دنوں کی طرح اکڑ کر یہ نہ کہتا "رب چاہے فتح تو اپنی ہو گی" اور سینے پر ہاتھ مار کر یہ جواب نہ دیتا "ہم تو دشمن کا بیج برباد کر دیں گے"

شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ بیج برباد کرنے پر کوئی حکم نہیں رکھتا اور فتح تو واہگرو کے اختیار میں ہے جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔

جینتی کبھی گاؤں آتی تو یوں ہی اس اُجڑی حویلی میں گھس جاتی جہاں مہر سنگھ کی ایک بیوہ بہن رہتی تھی اور جسے آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ برساتوں میں اب بھی اناج کو بڑے آنگن کے پکے فرش پر دھوپ دی جاتی، اور مہریاں کیاریاں چاول پھٹکتی سردار کی بہن سے مقدمے اور وڑن کھیڑے والوں کی باتیں کرتی رہتیں۔

جینتی کو دیکھ کر دیپو کی بوا کہتی "اِدھر آ جینتی میرے قریب آ، میں تجھے غور سے دیکھوں۔ تو میری دیپو کی سہیلی تھی نا، مجھے تجھ سے اس کی باس آتی ہے۔"

تو بیاہ میں یہیں آئی تھی نا۔ پر وہ آخری گھڑی تک تجھے یاد کرتی رہی تھی۔ مجھ سے ہوتے سے کہنے لگی۔ "بوا کسی کو بھیج تو سہی جیتی مجھ سے ایسی غصے بھی تو نہ تھی کہ آ بھی ہی نا سکے۔" میں نے کہا۔ "بیٹی اس کی دادی بہت بیمار ہے مرنے کے کنارے ہے وہ کس طرح آئے گی۔" اور دیپو نے کہا۔ "اچھا اگر وہ ملے تو میرا ست سری اکال کہہ دینا اور کہنا جیتی، دیپو آخری گھڑی تک تیرا انتظار کرتی رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہائے کرم جلے کیا مت ماری گئی ہے بھلا تیری۔ سکھ سے واپس آئے گی تو سہیلیوں سے ملنا۔" پر ہائے جیتی مجھے کیا پتہ تھا۔ وہ تجھے آخری سلام دے رہی تھی۔"

پھر دونوں رونے لگتیں۔ بوا جس کی آنکھیں پہلے ہی کمزور تھیں اس ... کی ہچکی بندھ جاتی۔ اور چاول پھٹکتی کہاریاں بھی آکر پاس بیٹھ جاتیں اور ساری اپنے پلوؤں سے آنسو خشک کرتیں اور دیپو کو یاد کر کے روتی رہتیں۔

بوا پھر کہتی: "سردار جی بھابی کوئی مرنے والی تھی۔ بس دیپو کا دکھ لے ڈوبا۔ قسم کھائی تھی اس نے تو۔ کیوں جیتی بھلا اس طرح قسم کھانے سے کوئی دیپو واپس آنے والی تھی۔ میں نے بہت بہت کہا۔ بھابی اس طرح اچھا نہیں ہوتا۔ پر وہ گیانی جی کے کہنے کے باوجود زمین پر سویا کرتی تھی۔ سردیوں کی کیسی ڈراؤنی رات تھی جب باہر آنگن میں اس درخت کے نیچے سوئی تھی وہ۔ ہم سب اندر تھے، ویر بیٹھک میں تھا۔ ہائے وہ ہاتھ مل کر کہتی، پتہ نہیں وہ سانپ کہاں سے آگیا تھا۔"

اور کہاریاں یک زبان ہو کر کہتیں۔ "وہ سانپ تھوڑی تھا موت کا دوت تھا۔"

پھر بوا اپنی آنکھیں پونچھتی روتی اور کہتی۔ "ڈس کے بھی پاس ہی بیٹھا رہا۔ سوچے جو گندر سنگھ نے اسے اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ بس مرنے ہی آیا ہو۔ ذرا بھی تو نہ ہلا۔ پہلے کبھی نہیں سنا کہ سردیوں میں بھی سانپ نکلتے ہیں۔"

اور کہاریوں میں سے ایک کہتی۔ "بھاگتا کس طرح، مارے سردی کے گم گما ہو گا" کوئی جوان اور ذرا نک سک سے درست مہری یاد کرواتی: "بھاؤ جو سد۔ سے

نے مارا تو اس کے سر میں سے خون کی ایک دھار نکلی تھی۔"

پھر سانپوں میں خون ہونے پر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتیں تو وہ کھاری پھر کہتی: "درخت بھی تو کٹوانے لگا تھا بھا ذرا جوگندر سنگھ۔"

بوا کہتی: "ہاں جنتی' یہ درخت بھی تو کٹوانے لگا تھا جوگندر سنگھ۔ پر میں نے کہا دیر جو ہونا تھا سو ہو چکا دکھ نہیں کاٹتے۔ بہت منتوں سے اسے روکا۔ وہ تو اس درخت کے ساتھ سر مارتا تھا اور کہتا تھا۔ "میری ماں کو بس اسی درخت نے لیا ہے۔ اور کوئی آنے کا راستہ نہ تھا۔ سانپ کہیں سویا ہوا ہوگا اس میں سے باہر نکل آیا۔"

اور جنتی خاموشی سے ان دنوں کو یاد کر کے بہت دکھی ہوتی' جب وہ دیپو سے بولا نہیں کرتی تھی اور جو ایک بار دل کھٹا ہوا تھا تو بس اس نے کبھی دیپو سے اچھی طرح صلح ہی نہ کی۔

بوا کہتی: "اس کا دل تو سارا وقت تیرے میں پڑا رہتا جنتی۔ کسی اور سہیلی سے کبھی ملنے نہ گئی۔ پر دوسرے چوتھے دن کہتی "ماں جی ذرا جنت کو مل آؤں" اتنا پیار تھا اسے تم سے۔ بیاہ والے دن تک یاد کرتی رہی۔ ہائے کس قدر روپ چڑھا تھا اسے۔"

اور پھر جنتی سے بیاہ کی باتیں' جوڑوں کی' جہیز کی' اُن گالیوں' کھیسوں کی' جو اسے دی گئی تھیں۔ اس چرخے کی' جس میں سونے کے کیل جڑے تھے۔ ساری کہانی پھر سے دہرائی جاتی اور موٹر کا ذکر آتے ہی بوا حاکم سنگھ کو اور دڑن کھیڑے والوں کو بد دعائیں دینے لگتی اور کنگنوں کی اس جوڑی کی بات کرتے کرتے تو بے ہوش ہونے لگتی جس میں ہیرے تھے اور وہ کنٹھا جو اتنا بھاری تھا اور سورج کی طرح چمکتا تھا۔

جنتی گھر آتی تو بہت اُداس ہوتی۔ منہ ڈھانپ کر روتی رہتی۔ جب تک اس کا جی رونے نہ لگے۔ سردیپ کور کہتی: "بہن جی صبر کرو۔ کوئی سہیلی کے مرنے پر

اتنا رو رو کر جی ہلکان نہیں کر یا اور دونوں بیٹھ کر اس آخری اور پہلی سہاگ رات کی
کرنے لگیں، جو شردپ نے ایک ایک لفظ کر کے اپنے دل میں سما رکھی تھیں۔ اگر میں گھر
ہوتا تو اُٹھ کر باہر چلا جاتا۔

اس گھور اندھیارے کا کسی کو کیا پتہ تھا جو میری آتما کو ایک لمحے کو بھی
میں نہیں آنے دیتا تھا۔ دیپو کے بعد مجھے رب اور واہگرو، گرنتھ اور گوردوارے
پر یقین نہ رہا۔ پر جب وہ یاد آتی تو آتی ہی جاتی۔ اس کی ایک ایک بات، اُس
ہر ہر ادا، اس کی پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر وہ سندرتا جو بس اسی کے حصے
آئی تھی۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتا۔ کیا اس میں کسی طرح بدلے کا خیال اور بدی کر
کا کوئی وچار تھا؟ پر مجھے کبھی ایسی بات اپنے اندر سے سنائی نہ دی۔

وہ نہ تھی پر سورج نکلتا تھا۔ پوہ کی راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ درختوں
ننگی شاخیں آندھیوں میں اپنے ہاتھ سینے پر مار مار کر ماتم کرتی رہیں اور پھر خاموش
ہو گئیں۔ ٹہنیاں نئے پتوں سے بھر گئیں۔ کونپلیں پھوٹیں۔ آموں میں بور آ گیا۔ کوئل کو
کو کو کرتی ہے پر میں پوچھتا ہوں وہ اب کسے پکارتی ہے۔

میرا دل لائلپور میں نہیں لگتا۔ میرا دل کہیں بھی نہیں لگتا۔

انسان اپنی ساری قوتوں کے ساتھ کسی عورت کو صرف ایک بار چاہ سکتا
ہے، وہ چاہت جس میں بھوک نہیں، وہ چاہت، جس میں دو دھارے اپنی اپنی جگہ
رہتے پر جن کا منبع ایک ہی چشمہ تھا۔ اگر دیپو زندہ رہتی تو شاید ہم راہ بھول جاتے
بھٹک جاتے، پر وہ نہیں ہے اور میں پوہ کی راتوں میں پانی لگا لگا کر گاتا نہیں
سوچا کرتا تھا، وہ تھی بھی کہ نہیں۔ وہ میرا ایک خیال تو نہ تھی۔ اور پھر آکاش پر
آنکھیں جھپکاتے تارے اور چاند کے نیچے سے تیزی سے گزرتے بادل اندھیری
رات میں سرن سرن بہتی ہوا اور دور کسی کونج کا اپنی ڈار سے بچھڑ کر پیچھے رہ جانے
کے بعد بولنا، سب مجھے اس کی یاد دلاتا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کا نام میرے نام کے ساتھ لے۔ کوئی اس کی اچھائی اور میری نیت میں شک کرے۔ کوئی میری اُداسی سے ہی یہ پتہ لگائے کہ شاید مجھے دیپو کے ساتھ کوئی لگاؤ تھا۔ اس لئے میں ان دنوں چوپال میں بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ قہقہے لگاتا جو میری طرح جوان تھے اور جن پر سے دُکھ سکھ گھڑے پہ بارش کی بوند کی طرح پھسل جاتے تھے۔ ہم آگ سینکتے، شراب پیتے اور کھیتوں کے گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کنواری مٹیاروں کے گیت گاتے جو کہانیوں کی طرح بس صرف سننے کے لئے تھیں اور جن کے چرچے ہم تک باپ دادا نے پہنچائے تھے۔ لوگ کہتے، دیکھو کتنی دلدار سنگھ کے ہاتھ پاؤں دادی کے مرنے کے بعد کھلے ہیں۔ یہ تو اپنی دادی کا لاڈلا ہمیشہ اس کی گود میں گھسا رہتا تھا۔ میلوں پر جاتے تو کندھوں پر لاٹھی رکھے اس کی دونوں باہیں لٹکا کر اپنی پگڑی ذرا ماتھے کی طرف جھکا کر باندھتے۔ ریشمی لاچے کے لڑ لٹکاتے تو میں شور کرنے میں سب سے آگے آگے ہوتا۔ ناچنے، بھنگڑا ڈالنے اور مٹیاروں کو آنکھیں مارنے میں میرا کوئی جواب نہ تھا۔

کیا میں دیپو کو بھلا رہا تھا؟

پر کیا میں اسے بھلا سکتا تھا؟ کیا میں اسے بھلا سکوں گا؟؟

ساون جو آیا ہے تو اکٹھی سات دن کی جھڑی لگ گئی۔ کھیت پانی میں ڈوب گئے۔ لالڑاں کی گلیوں میں تو چلنا ہی مشکل تھا۔ دیواروں کا سہارا لے لے کر، کنکروں پر پاؤں رکھ رکھ کر کہیں ہاٹ تک جاتے۔ کھوہ بند تھے اور ڈھور ڈنگر گیلے تھانوں پر کھڑے کھڑے بیمار ہونے لگے تھے۔ پہلے دو دنوں میں گاؤں کی مٹیاریں خوش ہوتی رہیں۔ چنتی کی سہیلیاں تو سب بیاہ کر اپنے اپنے سسرال جا چکی تھیں۔ نئی جوان ہوتی لڑکیاں جو ہمیں ماما اور چاچا کہتی تھیں، پینگیں ڈال کر جھولنے آئیں۔ پھر رات دن کالے بادل سیاہ دھوئیں کی طرح گھوم گھوم کر گول گول ہو کر نیچے نیچے جھکتے اور برکھا نے لالڑاں والوں کو ڈرا ہی دیا۔ کچے مکان گرنے لگے۔ باہر کی حویلیاں ڈھے گئیں چھتیں گر گئیں۔

سب لوگ رت رت کرتے بچاؤ کی فکر میں تھے۔

ملونت سنگھ کچھ بیمار ہی تھا اور ہمارے گاؤں کے حکیم جی اپنے گھر سکھتے کھیڑے چلے گئے تھے۔ مینہ کے دنوں میں اسے سونف کا پانی اُبال کر دیتے رہے۔ پر جس دن ذرا سا سورج نے باہر سر نکالا ہے سروپ میرے پیچھے پڑ گئی۔ "دلدار سنگھ ذرا سکھتے کھیڑے جا۔ بچہ بیمار ہے۔ سات دن ہو گئے ہیں۔ آخر اور لوگ بھی تو چلنے پھرنے لگے ہوں گے نا؟ ساون کا پانی ہے۔ سورج نکلا تو خشک۔ تم نہر کی پٹڑی پٹڑی ہو کر چلے جاؤ، چار میل کا چکر تو پڑے گا پر بچے کا دھیان کون کرے؟"

دوپہر کا چلا سکھتے کھیڑے پہنچا ہوں تو دن تقریباً اندر باہر تھا۔ حکیم جی نے بچے کا حال سُنا۔ دوا بنا کر دی اور پھر یوں ہی چل پانی پلاتے گاؤں کا اور ساون کی اس اسی جھڑی کا ذکر کرتے رہے جو تیس سال بعد لگی تھی۔ شام مجھے سکھتے کھیڑے میں ہی پڑ گئی۔ باہر نکلا ہوں تو ریل کی پٹڑی تک آتے آتے سورج چھپ گیا۔ یہ سیاری وڈ سے دوسری طرف کا راستہ تھا، اس لئے چوروں ڈاکوؤں کا ڈر مجھے نہ تھا۔ پھر چھوی میرے پاس تھی جس کو میں نے نکال کر حفاظت کے طور پر اپنے آگے رکھ لیا۔ گھوڑی ان راہوں سے واقف تھی۔ پٹڑی پٹڑی بھاگنے لگی۔ نہر کا پانی کبھی کبھی چمکتا اور تاروں کے عکس کے باوجود بہت سیاہ لگتا تھا۔ بارش کا پانی ہوا کے فراٹوں سے کھیتوں میں بہتا تھا جیسے دریا ہو اور بھیگی ہوا میرے منہ پر آ کر لگتی اور باسمتی کے کھیتوں پر سے ہوا ایک مدھم سی باس لاتی تھی۔ اگر دن ہوتا تو دریا اور نہر کے بیچوں بیچ چلنا کتنا اچھا لگتا مگر مجھے بلونت کی بھی فکر تھی اور اپنی جان کی بھی۔

چک خرلی والا پل آیا ہے جہاں سے دوسری طرف بھی راہ جاتا ہے تو میں نے رفتار ہولے کر لی۔ اب لالہ واں کوئی تین کوس ہی تھا۔ گھوڑی آہستہ چلنے لگی۔ اور میں پھر ان یادوں کے دھارے میں بہہ گیا جو یادیں میرے لئے کبھی پرائی ہوں گی اور پہلی بار میرے دل میں شک نے سر اُٹھایا۔ ہو سکتا ہے دیپو کا تعلق شہر میں کسی سے

ساتھ ہو، ہو سکتا ہے . . . ؟

مگر دوسری ہی گھڑی دل نے مجھے ملامت کی۔ کیا تم نے اس بات پر صبر نہیں کیا کہ وہ تمہیں اور صرف تمہیں چاہتی تھی؟ کم ظرف! کیا تم نے اس کی آنکھوں میں کبھی دھوکا اور کھوٹ دیکھا تھا۔ کیا تمہیں اس کی باتوں میں یہ آواز سنائی نہیں دی کہ وہ بس تمہاری تھی۔ اس نے تم پر سے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اس آن کے لئے اس عزت کے لئے جو ایک بار ہی عورت کی روح میں سر اٹھاتی ہے۔ اس نے اندھیرے میں تمہارے سپنے دیکھے، اجالے میں تمہارا خیال رکھا اور پھر تم یہ کہتے ہو؟

اپنے پیچھے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ گھوم کر میں نے کہا۔ "کون ہے؟" اور برچھی کو سر سے بلند کر لیا۔

آنے والے نے کہا "دلدار سنگھ! بھئی ست سری اکال!"

"ست سری اکال سردار" میں نے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا "تم اس طرح کیوں آ رہے ہو کہ گھوڑی کی باگیں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ کیا بات ہے؟"

مہر سنگھ بولا "یار پتہ نہیں کیا ہوا ہے اسے، بس راہ میں اڑ اڑ جاتی ہے۔ اچھلتی ہے اور مجھے مارنے کی کوشش کرتی ہے۔ چڑھتا ہوں تو الٹے قدموں شہر کو لوٹنے لگتی ہے۔ میں نے سپاری ونڈ کے قریب اسے مارا بھی ہے پر یہ ایک قدم بھی نہیں چلتی۔ اب میں اسے چلاتا لایا ہوں۔ سفید گھوڑی دیکھی تو میں نے سوچا۔ سوائے دلدار سنگھ کے اور کون ہو سکتا ہے۔ بھئی تم اس وقت کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے سکھتے کھیڑے جانے اور حکیم صاحب سے ملنے کا سارا قصہ سنایا۔

سردار تھوڑی دیر خاموش رہا اور بولا۔ "جوانی بھی کیا ہوتی ہے۔ گزر گئی تو پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ذرا ذرا سی باتوں پر یوں ہی خون گرم کر لیتے تھے۔ اب یہ گھوڑی نئی ہو۔ الوپ سنگھ کی اور میری دوستی اس کے لئے ختم ہو گئی تھی۔ یہ مہاراجہ ناتھ کی گھوڑی کا بچہ تھا۔ آپ دونوں جس شخص کے پاس یہ تھی اس سے ہم دونوں الگ الگ

ملے تھے۔ الوپ سنگھ بھی گھوڑیوں کا دیوانہ تھا اور مجھے بھی گھوڑے پالنے کا عشق تھا۔ اس نے کہا یوں نہیں۔ تم دونوں بولی دو۔ جس نے بڑھ کر بولی دی۔۔۔ وہی لے لے گا۔ ہم دونوں میں بڑا پیار تھا۔ بہت ہی پیار۔ ان دنوں سرداری کرتار کور مجھے بُرا بھلا کہا کرتی تھی کہ میں الوپ سنگھ کو لئے پھرتا ہوں اور برباد کر رہا ہوں۔ پر اب تو کوئی بھی نہیں رہا۔ نہ وہ جس کے بدلے وہ مجھے بُرا بھلا کہا کرتی تھی اور نہ خود کہنے والی۔" پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔" الوپ اور میں دونوں گھوڑی کا بچہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور ایک دوسرے کے سامنے بھی نہیں آنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کسی دوسرے آدمی سے بولی دلوائی اور اس نے بھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ اتنی زیادہ قیمت لگائے گا اس کی۔ میرا آدمی تو دس ہزار پر پہنچ کر ختم کر گیا پر اس کا بھیجا ہوا بڑھتا رہا اور سودا پندرہ ہزار پر ختم ہو گیا۔ الوپ سنگھ نے اپنی زمین بیچ دی اور یہ گھوڑی خرید لی۔"

سردار نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ بہت اُداس لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔" اور پھر الوپ سنگھ کے لئے میرے دل میں گرہ پڑ گئی۔ نہ کبھی وہ میرے ساتھ شکار پر جاتا اور نہ ہی میں اس کے ساتھ۔ میں نے اس سے گھٹیا نسل کی گھوڑیاں خرید کر ان سے اپنا گھر بھر لیا اور لوگ مجھے 'مہر سنگھ سفید گھوڑیوں والا' کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے ہم چوپال میں ملتے تو ہمارے درمیان بس ست سری اکال ہی ہوتا۔ پھر لوگوں نے مجھے اس کے خلاف اُکسانا شروع کیا۔ اگر اُتم سنگھ اُسے نہ مارتا اور یہ بھاگو کا قصہ نہ ہوتا تو میں اُسے خود مار دیتا۔ ان دنوں اُتم سنگھ جوان تھا۔ جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر آیا ہے تو میں نے اسے کہلا بھیجا تھا کہ بیس ہزار میں یہ گھوڑی مجھے دے دے۔ مگر اس نے کہا تھا۔" باپو کے وچن کا پالن کروں گا۔ ویسے گھوڑی آپ کی ہے جب چڑھنے کو جی چاہے منگوا لیا کریں۔'

اور پھر تم جانتے ہو میں نے دو مربعے بیچ دئے، خود ولایت جا کر اُتم سنگھ کی رہائی کا حکم لایا تھا۔ اس گھوڑی نے سدا مجھے یہ یاد دلایا ہے کہ میں الوپ سنگھ سے ہار گیا ہوں اور میں نے اپنی ہار کو ہر طریقے سے جیت میں بدلنا چاہا ہے۔ اس گھوڑی کے ساتھ

میری ساری دوستیاں اور دشمنیاں ہیں۔ اس گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز تو میں شاید مرنے کے بعد بھی سنتا رہوں گا۔"

مجھے لگا جیسے سردار کی آواز میں آنسو ہوں۔ میں نے پرانی یادوں سے دھیان ہٹانے کے لئے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا: "کیوں سردار وڈرن کھیڑے والے مقدمے کا کیا بنا؟"

سردار نے کہا: "جس دن سردارنی مری ہے اور میں مورتی والے چبوترے پر بیٹھا تھا، اس گھڑی مجھے لگتا تھا کہ کسی کی دوستی میں کچھ ہے اور نہ دشمنی میں۔ اب دیکھو انوپ سنگھ نہیں ہے۔ اُسے کیا کہ میں نے اُتم سنگھ کو پھانسی لگوایا تھا یا نہیں۔ اور اگر میں بھی مر جاتا تو کیا پتہ چل سکتا تھا مجھے کہ دیپو کو مارنے والے والے نے پھانسی پائی ہے کہ نہیں۔ موت سارے اونچے نیچے برابر اور آگ سارے اچھے برے کو پوتر کر دیتی ہے دلدار سنگھ۔ پہ تو نے مجھے کہا تھا کہ میں اس پرانی ڈگر کو نہ چھوڑوں اور ٹھیک ہے پرانی ڈگر کو کیوں چھوڑوں۔ میں اپنی ہار کو سدا دولت لگا کر جیت میں بدلتا رہا ہوں۔ اب وڈرن کھیڑے والوں سے کیوں کر ہار مان کر مروں۔ یہی سوچ کر میں تمہارے ساتھ شہر چلا گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لئے وڈرن کھیڑے والوں کو ہرا کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ مگر پرانے راستے کو کیوں چھوڑ دوں۔ کیوں دلدار سنگھ؟"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے سردار، ٹھیک ہے۔ یہ ڈگر ہمارے خون کا راستہ ہے۔ دادی نے کہا تھا۔ نہ کوئی گناہ گار ہوتا ہے اور نہ کوئی بے گناہ۔ بس یہ ریت ہے جو ہمارے باپ دادا کی طرف سے ہمیں ورثے میں ملی ہے۔"

سردار نے زور سے کہا: "سردارنی کرتار کور سچی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ سب کچھ اس دیس کی ہوا میں ہے۔ ہمارے خون کی رچی شرچی میں ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں!"

بڑی دیر تک ہم خاموش چلتے رہے، اپنے اپنے خیالوں میں لپٹے۔

سردار پھر بولا ”یہ ایک بات کا پتہ نہیں چلتا دلدار سنگھ جس کا غم مجھے سدا رہے گا۔ موت کے بعد بھی کہ آخر وہ کون سورما تھا جس نے میرے گھر میں چوری کی۔ دیپو کی بات سارے جگ میں مشہور ہو گئی اور آج تک پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون تھا۔“ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا ”حاکم سنگھ کی بات مجھے تو سچ ہی لگتی ہے دلدار سنگھ۔ دیپو نے ضرور اسے کہا ہو گا کہ دیپو میری بیٹی تھی۔ سدا گھر سے باہر بیٹھکوں اور حویلیوں میں رہنے کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ اسے جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ اس نے کبھی اُلٹی راہ پر چلنے کی کوشش نہیں کی۔ جب کبھی اس کی اور گوربخش کی لڑائی ہو گئی، اگر اس کا قصور ہوتا تو وہ مان لیتی۔ سچ اس کی رگ رگ میں خون کے ساتھ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب حاکم سنگھ کو پہلی بار ہی ایسے سچ سے واسطہ پڑا تھا اور پھر وہ دریا دل بھی نہ تھا۔ اگر اسے دیپو کا ذرہ برابر بھی پتہ ہوتا تو وہ اس سے کبھی یہ لوک نہ کرتا۔“

سردار کی آواز بھرا گئی ”پتہ نہیں کون تھا، وہ کون سورما تھا، کس ماں کا پوت تھا۔ اگر مجھے اس کا پتہ چل جائے تو کم از کم جو سچ دیپو حاکم سنگھ کو نہ بتا سکی میں اس سے پوچھ لیتا۔“

میں نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی اور کھڑا ہو گیا۔ سردار بھی میرے برابر رُک گیا اور بولا ”کیوں بھئی دلدار سنگھ کیا بات ہے۔ رُک کیوں گئے؟“

دو کوس پرے کسی کھوہ پر چھوتے سے کوٹھے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ راہ کے اِدھر اُدھر پانی اور لہروں کا پتہ ڈولتے ستاروں کے عکس کو دیکھ کر چلتا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

سردار نے پوچھا ”دلدار سنگھ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”سردار، اس گھڑی، اس راہ پر تم اور میں دونوں ہیں اور یہ

گھوڑیاں ہیں، جن کی آنکھوں میں ہمارے سارے لالڑاں کی بیتی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ رات اندھیری ہے اور یہ آکاش ہے، جس سے میرے کسی بتے کے ہونے اور نہ ہونے پر مجھے وشواس نہیں۔ صرف ایک بات کا جواب دوں گا جو تم نے پوچھی ہے، چاہے تم اُسے سچ مانو چاہے جھوٹ!"

سردار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے سامنے کھڑے اس کے بدن میں ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ سیدھا ہو رہا ہو۔ اور اتنے سالوں کو اپنے کندھے سے جھاڑ کر اسی جوانی کے گرم خون کو اپنی رگوں میں محسوس کر رہا ہو۔

میں نے پھر کہا "کیوں سردار کیوں؟"

اس نے کہا "نہیں، صرف یہ بتاؤ کہ تم اس کے کیا تھے؟ اور کچھ نہیں۔ ایک لفظ نہیں۔"

میں نے کہا "میرے ہاتھ میں چھوی ہے۔ یہ میری آن ہے اور میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں سردار۔ . . ."

اس نے میری بات کاٹ کر کہا "نہیں کوئی اور قسم اٹھاؤ۔ آن کا جادو جھوٹ ہے۔"

اور میں نے اس اندھیری اور تاروں بھری رات میں جب آکاش پر میرے لئے کچھ نہ تھا اُسے کہا۔ "مجھے چنتی کی، اپنی بہن کی قسم، میرا دیپو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جب بیاہ کر گئی ہے تو میرے لئے اتنی ہی پوتر تھی جیسے چنتی!"

سردار وہیں بیٹھ گیا اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر اس نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مار کر کہا "اوہ میری بھولی دیپو! میری بھولی دیپو!!"

اور پھر ہم لالڑاں تک چپ چاپ چلتے آئے۔ پالی میں گھوڑیاں چپ چپ چل رہی تھیں۔ میں تہبند کو اوپر کئے آگے آگے چلتا سردار کو راہ بتاتا جاتا تھا۔

دوسرے دن سویرے سویرے ہل چھوڑ کر لوگ لالڑاں میں بھاگے آئے۔

سردار مہر سنگھ کی گھوڑی نے سپاری ونڈ کے قریب غصے میں آکر سردار کو گیسوؤں سے پکڑ کر نیچے گرا لیا تھا اور پھر اس کی گردن کو جھٹکے دیتی رہی، یہاں تک کہ سردار مر گیا۔

اور اس دن دوپہر کو سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق حاکم سنگھ کو تو ڈروں کھیڑے کے مڈکا اور لاڑاں والوں کا داماد تھا، پھانسی کی سزا بولی گئی۔ سردار نے مرتے دم تک جس ڈگر پر چلنے کا جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کیا۔

بلونت یہاں ہے اور میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔ لاڑاں، تھروں کے اس سونا اور سندرتا میں، اس نئے پن میں ایک قصہ کہانی لگتا ہے۔ گاؤں سے کبھی کوئی آتا ہے تو کہتا ہے کہ سردار مہر سنگھ کی حویلی میں اُلو بولتے ہیں، چھتیں گر گئی ہیں۔ بڑے دروازے میں بیل اُگ آئے ہیں۔ اور پچھواڑے کا باغ، جس میں کبھی سو طرح کے لوٹے تھے جنگل لگتا ہے۔

اور اس سرد رات میں جب بلونت اور اجیت کور ابھی باہر سے واپس نہیں آئے، سرد ہوا ٹوٹے شیشے میں سے آکر میرے منہ پہ لگتی ہے اور مجھے پوہ کی راتیں یاد آتی ہیں۔ وہ راتیں، جو زندگی تھیں، جوانی گزر گئی تو پتہ چلتا ہے۔ پر اب پتہ چلنے سے کیا فائدہ؟

محمود احمد ہنر ایڈیٹر پرنٹر و پبلیشر نے میتل آرٹ پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہراہ ۱۳۲/۱ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا —

کتابیں جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

کلام منسوخ

عادل منصوری کی غزلوں نظموں کا انتخاب

مکھی

احمد ہیش کی سات کہانیوں کا مجموعہ

آخری دن کی تلاش

محمد علوی کی دوسری شعری پیشکش

تفصیل متعلق ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد

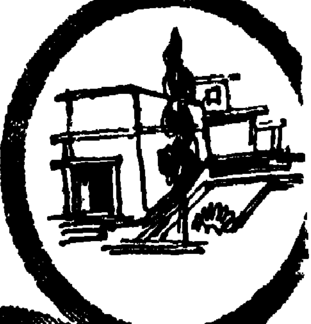
(فارم ۴ رول ۸)

(۱) مقام اشاعت	۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳
(۲) وقفہ اشاعت	ماہنامہ
(۳) طابع	محمود احمد ہنر
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳
(۴) ناشر	محمود احمد ہنر
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳
(۵) مدیر	محمود احمد ہنر
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳
(۶) ملکیت	محمود احمد ہنر
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

میں محمود احمد ہنر اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

دستخط
"محمود احمد ہنر"







خواہ آپ کے سامنے مسئلہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کا ہو یا بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا، یا عمر ڈھلنے میں سکھ چین کی زندگی بسر کرنے کے لئے اپنا گھر بنانے کا۔

اجتماعی معیادی ڈیپازٹ کھاتا

— ان سب مسئلوں کا آسان اور یقینی حل ہے۔

۱۔ ڈاک گھروں میں، آپ ۵، ۱۰ یا ۱۵ برس کے لئے ۵ پر تقسیم ہو سکنے والی کوئی بھی رقم اور زیادہ سے زیادہ ۲ روپے ماہانہ جمع کر سکتے ہیں۔ معیاد پوری ہونے پر آپ کو مطلوبہ رقم مل جائے گی یہ جمع کرائی ہوئی رقم اور ٹیکس سے بری سود کی شکل میں ہوگی۔

۲۔ ہر بچت ضروری ہوتی ہے جو رقم آپ اجتماعی معیادی ڈیپازٹ کے ۱۰ اور ۱۵ سالہ کھاتوں میں جمع کرتے ہیں وہ ٹیکس کے لئے آمدنی کا تخمینہ لگاتے وقت آپ کی کل آمدنی سے گھٹا دی جاتی ہے۔

۳۔ ان کھاتوں میں جمع کی جانے والی رقموں پر آپ کو دولت ٹیکس بھی نہیں دینا پڑتا۔

مسئلے کا آسان اور یقینی حل...

آج ہی اپنے قریبی ڈاک گھر میں اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتا کھولئے

قومی بچت آرگنائزیشن

LLAHABAD
Novelette Number
No. 55

٨١٣ .... ۲۶۵ ش ۳۶۹۲۶

تخلیق کار .... جاری نہ کی جائے

ناولٹ نمبر مرتبہ محمود اختر نمبر

313	
362	
30 AUG 1972 313	
26 JUL 1972 338	
372 300	
28 AUG 1972	
26 SEP 1972 350	